

متحالات

ڈاکٹر جمیل قریشی

مغربی پاکستان آرڈو اکیڈمی، لاہور

مقالات تحقیق

ڈاکٹر وحید قریشی

مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی ۰ لاہور

سلسلہ مطبوعات : ۷۳

0

طبع اول : مارچ ۱۹۸۸ء

تعداد : ایک ہزار

طابع

: گئیکسی پریس ،

۲ - لنک سیکلوڈ روڈ ، لاہور -

مطبع

: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی

۷۳/این - سن آباد

لاہور - ۵۳۵۰۶

ناشر

نوٹ : اکیڈمی ادبیات پاکستان ، اسلام آباد نے اس کتاب کے لیے مالی وسائل مہیا کر کے اس کی اشاعت کو ممکن بنایا ۔

ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کی یاد میں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تقریب

(۱)

- ۹ پاکستان میں اردو تحقیق کے دس سال ۱۹۵۸—۱۹۶۸
۲۳ پنجاب یونیورسٹی کا ایک تحقیقی مقالہ

(۲)

- ۳۱ مثنوی کلمہ راؤ ہدم راؤ
۳۹ دیوان شوق - ایک جائزہ

(۳)

- ۳۷ حالات حسن کے دو مآخذ
۶۵ سحر البیان کا ایک نادر قلمی نسخہ
۸۳ میر حسن اور سحر البیان
۹۷ خوان نعمت - ایک محاکمہ
۱۰۷ مقدمہ مثنویات میر حسن
۱۳۳ جہاندار شاہ

(۴)

- ۱۷۳ مقدمہ کلام آتش - ایک جائزہ
۱۸۱ گلستان سخن - ایک تجزیہ

(۵)

- ۲۳۷ بنیادی اردو - ایک تجزیہ
۲۴۳ حوالہ جات قانون فوجداری پر ایک طائرانہ نظر
۲۴۹ مشرق میں فہرست سازی کی روایت
۲۵۷ کتابیات تحقیق و تنقید
۲۶۱ کتاب 'نامہ' شبلی پر ایک نظر

(۶)

- ۲۶۳ فن تاریخ گوئی

پاکستان میں اردو تحقیق کے دس سال

(۱۹۵۸ء - ۱۹۶۸ء)

(۱)

اردو میں ادبی تحقیق کا آغاز یوں تو دور سرسید سے ہوتا ہے۔ حالی، شبلی، آزاد اور سرسید کے ہاں تصحیح متن اور مقالات میں تحقیقی شعور کی کچھ جھلکیاں ملتی ہیں لیکن باقاعدہ طور پر اردو تحقیق کی روایت پہلی جنگِ عظیم سے شروع ہوتی ہے۔ ڈاکٹر زور، عبدالسلام ندوی، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالحی، ڈاکٹر عبدالستار حدیثی، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، حافظ محمود شبرانی، پروفیسر محمد اقبال اور ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے نام اس سلسلے میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان سے قبل مشرقِ علوم میں تحقیق کی روایت بہت کچھ ایشیائیک سوسائٹی کلکتہ کے ہاتھوں مضبوط اور مستحکم ہو چکی تھی اور یہی لسانی اور تصحیح متن کی روایت پاک و ہند کی یونیورسٹیوں میں پھلنے پھولنے لگی تھی۔ اردو ادب کی تحقیق و تدقیق بھی اسی تحقیقی روایت کا حصہ ہے۔ جن بزرگوں کے نام ابھی اوپر لیے گئے ہیں، ان میں سے بیشتر کے علمی کارنامے اردو ادب کی حدود سے نکل کر عربی اور فارسی کے ذخیرے تک جاتے ہیں۔ متنوں کی ترتیب و تصحیح، تاریخ ادب کے غیر معلوم گوشوں کی دریافت، زبان کے آغاز و ارتقاء کی نشان دہی اور شعرا و ادبا کے حالات زندگی کی تعیین کے علاوہ ان علوم کی بازیافت ان لوگوں کا حصہ خاص ہے جو مسلمانوں کے علوم اور مسلمانوں کی معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایشیائیک سوسائٹی کی روایت کے زیر اثر یہ ادبا و فلاسفی کے اصولوں اور زبانوں کی شجرہ بندی کا بہت شوق رکھتے ہیں۔ اس سے ہٹ کر ادب کو تاریخ کے تناظر میں دیکھنے کا احساس بھی ان محققین کی تحریروں میں نمایاں ہے۔ اس سے ہماری

تاریخ ادب کی تدوین کا کام بہت کچھ آسان ہو گیا ہے۔ لیکن تحقیق کو حقائق کی صحت سے آگے ان کی تاویل و تشریح اور فلسفیانہ توجیہ تک لے جانے میں ان صاحبوں نے زیادہ توجہ نہیں کی۔

اس کا فوری اثر یہ ہوا کہ آئندہ کے لیے تحقیق اور تنقید الگ الگ خالوں میں بٹ گئی اور اردو ادب میں تنقید و تحقیق سے ایک بڑی حد تک بے نیاز ہو کر چلنے لگی۔ اس سلسلے میں انفرادی تلاش و جستجو کے علاوہ دبستانی سطح پر جو کام ہوا ہے، اس کے بڑے بڑے مرکز حیدرآباد دکن، اعظم گڑھ اور لاہور قرار دیے جا سکتے ہیں۔ تحقیقی اصولوں کے استعمال میں ان دبستانوں کے نظریات میں بہت فرق ہے۔ دکنی محققین تصحیح متن میں قلمی نسخوں کے اختلاف کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور نظری مباحث میں بھی واقعات کی صحت کا دار و مدار زیادہ تر ادبی کتابوں پر رکھتے ہیں اور تاریخ سے حاصل ہونے والی معلومات کو ادبی مواد سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں کرتے۔ تاہم اس سے دکنیات کا ایک بڑا ذخیرہ ہمارے سامنے آ گیا۔ لسانی لحاظ سے دوسرے دبستانوں پر دکن کو یہ فوہیت حاصل ہے کہ وہاں کے محققین زبان کے آغاز و ارتقا کے مسائل میں زبان کو فلولوجی کی حدود سے نکال کر صوتیات کی منزل میں لے آئے۔ یہی تو انا روایت دوسرے علاقوں کے محققین کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکی۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں سے لے کر دورِ حاضر میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ تک یہ صوتیاتی شعور ایک مستقل اور سائنٹفک علم کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ تحقیق کا دوسرا دبستان جس کا مرکز اعظم گڑھ ہے، اس لحاظ سے دکنی دبستان سے مختلف ہے کہ وہاں اردو کو صرف زبان کی حیثیت سے نہیں بلکہ مسلمانوں کی علمی زبان کے طور پر دیکھنے کی کوشش کی گئی اور اس صورت حال کا علمی جائزہ مذہبی وجہات اور مذہبی علوم کی روشنی میں لیا گیا۔ علامہ شبلی کی مورخانہ روایت ان لوگوں کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ متن کی ترتیب و تصحیح کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ اس کے مقابلے میں اردو ادب کے بنیادی مسائل کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھا گیا۔

تیسرا لاہور یا اورینٹل کالج لاہور کا دبستان ہے ۔ یہ محققین مختلف علوم کے مطالعے کو زبانوں کے مطالعے کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں ۔ اسی لیے انہوں نے ادب کو معاشرتی علوم کے حوالے سے دیکھنے کی سعی کی ، خصوصاً تاریخ کو ان کے نظام تحقیق میں بنیادی حیثیت حاصل ہے ۔ یہ لوگ بنیادی طور پر محققین ہیں اور ادب سے حاصل کردہ واقعات اور سبب کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں ۔ اردو تحقیق کی روایت میں انہوں نے احتیاط کا اعلیٰ معیار قائم کیا ۔ تحقیق میں سہل انگاری اور حوالے کی بے احتیاطی کا محاسبہ سختی سے کیا گیا ۔ تحقیقی مسائل میں ان محققین کا کارنامہ خاص یہ ہے کہ اردو تحقیق کی مخصوص زبان وضع کرنے کے علاوہ ان بزرگوں نے تحقیقی مقالات میں اسلوب کی اہمیت پر بہت زیادہ اصرار کیا اور کھڑے کھوٹے کی تمیز میں بے رحمی اور بے لچاری کے عناصر کو ضروری گردانا ۔ بنیادی اور ثانوی سائنس کے درمیان امتیاز ، دلائل کی مختلف کڑیوں کی پوری چھان بین ، نسخوں کی قدامت کا تعین ، رسم الخط کے عہد بہ عہد تغیرات کا احساس اور اسلاف کے خصائص کے ادراک کے علاوہ حوالوں کے اندراج میں اخلاقی قدروں پر سختی سے عمل اس دبستان کی خصوصیات ہیں ۔

بیسویں صدی کے تیسرے دہ سالے میں ان مذکورہ دبستانوں کے علاوہ رام پور اور پٹنہ کے دبستان بھی ہمارے سامنے آئے ہیں ۔ پٹنہ کے دبستان میں قاضی عبدالودود ، ڈاکٹر اختر اور پٹنہ ، ڈاکٹر مختار الدین آرزو کے علاوہ ایک خاصا بڑا گروہ ہمارے سامنے آتا ہے ۔ ان میں قاضی عبدالودود سرخیل کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان ہی کے اصولوں اور قواعد کی پابندی باقی محققین کے ہاں نظر آتی ہے ۔ قاضی صاحب نے ثانوی سائنس سے بالعموم صرف نظر کیا اور اپنی تحقیق و تدقیق کو معاصر مواد تک محدود کر دیا ۔ حوالے میں احتیاط کا عنصر قاضی صاحب کے ہاں بہت ہے ۔ دبستان لاہور کے مقابلے میں اس دبستان میں ایک کمی البتہ یہ نظر آتی ہے کہ محققان کے بے دریغ استعمال سے تحریر کی روانی اور اسلوب کا حسن مالد پڑ گیا ہے ۔ معاصر مواد سے مناسب حد تک نتائج اخذ کر کے حوالوں کو اپنی تحریر کا لازمی حصہ بنانے کا طریقہ ترک ہو گیا ہے اور

مواد کو خام صورت میں قارئین تک پہنچانے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ ترتیب متن میں البتہ ان محققین نے بہت کام کیا ہے اور متن میں جو معیار ہشتہ کی تصانیف میں ملتا ہے، وہ لاہور کے دبستان کی تصانیف سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

رام پور کے دبستان میں مولانا استیاء علی صاحب عرشی کی ذات گرامی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ عرشی صاحب نے متن کی تصحیح میں جو محنت اٹھائی ہے اس کے قابل قدر ہونے کیلئے غالب، سلگ گوہر اور دستور الفصاحت ہیں۔ دستور الفصاحت کی ترتیب اور تخصیص میں لڑکروں کی ترتیب کا ایک نیا اسلوب نکالا گیا ہے جس سے حواشی اصل کتاب کے علاوہ معلومات کا ایک بڑا گنجینہ بن گئے ہیں۔

(۲)

تقسیم بر صغیر کے بعد اردو تحقیق اور تنقید کا سلسلہ ابتدائی چند برس میں ایک بڑی حد تک منتشر ہو گیا۔ سیاسی حالات اور آبادی کے نقل مکانی نے پاکستان اور بھارت دونوں جگہ سیاسی اور سماجی سطح پر کئی تبدیلیاں پیدا کیں۔ تحقیق ایک صبر آزما عمل ہے۔ اس میں جن سہولتوں اور مواد کے ذخیروں کی ضرورت ہے، وہ تاریخ کے ایسے دور میں میسر نہ تھی، جب کہ ایک طرف مہاجرین کی بھائی اور دوسری طرف نوزائیدہ مملکت کی بقا کے مسائل درپیش تھے۔ ذہنی سکون کے رخصت ہو جانے سے وہ فرصت اور علمی تک و دو میں وہ انہماک باقی نہ رہا جو کسی اعلیٰ ہائے علمی کام کے لیے ضروری ہے۔ ۱۹۴۹ء سے لے کر ۱۹۵۸ء تک ملک کی سیاسی حالت مسلسل اور متواتر بحران کا شکار رہی۔ حکومت اعلیٰ بنانے پر تعلیمی منصوبہ بندی نہ کر پائی۔ اگرچہ انفرادی طور پر پاکستان میں تحقیق کی روایت کسی نہ کسی طرح زندہ رہی اور حکومت بھی بعض اداروں کی تشکیل اور مالی اعانت کسی نہ کسی حد تک کرتی رہی لیکن اعلیٰ تحقیقی کام کے لیے فضا تیار نہ ہو سکی۔ آخر کار پہلے پنج سالہ منصوبے میں جو ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۰ء تک کے دور کو حاوی تھا، مختلف تعلیمی مدارج میں تحقیق کی اہمیت کو پیش نظر رکھا گیا۔ اس

منصوبے کے خالقین نے واشکاف الفاظ میں اس بات کا اقرار کیا کہ یونیورسٹی کی سطح پر تحقیقی کام کی تشکیل نو از حد ضروری ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات کا اقرار بھی کیا گیا کہ ہمارے ملک میں ابھی تحقیق کا وہ شعور پیدا نہیں ہوا جو علم اور حصول علم کو انقلاب آفریں بنا سکے۔

پاکستان میں تحقیقی کام کی رفتار سست رہی ہے۔ بھارت میں اردو دشمنی کی قوی لہر اور حکومت کی معالمانہ روش کے باوجود اردو تحقیق میں جس معیار کا کام ہوا ہے، ہمارے علمی سرمائے میں اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سبب شاید یہ ہے، کہ وہاں اردو ادب اور زبان کی خدمت کا جذبہ ایک سرگروہ سالہ اور مجاہدانہ انہماک کا نتیجہ ہے۔ وہاں اردو کے محققین و ادبا کو اندازہ ہو چکا ہے کہ اردو زبان کے بقا و تحفظ کا مسئلہ خود ان کی مرگ و حیات کا مسئلہ ہے۔ اس احساس کے تحت وہاں علمی سرگرمی کی رو زیادہ موثر اور متحرک ہے۔ دوسرے بھارتی محققین کو علمی ذخائر کی جو سہولتیں میسر ہیں ان کا سامان اس نوزائیدہ مملکت میں فی الحال ممکن ہی نہیں۔ ادبی تحقیق اعلیٰ علمی سرمائے اور عمدہ لائبریریوں کے بغیر مشکل ہے۔ پاکستان میں تحقیق کے میدان میں پس ماندگی کے اسباب میں اس مذکورہ سبب کا احساس ہماری حکومت کو بھی ہے۔ وہ اپنے وسائل کا ایک اہم حصہ تحقیق و تدریس کے لیے وقف کر رہی ہے۔ پاکستان کی یونیورسٹیوں میں، اعلیٰ تعلیم کے علاوہ تحقیق کے بھی مراکز ہیں، ہر سال کم و بیش ۳ لاکھ روپے کی مالی امداد صرف تحقیقی وسائل پر صرف ہو رہی ہے اور اس رقم کا ایک حصہ ان منصوبوں کے لیے وقف ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اردو زبان و ادب سے متعلق ہیں۔ علاوہ ازیں اردو زبان و ادب کے لیے حکومت ہر سال کم و بیش سولہ لاکھ روپے مختلف اداروں کی تھویل میں دیتی ہے۔ اس سے ہمارے ہاں تحقیقی کام کی اہمیت کا کچھ قیاس کیا جا سکتا ہے۔

(۳)

اس مرحلے پر لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت کی اس امداد کے باوجود آخر ہمارے ہاں تحقیق کا معیار کیوں بلند نہیں ہو رہا؟ اس کے کچھ بنیادی اسباب ہیں۔

پاکستان ایسا زرعی ملک ہے جو زرعی مدارج سے ترقی کرتے ہوئے
 صنعتی دور میں داخل ہو رہا ہے۔ نوآئیدہ محنت کی حریت سے بھی اسے
 کئی دشواریوں کا سامنا ہے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں تو اسے اپنی بقا کے لیے
 اپنے تمام ملکی و ملی وسائل کو بروئے کار لانا پڑا۔ اسے معاشرے میں
 جہاں اپنی بقا کا مسئلہ دیگر مسائل پر فوقیت رکھنا ہو اور قوم کا ہر فرد مادی
 اور منفعت جتنی پیشوں کی تلاش میں سرگرداں ہو، جہاں قومی فلاح و بہبود
 کے تقاضے صنعتی اور مشینی معاملات پر منحصر ہو جائیں، وہاں ان ادب
 مشاغل کی اہمیت برقرار نہیں رہ سکتی جو فوری طور پر سرمایہ کاری اور
 دولت الفوری کا ذریعہ نہ ہوں۔ نئے صنعتی دور کے زیر اثر وجود میں آنے
 والا نیا طبقہ علوم و فنون کے تقریبی پہلوؤں کا محافظ تو ہو سکتا ہے لیکن
 اس سے سنجیدہ تحقیقی معاملات اور تہذیبی اور علمی سرمائے کی حفاظت کی
 توقع نہیں کی جا سکتی۔ حکومت کی بیش از بیش توجہ اور تحقیق کے اسے
 رقوم کی فراہمی کے باوجود مادی ترقی کی دوڑ میں وہی علوم و فنون ہنب
 سکتے ہیں جن سے کاروباری اور تجارتی مفادات وابستہ ہوسکیں، اور ظاہر ہے
 تحقیقی ادب ان اتادی پہلوؤں سے ایک بڑی حد تک خالی ہے۔ تقسیم برصغیر
 کے وقت ہمارا علمی سرمایہ بھارت کی لائبریریوں میں رہ گیا۔ الذا آفس کی
 کتابوں کا مسئلہ ہنوز حل طلب ہے۔ تشکیل پاکستان کے وقت لے دے کر
 ہمارے پاس ڈھاکہ یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی کی لائبریریوں کے علاوہ
 پنجاب پبلک لائبریری لاہور، ہشاور آرکائیوز اور لاہور کا ریکارڈ آفس تھے۔
 حکومت نے نئی نئی یونیورسٹیوں کے قیام کے ساتھ ساتھ ان اداروں میں
 کتاب خانوں کی داغ بیل بھی ڈالی۔ پھر کراچی کا قومی عجائب گھر
 ہمارے تہذیبی ورثے کا ایک اہم مرکز ہوا جس کی لائبریری آج اپنے
 مخطوطات کے سرمائے کے لحاظ سے پنجاب یونیورسٹی کے دوش بدوش پہنچ
 چکی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت کی امداد سے قائم ہونے والے ادارے اور
 اکیڈمیاں بھی کتابوں کی جمع آوری میں مصروف ہیں؛ لیکن ہمارا یہ علمی
 سرمایہ فی الحال ان ذخائر کا مقابلہ نہیں کر سکتا جو بھارت اور انگلستان
 میں پڑے ہیں۔ محققین کو پاکستان میں موجود کتب خانوں سے استفادے
 کے پورے وسائل بھی میسر نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک تو یہ سرمایہ ہی
 قلیل ہے، دوسرے مختلف اداروں میں باہمی تعاون کی کمی کے سبب

کتابوں سے استفادہ بھی آسان نہیں۔ اعلیٰ پائے کی تحقیق کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے، ان میں مواد کی فراہمی، فرصت، اطمینان اور مناسب مالی حوصلہ افزائی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ایک نوزائیدہ مملکت میں، جہاں قوم کا ہر فرد جلب منفعت کی دوڑ میں مصروف ہو، اس فرصت اور اطمینان قلب کا میسر آنا ممکن نہیں جو تحقیق کے لیے ضروری ہے۔ پھر ایک قباحت یہ بھی ہے کہ صنعتی ترقی کے بخار میں مبتلا معاشرہ، علمی کاموں کو بھی کاروباری پیمانوں سے جانچتا ہے۔ تحقیقی کام کی رفتار کا اندازہ بھی مشینی ترازو میں کیا جائے تو پھر تحقیق میں معیار کا مسئلہ کٹھب ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ رجحان عام ہے کہ ہم ہر تحقیق کا نتیجہ فوری طور پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ شکر کے کلر خانے جس طرح اپنی پیداوار (Production) کا عملی ثبوت مہیا کرتے ہیں اور ہر سال جنس کے ابار لگا کر اپنی الادیت ثابت کرتے ہیں، اسی طرح تحقیق ادب میں بھی ہم معیار کے مقابلے میں مقدار کے بیچھے بڑے ہوتے ہیں۔ اس کی ادنیٰ سی مثال اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، تاریخ ادبیات اور اردو لغت جیسے عظیم منصوبے ہیں۔ ان اہم منصوبوں میں بھی ہم فوری نتیجے کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ تحقیق الہ دین کا چراغ نہیں کہ اسے گھسا کر فوراً مطلب کی چیز برآمد کر لی جائے۔ اس صورت حال کا فوری اثر یہ ہے کہ مختلف علمی اداروں کو اپنے بچاؤ کے لیے خاصا وقت صرف کرنا پڑتا ہے جو بصورت دیکر وہ اپنے علمی کام پر صرف کرتے۔ دوسرے اپنے مال کو ”بازار میں لگا کر“ دوسروں پر سبقت لے جانے کی خواہش میں محققین ”کانا اور لے دوڑی“ پر عمل کر کے تحقیق کے معیار کو پست سے پست تر کر بیٹھتے ہیں۔ جو محققین اس تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دینے اور معیار کے بیچھے جاتے ہیں ان کے لیے علمی کام کے راتے محدود ہونے کے امکانات بڑھتے ہیں۔ تحقیق سے رفتہ رفتہ جان کاوی اور محنت کا عنصر خارج ہونے لگا ہے اور یہ کوئی خوش آئند بات نہیں ہے۔

(م)

صنعت کاری کی عمومی رو نے جہاں دوسرے نالک میں اخلاقی قدروں کی شکست و ریخت کی ہے، وہاں پاکستان بھی اس کی زد سے نہیں بچ سکا۔

اندار کی شکست کا یہ عمل شعر و ادب کو بھی متاثر کئے بغیر رہ سکا۔ محنت سے جی چرائے ہوئے، آسان راستوں کی تلاش ہمارے تحقیقی و ادبی کارناموں میں واضح نقش چھوڑ رہی ہے۔ اس سہل السکری کے کئی مظاہر ہیں :

(الف) حوالوں میں جعل سازی، یعنی متاخر کتب سے مواد لے کر معاصر کتب کا حوالہ درج کرنے کی رسم۔

(ب) حوالوں کے قلم بند کرنے میں بے احتیاطی۔

(ج) دوسروں کے کئے ہوئے علمی کام کو معمولی رد و بدل سے (بغیر حوالے کے) اپنے ہاں سمولہنے کا رواج۔

(د) کتابیات کی ترتیب میں سائنٹفک طریق کار سے غفلت۔

(ه) متن کی تصحیح میں عدم احتیاط، غیر معیاری نسخوں کو بنیادی نسخے قرار دینے کی غلطی، اختلاف نسخ کے قلم بند کرنے میں بے احتیاطی، پورے علمی ذخیرے کو سامنے رکھ کر کام شروع کرنے کی بجائے ناقص ذرائع پر بھروسہ، چھپائی اور پروف ریڈنگ میں غفلت۔

(۵)

ان خامیوں کے علاوہ اخلاقی قدروں سے صرف نظر کرنے کی وجہ سے بعض غلط رجحان بھی ہمارے ہاں فروغ پا رہے ہیں۔ ان میں دو کا ذکر ضروری ہے :

اول یہ کہ ہاک و ہند کے مختلف ادارے اور یونیورسٹیاں تقسیم کار کے اصول پر عمل پیرا نہیں۔ دس دس جگہ ایک ہی موضوع پر کام ہو رہا ہے۔ محقق ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی خواہش میں ناقص اور اندھورا کام چھاپ کر مارکیٹ میں لانا یا پھر ٹائپ کر کے ڈگری کے لیے پیش کرنے میں کوشاں نظر آتا ہے۔

ہاک و ہند میں تحقیقی کام کرنے والے کئی چنے لوگ ہیں۔ اگر وہ بھی یہ غیر علمی طریقہ اختیار کرتے ہوئے اپنے آپ کو صرف چند موضوعات

میں محصور کر لیں تو پھر تاریخ ادب کے غیر واضح گوشے اور مبہم حصے تحقیق کے محتاج ہیں رہ جائیں گے۔ اس میں کچھ برائی نہیں کہ جس موضوع پر معیاری کام نہیں ہوا، اس پر کوئی دوسرا محقق قلم اٹھا کر مواد کا اضافہ اور تاویل و توضیح کے بہتر نمونے پیش کرے اور اپنے پیش رو کی غلطیوں کی نشان دہی کر دے۔ یہ طریق کار بہت ضروری بھی ہے؛ لیکن بعد میں شائع ہونے والے تحقیقی کام میں اگر پیش رو کے مقالے کی غامبیان اسی طرح برقرار رہیں یا ان میں دس بیس کا اضافہ ہی ہو جائے تو پھر ایک دوسرے کے موضوع کی چھوٹا چھوٹی کا یہ عمل کسی طرح بھی قابل ستائش نہیں ہے۔

دوم یہ کہ مختلف ادارے اور یونیورسٹیاں اپنے ہاں ہونے والے تحقیقی کام کی مناسب رہنمائی اور باقاعدہ چٹان بن نہیں کرتے۔ نو عمر محقق جلد سے جلد ڈگری حاصل کرنے کی آرزو میں اور قوری طور پر مصنف بن جانے کی تمنا میں کام پر مناسب توجہ نہیں کرتے۔ اسے میں ہوتا یہ ہے کہ پیش روں کے مال پر پالتہ صاف کر لیا جاتا ہے۔

صورت حال کا اندازہ اس بات سے ہٹوئی کیا جا سکتا ہے کہ سرشار پر اس وقت آگرہ یونیورسٹی، الہ آباد یونیورسٹی، لکھنؤ یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی اور لندن یونیورسٹی میں مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ ہرچند ہر پنجاب، علی گڑھ اور سری نگر میں ایک وقت کام ہوا اور ڈگریاں بھی مل چکی ہیں۔ طنز و مزاح پر پنجاب کے بعد لکھنؤ اور بمبئی میں تحقیقی کام ہوا۔ رسوا پر علی گڑھ، بمبئی اور پنجاب میں ڈگریاں دی گئیں۔ اردو ادب کے سیاسی اور سماجی پہلو پر پنجاب اور سندھ میں۔ قائم پر علی گڑھ اور کراچی میں کام ہو رہا ہے۔ آزاد پر پنجاب سے اور اس کے بعد کراچی سے کام ہوا ہے۔ میر حسن پر پنجاب سے کام ہوا اور چھپ گیا، اب کراچی یونیورسٹی اور پٹنہ میں بھی جاری ہے۔ یونیورسٹیوں کے علاوہ ادارے بھی اس دوڑ میں مصروف ہیں۔ گلشن ہند از حیدر بخش حیدری کے سن کی اشاعت ڈاکٹر مختار الدین آرزو، ڈاکٹر اقتدا حسن اور ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اپنے اپنے ذمے لی۔ آرزو کا سن آچکا ہے اور دوسرے ابھی مصروف ہیں۔ ”کرپل کٹھا“ پر ڈاکٹر آرزو نے کام شروع کیا، اس کی خبر اہل دہلی کو بھی ہو گئی۔ چنانچہ دہلی یونیورسٹی کا سن فوراً چھپ

گیا ، پھر مالک رام اور آرزو نے بھی اپنا متن شائع کر دیا ۔ مصحفی کے کلیات کی اشاعت کے سلسلے میں نثار احمد فاروق اور نور الحسن نقوی کے درمیان دوڑ جاری ہے ۔ نقوی نے دیوان مصحفی کی جلد اول دلی سے شائع کی ، فاروق جلد دوم چھاپ کر مارکیٹ میں لے آئے ۔ مصحفی کے آٹھ دیوان ہیں ، دیکھئے یہ معرکہ کب تک جاری رہتا ہے ۔ لاہور سے دیوان زادے کا انتخاب چھپا اور فاضل مرتب پورا دیوان زادہ مرتب کر رہے تھے کہ یہی سلسلہ رام پور سے شروع ہو گیا ۔ اب دونوں دیوان زادے گھوڑ دوڑ کے میدان میں آکر چمکے ہیں ۔

علمی و ادبی معاملات میں اس طرح کی تنگ نظری کسی اچھے معیار کا پیش خیمہ نہیں ہو سکتی ۔ اس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ اب تک کی باہمی آویزش سے جو سرمایہ علمی سامنے آیا ، اس کا زیادہ حصہ ناقص اور بیہودہ ہے ، کیوں کہ بعض مقلدین گویے سبت لے جانے کی تنگ و دو میں موضوع سے انصاف نہیں کر پاتے اور بعض نے دوسروں کی محنت کو بغیر حوالے کے اپنے ہاں سمو کر اخلاقی دیانت داری کا ثبوت نہیں دیا ۔ اردو تحقیق کے لیے یہ صورتِ حال بہت تشویش ناک ہے ۔

(۶)

ہماری معاشرتی زندگی کا ایک اور رجحان بھی تحقیق کے لیے آزمائش کا حکم رکھتا ہے ، اردو میں تحقیق کی روایت پہلی جنگِ عظیم کے بعد تنقید سے الگ ہو گئی ۔ ابتدائی محنتوں نے حقائق کی جمع آوری اور واقعات کی صحت کا خیال تو رکھا لیکن حقائق کی تعبیر و تاویل اور فلسفیانہ توجیہ سے دامن کش رہے ۔ تاریخِ ادب کے لیے وہ خام مواد مہیا کر کے مطمئن ہو گئے اور ادب کے تخلیقی عمل اور تنقیدی شعور سے کنارہ کش رہے ۔ نقادوں نے تحقیق کو تنقید کے مقابلے میں گھٹیا ذہنی عمل گردانا اور تحقیق و تنقید کے فاصلے بڑھانے چلے گئے ۔ تقسیم بر صغیر کے بعد تنقید کو تحقیق کا دشمن قرار دے کر نقادوں نے ہر حقارت رویہ اپنا لیا ۔ اس مغایرت اور نفرت آمیز رویے نے تحقیق کے لیے تنقید کی اور تنقید کے لیے تحقیق کی ضرورت کا ادراک نہ ہونے دیا ۔ محقق کلی سڑی ہڈیوں کے تاجر قرار پائے اور سماجی

مرتبے کے سنگھاسن پر صرف تنقید کو جگہ ملی۔ اسی افراطی نے اردو ادب کے بعض اہم محقق کھو دیے۔ بعض نے تحقیق سے توبہ کر کے تنقید کو اپنا لیا کہوں کہ تنقید کی مارکیٹ زیادہ بلند سماجی مرتبے کی ضامن تھی۔

گزشتہ ایس برس کے تحقیقی سرمائے کو نظر غائر سے دیکھا جائے تو اس میں مست روی کے باوجود ایک حصہ ایسا ضرور ہے جسے قابل اعتنا قرار دیا جا سکتا ہے۔ حکومت کی طرف سے تحقیق کے معیار کو بلند کرنے اور سہولت ہم پہنچانے کی کوششیں برابر جاری ہیں۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد بعض ادارے قائم کیے گئے۔ ۱۹۵۸ء سے لے کر ۱۹۶۸ء تک کئی نئے ادارے اور نئے منصوبے اس میں شامل کیے گئے۔ انجمن ترقی اردو کراچی، پاکستان پستاریکل سوسائٹی، اقبال اکیڈمی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، سندھی ادبی بورڈ، ترقی اردو بورڈ کراچی (= اردو ڈکشنری بورڈ)، اردو اکیڈمی بہاولپور، اردو اکیڈمی لاہور، مرکزی اردو بورڈ لاہور (= اردو سائنسی بورڈ)، بزم ثقافت لاہور، بزم اقبال لاہور، مجلس ترقی ادب لاہور، پنجابی اکیڈمی لاہور، پشتو اکیڈمی پشاور وہ چند ادارے ہیں جو مختلف مرحلوں میں حکومت کی مالی مدد سے ادب و فن کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان میں بیشتر نے اپنی توجہ اردو محقق پر صرف کی۔ جتنا تحقیقی سرمایہ اس سرکاری مدد سے میسر ہوا ہے، قابل لحاظ ہے۔ ظاہر ہے کہ سب لکھنے والوں کا تحقیقی معیار ایک جیسا نہیں ہو سکتا اور معاشرے کے عام رجحانات سے محققوں کا دامن بچانا بھی ممکن نہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ اگر مختلف ادارے باہمی تعاون اور مرکزی منصوبہ بندی کے تحت اپنی تحقیقی حدود مقرر کر لیں تو ہمارے ہاں افرادی سرمائے اور مالی سرمائے دونوں سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جا سکتا ہے۔ موجودہ صورت میں ان اداروں نے جو کچھ کیا ہے، اس کی رفتار کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ۱۹۵۷ء سے ۱۹۵۸ء تک مذکورہ بالا اداروں میں سے بعض وجود میں نہیں آئے تھے اور جو موجود تھے، ان کی پالیسی واضح نہ تھی، اس لیے اس دور میں کام کی رفتار بہت مست تھی۔ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۸ء تک ان اداروں کی کارگزاری کی رفتار اور کام کی مقدار میں خاصا

اضافہ ہوا۔ ان دس برس میں تحقیق کی سہولتوں کے بڑھ جانے اور مالی اسدات کے اضافے سے ہمارا علمی سرمایہ بعض اعلیٰ درجے کی تحقیقی تصانیف سے مالا مال ہوا۔ اگر ہم مختلف اداروں پر ایک سرسری نظر بھی ڈالیں تو ہمیں اعلیٰ پایے کی تحقیقی تصانیف کا کچھ نہ کچھ سرمایہ مل جاتا ہے۔ انجمن ترقی اردو کے اہم منصوبوں میں سے قاموس الکتب کا منصوبہ بہت اہم ہے۔ اس کی پہلی جلد جو اردو میں سنہی کتابوں کی فہرست پر مشتمل ہے، بعض جزوی امور سے قطع نظر، اردو کے علمی سرمائے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ فہرست مخطوطات اردو کی جلد اول بھی انجمن کے علمی کام کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ انجمن ترقی اردو نے جو متن تصحیح کے بعد شائع کیے، ان میں پھول بن، من لکن اور گلشن عشق کو استہازی حیثیت حاصل ہے۔ چند مقالات کے مجموعے اور سونوگراف بھی انجمن کے علمی کام کا اچھا نمونہ ہیں۔ شاہی ہند کی اثری داستانیں، اردو تھیٹر، غالب فکر و فن، سرشار کی ناول نگاری، گلزار صحافت اور قدیم اردو، انجمن کے معیار کی ضمانت ہیں۔ اسی طرح اقبال اکیڈمی کی تصانیف میں اقبال کی غیر مدون تحریروں کے مجموعے اور تذکرۂ شعرائے کشمیر قابل قدر ہے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرس نے ہمارے تعلیمی نظام کے متعلق بعض کتابیں شائع کر کے اردو کی علمی حیثیت کو مستحکم کیا ہے۔ سندھی ادبی بورڈ نے صوبہ سندھ کے علاقے میں فارسی اور سندھی سرمائے کے علاوہ کچھ اردو کی طرف بھی نگاہ التفات کی۔ ترقی اردو بورڈ نے متن شائع کرنے کا کام بھی اپنے ذمے لیا لیکن اس میدان میں باغ و بہار کے سوا وہ کوئی اہم خدمت انجام نہیں دے پائے۔ اردو لغت کی اشاعت ان کا ایک اہم کارنامہ ہے اور اب تک جو اجزا چھپ کر سامنے آئے ہیں، ان سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اردو میں لغت کی ضرورت کو یہ ادارہ بخوبی پورا کر رہا ہے۔ اردو اکیڈمی بھاولپور کی کتابوں میں طبی لغت اور ڈاکٹر مسٹر عبدالحق کا تحقیقی مقالہ خاصے کی چیزیں ہیں۔ اردو اکیڈمی لاہور نے درسی ضروریات کے علاوہ اردو کی قاموس شائع کر کے علمی سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا۔ مرکزی اردو بورڈ لاہور نے سائنسی کتابوں کے علاوہ اردو کو باثروت بنانے کے لیے تراجم کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ اس لحاظ سے ان کی شائع کردہ کتابوں میں ”بلوغ الاولیٰ“ اور ”الانحیاء الطوال“ تحقیقی

اور علمی لحاظ سے اس ادارے کی دوسری کتابوں پر فوجیت رکھتی ہیں ۔ پنجابی ادبی اکیڈمی نے تحقیقات جشتی اور بعض دوسری کتابیں شائع کر کے اردو ادب کو فائدہ پہنچایا ۔ پشتو اکیڈمی نے پشتو ادب کے علاوہ اردو اور پشتو کے تعلق پر ایک کتاب شائع کر کے اردو کے لسانی جائزے میں ایک نئی منزل کا سراغ لگایا ۔ مجلس ترقی ادب لاہور نے بھی اپنی بساط کے مطابق اردو ادب کی خدمت کی ۔ مجلس ترقی ادب کے دائرہ کار میں کلاسیکی ادب کی اشاعت اہم ہے ۔ ادارے نے فورٹ ولیم کالج کی تصانیف کو شائع کرنے میں خاصی محنت اٹھائی ہے ۔ اس کے علاوہ تذکروں اور مصنفین پر کتابوں کے منصوبے بھی چل رہے ہیں ۔

(۷)

سرکاری اعانت میں چلنے والے اداروں کے علاوہ بعض ناشرین نے بھی اردو ادب کی طرف توجہ کی ۔ گلشن نے خار کے دو ترجمے شائع ہوئے ، خطوط غالب چھپی ، حالی کا ذہنی ارتقا ، انتخاب شاہ حاتم ، ہفت گلشن ، داغ ناشرین کی مساعی کا نتیجہ ہیں ۔ چند ایک اور کتابیں بھی ناشرین کی کوششوں سے شائع ہوئیں ۔

تحقیق کا ایک اور مستقل حلقہ پاکستان کی یونیورسٹیاں ہیں ۔ یونیورسٹیوں میں تحقیق کا کام خاصی مقدار میں ہوا ہے ۔ پنجاب یونیورسٹی ، کراچی یونیورسٹی ، سندھ یونیورسٹی ، پشاور یونیورسٹی اور زرعی یونیورسٹی میں تحقیق کا کام برابر ہو رہا ہے ۔ بعض یونیورسٹیوں میں ایم اے کی سطح پر اردو کے مقالے بکثرت لکھے گئے ۔ پشاور یونیورسٹی اور زرعی یونیورسٹی کے سوا یہ ایچ ڈی اور ڈی لٹ کے مقالے بھی شائع ہوئے ۔

(۸)

یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام محتاج تعارف نہیں ۔ تشکیل پاکستان کے بعد جتنے بھی تعلیمی کمیشن قائم ہوئے ، ان سب نے تحقیق پر زور دیا ۔ قومی تعلیمی کمیشن کے قیام سے یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام کی اہمیت کا

احساس بڑھ گیا۔ کمیشن کی رپورٹ میں اعلیٰ سطحوں پر تحقیق کی اہمیت کو زور الفاظ میں بیان کیا گیا۔ رپورٹ میں اس بات پر زور دیا گیا کہ یونیورسٹی میں تحقیق کو اہم مقام دیا جائے، کیوں کہ تحقیق ایک استاد کو مستعد، متحرک، فعال اور جدید معلومات سے باخبر رکھنے کا وسیلہ ہے۔ چنانچہ سفارش کی گئی کہ ہر یونیورسٹی اپنے ہاں تحقیقی سہولتیں مہیا کرے اور تعلیمی شعبوں کو مضبوط بنیادوں پر استوار کر کے استادوں کی (تحقیقی کام کی بنیاد پر) مناسب حوصلہ افزائی کرے۔ کمیشن کی رپورٹ کے تمام پہلوؤں پر اگرچہ عمل نہیں کیا جا سکا لیکن اس سے یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام میں سرگرمی پیدا ہوئی۔ گزشتہ دس سال (یعنی ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۸ء) میں یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام کی اہمیت پر خاصا اصرار کیا گیا ہے۔ مختلف یونیورسٹیاں اعلیٰ سطحوں پر تحقیق کے علمی کام پر خصوصی توجہ کر رہی ہیں۔

(۹)

گزشتہ دس برس کے تحقیقی کام بغور دیکھا جائے تو چار اہم رجحان نظر آتے ہیں اور گان غالب ہے کہ مستقبل میں تحقیقی کام انہی مرکزی شکات سے متعلق ہوگا :

(الف) قدیم ادبی سرمایے کی بازیافت اور متن کی مناسب تصحیح۔

(ب) پاکستان کے قدیم اردو ادیبوں اور شاعروں کے کارناموں کی مناسب اشاعت۔

(ج) اردو زبان کے لسانی رشتوں کا مقامی عناصر سے تعلق۔

(د) ثانوی لغت اور اصطلاحات سازی کی اہمیت۔

یہ رجحانات ابھی ابتدائی حالت میں ہیں اور آگے چل کر ان سے تحقیق کی ایک منظم اور مربوط روایت کی داغ بیل کی توقع ہے۔ اسد ہے آئندہ چل کر پاکستانی شعور اور پاکستانیوں کے عزائم کی جھلک تحقیقی میدان میں بھی نظر آئے گی۔

پنجاب یونیورسٹی کا ایک تحقیقی مقالہ

(۱)

پنجاب یونیورسٹی میں مشرقی علوم کے تحقیقی سرمائے میں پی ایچ ڈی کے مقالات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ عربی، فارسی، اسلامیات، اردو اور پنجابی، سنسکرت اور ہندی کے مختلف موضوعات پر تحقیقی مقالات کا ایک بیش قیمت سرمایہ موجود ہے۔ مشرقی علوم کو اس دانش گاہ میں ملت تک امتیاز حاصل رہا ہے۔ ڈاکٹر لائٹر، ڈاکٹر لکشمی سرپ، ڈاکٹر آرنلڈ، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوالہ، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، پروفیسر عبدالعزیز سبحی، حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ اور پروفیسر وولز کی شخصیتیں محتاج تعارف نہیں۔ ان فضلاء کی نگرانی میں تحقیقی و تالیفی اور تدوین متون کی جو روایت قائم ہوئی اس کی بنا پر مشرقی علوم و ادبیات میں خاص طور پر اعلیٰ درجے کے مقالات لکھے گئے اور بعض متون کی تصحیح و تالیف کا معیاری کام بھی ہوتا رہا۔ اس مادر علمی کے کئی نامور فرزندوں کے مقالات شائع ہو کر محققین و ماہرین سے داد وصول کر چکے ہیں۔ شائع شدہ تحقیقی مقالات میں اردو کے بارے میں ڈاکٹر محمد صادق کا تحقیقی مقالہ بعنوان ”محمد حسین آزاد“ اور فارسی کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا مقالہ ”ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ“ ان چند مقالات میں سے ہیں جن کی اشاعت کے بعد پنجاب یونیورسٹی کے تحقیقی سرمائے کی دھاک بیشہ گئی۔ شائع شدہ مقالات کی تعداد کم رہی اور اس میں بیشتر حصہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے لیکن اشاعت کی نوبت نہیں آ سکی۔

مشرق علوم اور ادبیات کے اس اہم تحقیقی ذخیرے کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ تو بعض قدیم متون کی تالیف اور تفسیر کا ہے، دوسرا ابوالہسرا حصہ دراصل تحقیق کے طریق کار کی بنا پر

الگ الگ شمار کیا جا سکتا ہے۔ پولیورشی کے تحقیقی قواعد کے مطابق دو قسم کی تحقیق ممکن ہے۔ ایک یہ کہ محقق واقعاتی اور تاریخی حوالے سے کوئی نیا مواد دریافت کرے اور مقالے کی بنیاد پر اس پر رکھے، دوسرا یہ کہ پہلے سے معلوم اور موجود مواد کی بنا پر سابقہ مواد کی کون سی نئی تعبیر یا تشریح پیش کرے۔ پہلی قسم میں محقق زیادہ تر واقعات اور سنین کے اندراج کی کوشش کرتا ہے اور اس کا رویہ واقعاتی (Factual) ہوتا ہے۔ دوسرے وہ محقق ہے زیادہ نقاد کا فریضہ بروئے کار آتا ہے اور پہلے سے موجود حقائق کی تنقیدی اور تجزیاتی تعبیر و تشریح کرتا ہے۔ اس ذخیرہ علم میں آج جس مقالے کے مطالب سے بحث کی جائے گی۔ اس کا تعلق اردو ادب سے ہے۔

گزشتہ چند برس میں جو مقالے اردو میں لکھے جا رہے ہیں ان کا غالب رجحان تحقیق سے زیادہ تنقید کی طرف ہے۔ تحقیق اور تنقید لازم و ملزوم ہیں اور ایک کے بغیر دوسرا نامکمل اور ناقص رہتا ہے۔ اردو کے تحقیقی مقالات کا یہ پہلو خوش آئند بھی ہے اور افسوس ناک بھی۔ خوش آئند اس لحاظ سے کہ تنقیدی نقطہ نظر سے لکھے گئے مقالات میں مواد کی چھان بھانک کے ساتھ ان کی تجزیاتی قدر و قیمت بھی پیش نظر رہتی ہے اور تحقیق محض گورکنی نہیں رہتی اور افسوس ناک اس اعتبار سے کہ ایسے اکثر مقالات کا معیار کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں اور محقق قدرت فکر اور تخیل کی اڑانوں میں گرفتار ہو کر واقعات کی صحت کی طرف زیادہ اعتنا نہیں کرتے۔ نتیجتاً ان کے تنقیدی نتائج یا در ہوا مفروضوں پر مبنی رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے اردو کے مقالات میں اس حصہ خاص میں مجھے صرف تین مقالے ایسے ملے جن میں تنقیدی تجزیے کو حقائق کی بنیاد پر استوار کیا گیا ہے۔ ۱۹۸۰ء تک ڈاکٹر رضیہ نور محمد کا مقالہ ”اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات“، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا مقالہ ”اکبر الہ آبادی“ اور ڈاکٹر سلیم اختر کا مقالہ ”لفظیاتی دبستان“ میرے نزدیک اردو کے سرمایہ علم میں اہم اضافہ ہیں۔ ان میں سے آج ڈاکٹر رضیہ

نور محمد کے مقالے کا تعارف پیش کیا جاتا ہے ۔

(۲)

ڈاکٹر رضیہ نور محمد ، ٹریفنگ کالج برائے خواتین کی پرنسپل رہی ۔ انہوں نے اپنی تعلیمی زندگی کا آغاز بمبئی میں کیا تھا ۔ پھر برائٹیوٹ طور پر ایم ۔ اے فارسی تک تعلیم کی تکمیل پنجاب میں کی ۔ مشہور محقق پروفیسر محمد شجاع الدین مرحوم سے فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اسلامیہ کالج برائے خواتین کوہر روڈ سے تدریسی کام کا آغاز کیا ۔ انگریزی ادبیات میں تعلیم کی اعلیٰ اسناد حاصل کر کے کوئین میری کالج ، ہوم اکنامکس کالج ، لاہور کالج برائے خواتین ، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے بعد موجودہ منصب پر آئی ہیں ۔ انہوں نے پروفیسر شجاع الدین مرحوم کے ذوقِ تاریخ اور شغفِ ادبیات فارسی سے استفادہ کیا جس سے ان کا حقائق کی چھان بھٹک کا انہماک اجاگر ہوا ۔ ان کے اپنے ذوق کا پتہ افسانہ نگاری سے ملتا ہے ۔ چنانچہ اوائل میں ان کے کئی افسانے رسالہ ادب لطیف میں جو ان دنوں مرزا ادیب کی ادارت میں شائع ہوتا تھا شریکِ اشاعت ہوئے ۔ انہیں اپنے پنجابی ناول پر کلمہ کی طرف سے اعلیٰ مقام بھی مل چکا ہے ۔ ان کے بر دو رجحانات یعنی تحقیق اور تنقید کی آمیزش سے یہ تحقیقی مقالہ خاصے کام کی چیز ہو گیا ہے ۔

(۳)

”اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی خدمات“ میں صحتِ واقعات کا اہتمام ہے اور ساتھ ہی تجزیاتی طریق کار کی مدد سے مستشرقین کے کارناموں کا ادبی ، تدریسی اور علمی مرتبہ تعین کیا گیا ہے ۔ انہوں نے تنقید کو ٹھوس حقائق پر استوار کیا ہے اور مستشرقین کے کارناموں کے پس پشت محرکات کی تلاش و جستجو کی ہے اور مختلف ادوار کا سماجی اور اقتصادی عوامل کے پس منظر میں تجزیہ کیا ہے ۔ اس لحاظ سے ان کی تنقید کا مسلک سماجی حوالوں سے متعین ہوتا ہے ۔

یہ مقالہ ۵۲۹ نائپ شدہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مستشرقین کی خدمات کو اہل یورپ کی آمد یعنی ۱۳۹۸ء سے شروع کیا گیا ہے اور یہ داستان ۱۹۴۷ء پر ختم کی گئی ہے۔ اس طرح مقالے کا کینوس ساڑھے چار سو سال پر پھیلا ہوا ہے۔ ظاہر ہے اتنے طویل دور میں پر مستشرق کی علمی خدمات کا مفصل جائزہ ممکن نہیں۔ انہوں نے صرف چند اہم مصنفین کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور باقی افراد کا جمل تذکرہ ہوا۔ اس میں بھی زیادہ توجہ انہوں نے ادوار کے نمبرنے اور مستشرقین کے رجحانات و میلانات کی شناخت پر کی ہے۔ مستشرقین کے ذخیرہ تحریر کو مربوط طور پر ابھی تک دیکھنے کی سعی نہیں کی تھی۔ اس مقالے میں مقالہ نگار نے پہلی بار ادوار کی خصوصیات کا تعین کیا ہے اور اس کے پس پردہ عوامل کا سراغ لگایا ہے جس سے اردو کی ادبی تاریخ کی بعض غلط فہمیوں کی تصحیح بخوبی ہو گئی ہے اور بعض آجہل گوشے بھی سامنے آ گئے ہیں۔

(۴)

اردو ادب کا طالب علم ادبی تاریخ کو عموماً شمالی ہند سے بیان کرنے کا عادی ہے اور اس میں فورٹ ولیم کا تذکرہ محض ایک محدود جزیرے کے طور پر کرتا ہے۔ مشرق اور جنوب کی ادبی تحریکات کا شمالی علاقوں سے کیا رشتہ تھا؟ دکنی ادب سے ہماری تاریخ سیدھی شمال میں آ کر برصغیر کے دوسرے گوشوں کو نظر انداز کرنے کی قائل ہے۔ اسی طرح دکن میں لٹر کی مربوط تاریخ کے بعد فورٹ ولیم کالج اور پھر یک لخت ۱۸۵۷ء تک آنکھیں کا نتیجہ یہ ہے کہ شمالی ہند میں لٹر کی کوئی مربوط تاریخ بنی نظر نہیں آتی۔ ڈاکٹر رضیہ نور چد نے اپنے مقالے میں ان کم شدہ کڑیوں کو دریافت کیا ہے اور بتایا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کی لٹر درسی ضرورت کے تحت لکھی گئی اور اس کا بنیادی رشتہ مذہبی اسالیب سے نہیں بلکہ اردو اور فارسی اسالیب کے ان بیانون سے ہے جو لٹر سادہ کے روپ میں یہاں رائج تھے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ خود فورٹ ولیم کالج میں اعلیٰ جماعتوں میں رنگیں بیانی اور صنائع ہذالغ اور نشیب و استعارے کا زور ہے اور یہی اس زمانے میں مقبول تھے۔ انہوں نے فورٹ ولیم کالج اور شمالی ہند کی لٹر کے دوسری خلا کو بابل کے اردو تراجم سے پورا کیا ہے اور بتایا

ہے کہ کس طرح بول چال کی زبان اور محاوروں کو بائبل کے تراجم میں استعمال کیا گیا۔ اس کی نشان دہی بھی کی گئی کہ ہر چند ہرس کے بعد تراجم ہر نظر ثانی ہوئی اور زندہ اور بول چال کی زبان کو ہر بار بائبل میں برتا گیا۔ اس سے اردو نثر سادہ کی تاریخ نہ صرف یہ کہ ایک نئے اسلوب سے آگیا ہوئی بلکہ اس کے تسلسل اور نواتر کا بند بھی چل گیا۔ فورٹ ولیم کالج کے بارے میں اس غلط فہمی کو بھی انہوں نے حقائق کی مدد سے دور کیا ہے کہ یہ مستشرقین سیاسی مصلحتوں سے بالا تھے۔ فورٹ ولیم کالج، سی ایس ایس اکیڈمی لسم کی چیز تھا جس میں زبانوں کا شعبہ محض ایک محدود اور غیر موثر ادارے کی حیثیت رکھتا تھا اور یہ کہ اس کے اثر و نفوذ کی داستان مبالغہ آمیز ہے۔ فورٹ ولیم کالج اور انگلستان کے پہلی بری کالج کے بارے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے رویے کو بھی انہوں نے وضاحت سے بیان کیا ہے اور بتایا کہ فورٹ ولیم کالج کے مستشرقین اردو کے لسالبائی پہلوؤں کو بند آریائی حوالوں سے دیکھنے کے عادی تھے۔ ضمناً انہوں نے رائل ایشیائک سوسائٹی کی سنسکرت پسندی کا بھی تجزیہ کیا اور ولیم جولی کی خدمات کو صحیح تناظر میں پیش کیا۔ اس ضمن میں انہوں نے برطانوی اقتدار، پادریوں کی اردو دانہ اور مستشرقین اور مغرب پرستوں کی آویزشوں کو بھی بیان کیا اور اردو ادب پر اس کا کیا اثر پڑا اس کی وضاحت بھی کی۔ انہوں نے بتایا ہے کہ برطانوی حکومت اول اپنی رعایا کو پدرائہ شفقت کے اصول سے دیکھتی رہی پھر پالیسی میں تبدیلی آئی اور سولہ سروس کے افسروں نے جہاں کے رسم و رواج اور زبانوں کے بارے میں اپنی پالیسی بدل دی، تیسرا دور وہ ہے جب مستشرقین کو تعلیمی نظام میں شکست اور مغرب نوازوں کو کامیابی حاصل ہوئی اور مقامی زبانوں کا مطالعہ مستشرقین کے لیے محض ایک اکیڈمک سرگرمی بن کر رہ گیا۔

(۵)

مقالہ دس ابواب پر مشتمل ہے پہلا باب پس منظر کے عنوان سے ہے، جس میں اردو زبان کے خمیر میں غیر زبانوں کے الفاظ خصوصاً پرتگالی الفاظ کی تفصیل دی گئی ہے۔ اصل مقالہ دوسرے باب سے شروع ہوتا ہے

جس کا عنوان ہے ”اہل یورپ کی آمد اور اردو زبان و ادب کی حالت ۱۷۵۶ء تک“، اس باب میں اس بنیادی حقیقت کو بیان کیا ہے کہ اس زمانے میں اردو کے بارے میں گرامر کی جو کتابیں لکھی گئیں ان میں لاطینی گرامر کو نمونہ بنایا گیا نیز اس پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ اردو کے بارے میں لکھنے والوں میں اس زمانے میں بھی پرتگالی، فرانسیسی، ولندیزی اور جرمن تھے، انگریزی مشرق کا دکا ہی ملنے لگی۔ کلائیو کی آمد کے بعد سے انگریز مشرقین ملنے لگے ہیں۔ تیسرے باب میں مشرقین کی خدمات کو ۱۸۰۰ء تک پیش نظر رکھا گیا ہے اور بتایا کہ وہ کون سے مذہبی سیاسی اور سماجی محرکات تھے جن کی بنا پر انگریز مشرقین نے مقامی زبانوں کی طرف توجہ کی اور کس ضرورت کے تحت فورٹ ولیم کالج قائم ہوا۔ اردو سے زیادہ ہندی اور ہندی سے زیادہ سنسکرت اور عربی فارسی کی طرف کیوں زیادہ توجہ کی گئی۔ چوتھے باب میں فورٹ ولیم کالج کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس مقالے کا سب سے اہم حصہ یہی ہے۔ پانچویں باب میں دیگر مصنفین و محققین کو لیا گیا ہے، خصوصاً عیسائی مشرہوں نے لغت اور گرامر اور تراجم میں جو خدمات انجام دیں ان کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ باب ششم میں ۱۸۲۰ء سے ۱۸۵۷ء تک کے مراحل بیان ہوئے ہیں اور انگریزیت پسندی کی پلغار کے عقب میں بعض عوامل کو دیکھا گیا ہے۔ ایک باب گزشتہ دہائی کے لیے مخصوص ہے۔ پھر ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک مشرقین کی علمی کامیابیوں کو بیان کیا گیا ہے اور یورپ میں مشرقین نے کیا کیا کارنامے انجام دیے ان کی وضاحت کی ہے؛ لیکن یہاں بھی زیادہ توجہ ارضخبر پر مرکوز ہے۔ اس زمانے میں مقامی زبانوں کی تحقیق کا مقصد سماجی حالات سے آگاہی تک رہ گیا تھا۔ ایک باب پنجاب میں مشرقین کی اردو خدمات کے لیے وقف ہے۔ آخری باب کا موضوع ۱۹۰۰ء سے ۱۹۳۷ء تک کے دور کا جائزہ ہے جب بعض مشرقین نے ذاتی شوق سے اور بعض نے فوجیوں کو اردو سکھانے کے لیے علمی کام کیا اور کتابیں تصنیف کیں۔

(۶)

کتاب کا ایک دلچسپ پہلو نقابلی مطالعہ ہے جس میں انہوں نے

پنجاب و سرحد میں خاص خاص موضوعات کی مقبولیت اور دلی اور اس کے نواح کے مستشرقین کے مختلف روئے کو دریافت کیا ہے۔ - ۱۸۵۷ء کے بعد برطانوی حکومت نے مقامی باشندوں پر بغاوت کا الزام لگایا اور معاندانہ رویہ اختیار کی۔ - ۱۹۳۰ء کے بعد سے یہ احساس شدید ہو گیا اور تحقیری رویہ آہٹرا۔ - برطانوی روئے میں اس تبدیلی کے مضمرات کو بھی مقالہ نگار نے بڑی مہارت سے پیش کیا ہے۔ -

مجموعی طور پر مقالے کی بنیادی اہمیت تحقیق سے زیادہ تنقیدی ہے اور یہ اس لحاظ سے اس قابل ہے کہ اسے شائع کر کے اردو ادب کی تاریخ کے بعض خلا پر کر دیے جائیں۔ -

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ

(۱)

اس ربع صدی میں دو کتابوں کی دریافت اور اشاعت تاریخ ادب اردو کے لیے بعض دور رس نتائج کا باعث ہوئی۔ ایک زمانہ تھا جب اردو نظم و نثر کی تاریخ ولی سے بچھے نہ جاتی تھی اور لسانی مراحل کا تعین قیاسات اور فرضی حقائق کی بنا پر ہوتا تھا۔ ہمد قلی قطب شاہ کے کلیات کی اشاعت نے اردو ادب کا دائرہ وسیع کر کے دسویں صدی ہجری تک پہنچا دیا۔ دکنیات نے اردو ادب کے تسلسل کو بحال کیا اور شعری روایت کے مد و جزر ہی کا سراغ نہیں لگایا بلکہ لسانی مباحث کو ایک نئی جہت بھی عطا کی۔ معراج العائین سے قطع نظر کہ اس کے لیے یقین اور بدگمانی کے کئی دعوے موجود تھے، نظامی دکنی کی مثنوی کی اشاعت سے اردو ادب کی تاریخ بلا شبہ دو صدیاں بچھے چلی گئی ہے۔ اس کی مدد سے لسانی تغیرات کی جو روایت ولی لک قائم ہوئی ہے اس سے معراج العائین کی حیثیت اور بھی مشکوک ہو گئی ہے۔ دوسری کتاب جس نے اردو کے ادبی سرمائے کو ایک بار پھر لسانی نقطہ نظر سے آٹھ ہلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا ہے وہ فضلی کی کریل کتھا ہے۔ جنوب اور شمال کی ادبی روایتوں کی شناخت اور ان کے عہد بعد ارتقاء کا دائرہ تاریخ ادب کے نقادوں ہی کے لیے نہیں لسانیات کے ماہروں کے لیے بھی کئی چیلنج رکھتا ہے۔ اردو ادب کی جب بھی کوئی تاریخ لکھی جائے گی نظامی دکنی کی مثنوی اور کریل کتھا دو اہم انکشافات شمار ہوتے رہیں گے اور ان کی بنیاد پر اردو ادب کی روایت کے علاوہ لسانی روایت کی شناخت کے مباحث بھی غور و فکر کی نئی راہیں کھولتے رہیں گے۔

(۲)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے مثنوی نظامی دکنی یعنی کدم راؤ پدم راؤ

کو دریافت تو نہیں کیا کہ ان سے پہلے مولوی عبدالحق یہ سہرا اپنے سر
 بالندہ چکے تھے ، البتہ اس کے ناخوانا متن کو چھاننے کا کام ایک عرصے
 تک مشنوی رہا ۔ ڈاکٹر جالبی نے بائج برس کی محنت سے اس نامکمل مشنوی
 کو اب چھاپ دیا ہے ۔ انجمن ترقی اردو کراچی کے اشاعتی پروگرام میں
 تقسیم برصغیر کے بعد غالباً یہ پہلا اہم علمی کارنامہ ہے ۔ فوٹو آئسٹ پر ہر
 صفحے کا عکس بھی شامل ہے اور مقابل کے صفحے پر جالبی صاحب کا تیار
 کردہ متن چھاپ دیا گیا ہے ۔ متنوں کی تصحیح عام طور پر بڑا آسان کام
 سمجھا جاتا ہے ۔ جہاں فوٹو ولیم کالج کی کتابوں کی مطبوعہ کتابوں کو کاتب
 کے حوالے کر دینے کا نام تدوین متن سمجھا جاتا ہو وہاں نسخے کے اصل متن
 کا عکس شریک اشاعت کرنا اس لیے بھی ناگزیر ہو جاتا ہے کہ مراتب کی
 محنت اور عرق ریزی کا صحیح اندازہ تقابلی مطالعے ہی سے ممکن ہے ۔ حقیقت
 یہ ہے کہ علمی نسخے کے تسامحات ، کاتب کے خصائص کتابت اور قدیم
 طرز اسلا کی دقتوں کو حل کرنے کے لیے جس محنت ، حوصلے ژرف بینی اور
 احتیاط کی ضرورت ہے ، فاضل مراتب نے اس کا پورا پورا لحاظ کیا ہے ۔
 ہمارے معاشرے میں اس طرح کی محنت کا رواج کچھ کم سا ہوتا جا رہا
 ہے ایسے میں امن مشنوی کی اشاعت اور تدوین کارنامے سے کم نہیں ۔ جمیل
 جالبی اس سے پہلے دکنیات کے دو تین متن شائع کر چکے ہیں ۔ اس کے بعد
 انہوں نے اس مشکل کام میں ہاتھ ڈالا ہے ۔ یہ وہ بھاری پتھر تھا جسے (اس
 کتاب کے ابتدائیہ فیکر نواب زادہ جمیل الدین عالی نے بھی اس کا اقرار کیا
 ہے) اکثر محققوں نے جوم کر چھوڑ دیا تھا ۔ یوں بھی منحصر بہ فرد نسخے
 کی تدوین جان جوکھوں کا کام ہے ۔ مراتب نے مختلف حروف کے دائروں
 اور اسلا کے خصائص کو مختلف اوزاق کے باہمی تقابل سے کچھ اس طرح
 حل کیا ہے کہ ایک ہزار بتس اشعار کے اس مجموعے میں اب صرف چند
 مقام ہی لاینحل رہ گئے ہیں ۔ شروع میں ساتھ صفحے کا متصل دیباچہ بھی
 شامل ہے ۔ جس میں زمانہ تصنیف ، مشنوی کے نام ، مصنف کے حالات ،
 خلاصہ ممالکات اسلا اور کاتب کے علاوہ کتاب کے لسانی اور ادبی پہلوؤں
 پر کھیل کر بحث کی گئی ہے ۔ متن کے آخر میں مشکل الفاظ کی قرۃ تک
 بھی شریک ہے ۔ آخر میں دو ضمیمے ہیں ، ایک سلاطین بھٹی کے حال میں
 دوسرا ان شخصیات کے بارے میں جو مشنوی میں آئی ہیں ۔ آخر میں ماخذ

کی فہرست بھی شامل ہے ۔

(۳)

کتاب کا بنیادی حصہ مشوری کے متن پر مشتمل ہے جس میں اس روایت کی پابندی کی گئی ہے جس کے سرخیل حافظ محمود شیرانی اور آخری اہم رکن ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان ہیں ۔ گویا مراتب نے متن کی اس تکنیک کو اختیار نہیں کیا جو دکنیات کے لیے ڈاکٹر زور اور ان کے ساتھیوں نے اختیار کی تھی اور جس میں صرف سیاق عبارت تک اپنے آپ کو محدود رکھا جاتا تھا اور اشکل سے لفظوں کی شناخت ہوتی تھی ۔ انہوں نے قلمی نسخے کے انداز کتابت اور اسلامی خصوصیات کو سیاق عبارت کے ساتھ ملا کر دیکھا ہے اور اپنی مساعی کو اسکاں حد تک آگے لے گئے ہیں ۔ اس کی پہچان کہ انہوں نے اپنے طریق کار کو ایک ایک شعر پر منطبق کیا ہے اس سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ انہی مشکل متن میں صرف گنتی کے مقام رہ گئے ہیں جو حل نہیں ہو پائے ۔ قاری کے لیے یہ بھی ایک آزمائش ہے کہ نسخے کے شائع شدہ عکس کو سامنے رکھ کر ان غلاؤں کو پُر کرے جو فاضل مراتب سے حل نہیں ہو سکے ۔

(۴)

قلمی نسخے کے کاتب کے ہارے میں جالی صاحب نے کچھ زیادہ نہیں لکھا ، یہ مسئلہ قاری کی حواہدہ پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ آجے معاصر نسخہ جانے یا بعد کا مخطوطہ شمار کر لے ۔ لواب جمیل الدین عالی نے اسے چھ سو برس کا مسودہ قرار دے کر معاصر نسخہ گردانا ہے اس سے اسانیات کے طالب علموں کے لیے کچھ الجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں ۔ یہ درست ہے کہ کتاب میں ترقیمہ نہیں ہے ، یہ بھی صحیح کہ محض خط سے زمانے کا تعین ہووی طرح ممکن نہیں لیکن آج کے زمانے میں فنون نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ کسی لیبائٹری میں آسانی کے ساتھ کاغذ اور روشنائی کا زمانہ قلمی طور پر معین ہو سکتا تھا ۔ اگر برٹش میوزیم کی لیبائٹری سے استفادہ کر لیا جانا تو یہ مسئلہ حل ہو جانا ۔ شائع شدہ متن کی بنیاد پر یہ لباس بے موقع نہ ہو گا کہ نسخے کی اسلا گیارہویں صدی کے اوائل میں ہوئی ہوگی ۔ نسخ کا

یہ رجحان جو اس نسخے میں ہے چھٹی صدی میں فارسی میں شروع ہوا۔ ساتویں اور آٹھویں صدی تک بعض حروف کے دوائر کو حاشیے میں دور تک کھینچ کر لے جانے کا طریقہ عام تھا۔ ت۔ ٹھ اور گ کی سرخوشہ صورتیں جو نویں، دسویں، گیارھویں اور بعض خاص خاص صورتوں میں بارھویں صدی کے اوائل تک آتی ہیں لیکن بعض داخلی شہادیں کاتب کو نویں صدی ہجری سے متعلق کرنے سے مانع ہیں۔ دکنی اردو میں ”ہور“ کی جگہ ”اور“ کا استعمال گیارھویں صدی میں عام ہے لیکن نویں صدی میں اس کا رواج مشکوک ہے، کم از کم چار مقامات پر ”اور“ کا استعمال (۲۱۳، ۲۸۹، ۳۹۵، ۸۹۵) کاتب کی دخل اندازی سمجھا جائے تو زمانہ کتابت بخوبی گیارھویں صدی قرار پا سکتا ہے۔ اسی طرح ”جیو“ کی جگہ ”جی“ (۱۵۵) بھی کاتب کی کارستانی ہو تو عجیب نہیں۔ ۵۳۱، ۵۵۵ اور ۶۲۰ میں ٹھانو، فانو، پانو، چھانو، نانو رقم ہیں اور تون غنہ کے بغیر بھی اسلا نویں دسویں صدی ہجری کی ہے۔ لیکن شعر ۸۵۰ میں ”کٹانوں“ لون غنہ کے ساتھ درج ہوا ہے۔ اسی طرح ”یہ“ کا استعمال گیارھویں صدی ہجری کے اوائل کی چیز ہے اور اس کی جگہ ”یو“ مستعمل تھا۔ شعر نمبر ۵۰۶ اور ۶۹۶ میں ”یہ“ کا لفظ پایا جاتا ہے۔ قیاس ہو سکتا ہے کہ نسخے کے کاتب کا زمانہ گیارھویں صدی کا اوائل یا حد دسویں کا آخر ہے۔ کاتب کے مسئلے کو چھوڑ دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیباچے میں کہیں کہیں کاتب کا مال نظامی کے حساب میں جمع ہو گیا ہے؛ مثلاً ص ۵۹ پر دو چشمی ۵ کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں نظامی کا کچھ دخل نہیں کیونکہ اسلافی خصائص کو بہر حال کاتب ہی کے کہانے میں جانا چاہیے تھا تا آنکہ کوئی داخلی شہادت وزن یا قافیے کی صورت میں برعکس تعین نہ کرتی ہو۔

قلمی نسخے پر کہیں کہیں ترمیم و اصلاح کا عمل بھی دکھائی دیتا ہے۔ بعض غلط لفظوں کو متن میں کالا یا بدلا گیا ہے اور حاشیے پر کہیں کہیں صحیح صورت کا دوبارہ اندراج ہوا ہے۔ بیشتر ترمیمیں کاتب کے قلم سے معلوم ہوتی ہیں لیکن اس کا امکان بھی ہے کہ بعض جگہ کسی مؤخر کاتب نے لسانی ڈھانچے کو اپنی صوابدید کے مطابق بدلا ہو۔ ص ۱۴۴

ہر ”چمکتار بھہ“ میں ”بھہ“ کو ”بھہے“ بنانے کا عمل اور ”ر“ کو ”ے“ کے ساتھ ملا دینے کا انداز اس بات کی گہازی کرتا ہے کہ ترمیم کرنے والے نے ”چمکتار بھہ“ کو ”چمکتا بھہے“ سمجھا ہے ”بھہے“ کی یہ صورت بارہویں صدی کے کسی کاتب کا کرشمہ بھی ہو سکتی ہے۔ یہ قیاسات ہیں جن کے لیے تالیفی مواد کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ ان مسائل کا قطعی حل لیبارٹری ہی میں ممکن ہے۔ اگر اس کا اہتمام کر لیا جاتا تو بعض مقامات پر متن کے تعین میں مراتب کی دشواریاں کم ہو سکتی تھیں۔

(۵)

یہ قابلِ ذاد ہے کہ متن کی صحت میں احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ تاہم کاتب نے چند مقامات پر اپنی سوجھ بوجھ کو بھی شریک متن کر لیا ہے :

- ۱۔ شعر ۷ ”ادھک“ کو ”ادی“ لکھا ہے
- ۲۔ شعر ۶۶ ”تہی“ کو ”تھی“ لکھا ہے
- ۳۔ شعر ۳۹۱ ”چند“ کو ”چندر“ لکھا ہے
- ۴۔ شعر ۴ ”رو چند“ کو ”رو چند“ لکھا ہے
- ۵۔ شعر ۵۲۶ ”لوہیں“ کو ”تمہیں“ لکھا ہے
- ۶۔ شعر ۷۰۴ ”پکڑوں“ کو ”پکڑن“ لکھا ہے
- ۷۔ شعر ۷۵۱ ”تہ“ کو ”تہہ“ لکھا ہے
- ۸۔ شعر ۹۷۰ ”گہات“ کو ”گات“ لکھا ہے

بعض جگہ کاتب نے ہوں بھی نقصان پہنچایا ہے کہ مراتب کے اضافوں کو قوسین میں نہیں رکھا۔ مثلاً شعر نمبر ۱۰۱۳ میں آخری ”ہوں“ مراتب کا اضافہ تھا جسے قوسین میں رکھنے کی ضرورت تھی، اسی طرح شعر ۷۰۸ میں ”پچھتاؤ“ کے آخر میں ”و“ کا اضافہ مراتب نے کیا تھا لیکن یہاں بھی قوسین غیر حاضر ہیں۔ شعر نمبر ۱۴ میں ”کو“ کے بعد ”لیے“ کا اضافہ

مراتب کا ہے شعر نمبر ۱۸ میں بھی ”بدھ“ کی آخری دو چشمی ہ مراتب کے اضافہ کی ہے یہاں بھی کاتب نے قوسین کو حذف کر دیا ہے ۔

فاضل مراتب کی انتہک محنت کی پوری داد دیتے ہوئے بعض جگہ ان کے متن سے معمولی اختلاف بھی ممکن ہے ۔ ہو ہذا :

۱۔ شعر نمبر ۵۷ میں ”بجلی“ نسخے میں بھلی ہے یہاں اردو شہارے کی فرینک میں درج شدہ لفظی صورت کو ترجیح دی گئی ہے ۔ نسخے میں اگر کاتب کی ترمیم نہیں ہے تو بھلی کو تشدید کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے اور علاقائی زبانوں میں یہ صورت آج بھی رائج ہے ۔

۲۔ شعر ۱۰۰ اور ۵۹۱ میں ”دنیا“ کا لفظ درج ہے قلمی نسخے میں ”دن“ لکھا ہے اگر چہوائی میں چھوٹا الف حذف نہیں ہوا تو آئے ”دن“ پڑھنے میں کوئی قیاحت نہیں ہونی چاہیے ۔ بدلی صورت دیباچے کے صفحہ ۳۸ کی مثال حذف ہو سکتی ہے ۔

۳۔ شعر ۲۰۲ کے پہلے مصرعے میں ”کہ“ کے بعد قوسین میں ”ہوئے“ کا اضافہ ہو سکتا ہے ۔

۴۔ شعر ۲۲۷ میں پہلے مصرعے میں ”ند“ کے بعد ایک اور ”ند“ پڑھا جائے ۔ قلمی نسخے میں بھی یہی صورت معلوم ہوتی ہے ۔

۵۔ شعر ۲۳۱ کے دوسرے مصرعے میں قوسین کے اندر ”اور“ کی بجائے ”ہور“ کو رکھنا شاید زیادہ موزوں ہوگا ۔

۶۔ شعر ۳۳۸ کا پہلا مصرعہ یوں پڑھا جا سکتا ہے :

بہت جیو گھا (وا) ہوا گھاؤ توں

۷۔ شعر ۳۵۷ کا پہلا مصرعہ یوں بھی پڑھا جا سکتا ہے :

دے کھڑے ایکس اک تن و تن

اس طرح کی واور عطف قدیم میں رائج تھی اور کاتب نے ”ر“ اور ”و“ کی املا میں قلمی نسخے میں جا بجا ایک سا انداز رکھا ہے ۔

۸۔ شعر ۳۳۵ کے دوسرے مصرعے میں ”کڑبہ“ کی بجائے ”کذب“ پڑھا جائے ۔

۹ - شعر ۴۷۱ میں دوسرا مصرعہ قیاساً یوں بھی پڑھا جا سکتا ہے :
کہ رنماں توں ربدی 'منجہ' (کون) سکھاؤ

۱۰ - شعر ۵۰۳ میں دوسرا مصرعہ یوں ہونا چاہیے :
کہ اس 'بدھ' تہیں کیوں چلنہار ہوئے

"جلن پار" کا لفظ شعر نمبر ۲۳۲ کی املا پر قیاس کر کے پڑھا گیا ہے -

۱۱ - شعر ۵۳۵ کا دوسرا مصرعہ یوں ہے :

پڑی آں پر 'منجہ' کروں تہہ حرام

۱۲ - شعر ۵۸۹ میں "کچ" کو میں "کچ" پڑھنا ہوں - اسی طرح شعر ۵۰۷ اور ۶۵۷ میں بھی ہے -

۱۳ - شعر ۲۲۲ کا دوسرا مصرعہ مرتب نے یوں پڑھا ہے :

اسنکت کے وہ من لکے بھی نہیں

اور شعر ۶۵۰ کا پہلا مصرعہ یوں درج کیا ہے :

کسیں باپڑانار ہوں میان کال

دونوں جگہ نہیں اور کسیں کی املا مسودے میں ایک سی ہے یا دونوں جگہ "نہیں" پڑھیے یا دونوں جگہ "کسیں" "نہیں" پڑھنا بھی ممکن ہے -

۱۴ - شعر ۶۹۸ یوں بھی پڑھا جا سکتا ہے :

کٹھا کھیل شطرنج بازی 'سو کھیل

ولے سینہ پکڑے گرا چھوڑ کھیل

۱۵ - شعر ۶۹۹ میں دوسرا مصرعہ اسی طریق کار کے مطابق جو دیگر

مقامات پر پیش نظر رکھا گیا ہے یوں ہوگا :

پکڑ بیڑی ذات سولی دھرے

۱۶۔ اشعار ۷۲۸، ۷۲۹ میں ”بجھکری“ اور ”بجھکری“ بظاہر ایک ہی لفظ ہے ممکن ہے پنجابی انداز میں ”بجھیں گھڑی“ (پانچویں وقت) لکھا ہو اور کاتب نے ادل بدل کر دی ہو۔ لفظ کو اس طرح پڑھنے سے دونوں شعر پورے ہو جاتے ہیں یہ اعتبار وزن بھی اور یہ اعتبار معنی بھی۔

۱۷۔ شعر ۷۳۹ میں ”ہوا“ نہیں بلکہ ”ہول“ پڑھا جائے ”ل“ کا املا واضح طور پر نسخے میں ہے۔ ان معنوں میں ہول (= ہو+ول) ”ہو کر“ کے معنوں میں شہار ہو گا۔

۱۸۔ شعر ۷۴۹ کو میں یوں پڑھتا ہوں :

اگر چور وہ جونی یا ہونے ساء
پکڑ پٹھ کو تس رہتر گھوڑے ہاء

قلبی نسخے میں ”جونی“ صاف درج ہے ”ہکر“ کو شعر ۷۴۰ کے قیاس پر ”پکڑ“ پڑھیں گے، ”ہاء“ بمعنی ”پٹھ کر“ ہے۔

۱۹۔ شعر ۸۵۴ کا پہلا مصرعہ یوں ہو سکتا ہے :

جو ہونٹ اس دکھاوے (کہوں) ہونٹ (توڑ)

جو ادبا متن کی مشکلات سے خائف ہوں ان کے لیے جالی صاحب نے دیباچے میں غور و فکر کا خاما سامان مہیا کر دیا ہے۔

دیوان حسن شوقی

(۱)

دسویں صدی ہجری کے اردو شاعر شوق کی دو مثنویاں ، تیس غزلیں اور ایک نظم اس مجموعے میں شامل ہے ڈاکٹر جمیل جالبی نے انجمن ترقی اردو کراچی بعض اہم بیاضوں سے شوق کا یہ کلام لے کر ترتیب دیا ہے ۔ متن کے علاوہ ایک مفصل مقدمہ اور آخر میں فرہنگ درج ہے ۔

(۲)

جمیل جالبی ایک نقاد کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں ۔ اس کتاب سے ان کے مزاج کا دوسرا رخ سامنے آتا ہے ۔ تحقیق و تصحیح کا یہ اہتمام جو انہوں نے کیا ہے اس کی توقع کسی نقاد سے نہیں کی جا سکتی تھی اس لیے کہ تحقیق اور تنقید اردو میں اس طرح الگ الگ خانوں میں بٹ چکے ہیں کہ نقادوں کے نزدیک تحقیق محض ایک میکانیکی عمل ہے اور محققین کے نزدیک کسی ادب پارے سے تنقیدی نکات کا استخراج دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے ۔ ایسے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا دیوان شوق ترتیب دینا اور اس میں تصحیح متن کے مشکل اور بظاہر غیر دلچسپ کام کو بخوبی انجام دینا یقیناً حیرت انگیز مسرت کا باعث ہے ۔ تصحیح میں جس محنت ، ژرف نگاہی ، احتیاط اور قدیم متون سے واقفیت کی ضرورت ہے جالبی صاحب نے اس کا لحاظ رکھا ہے ۔ دکنیات کے جو متن اب تک شائع ہوئے ہیں ان میں بیشتر کی تصحیح اور ترتیب کا کام ڈاکٹر معی الدین قادری زور ، نصیر الدین ہاشمی اور عبدالقادر سروری نے انجام دیا ہے ۔ موجودہ متن کا ان متون سے مقابلہ کرتے ہوئے بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ جالبی صاحب نے صحت متن میں دوسرے محققین کے مقابلے میں زیادہ محنت اور دقت نظر سے کام لیا ہے ۔ ان کے متن کے غیر حل شدہ حصے بہت کم ہیں ۔

کتاب کا دیباچہ اس نئی دریافت کی لسانی اور ادبی حیثیت کو متعین ہی نہیں کرتا بلکہ تاریخ ادب میں دکنی روایت کی کڑیاں بھی اردو شاعری کے بعد کے ادوار سے ملاتا ہے۔ نصرتی سے لے کر ولی تک شاعری کی جو روایت ہراون چڑھی ہے اس کے بارے میں نقادوں میں خاصی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ ولی کو عموماً اس حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے کہ وہ ایک صبح بیدار ہوئے اور انہوں نے طے کیا کہ آئندہ سے فارسی اثرات کو قبول کرتے ہوئے شعر کہا کریں گے۔ جالبی صاحب ولی کو دکنی روایت سے الگ کر کے دیکھنے کے قائل نہیں، انہوں نے نصرتی سے لے کر ولی تک کی دکنی شاعری میں جس طرح فارسی روایت کے انہماک کا عمل ہوتا رہا ہے اس کا سراغ لگا کر ادبی روایت کے تسلسل کی نشاندہی کی ہے۔ اسی اعتبار کے وہ حسن شوق کے کلام کو ایسا ”درمیانی ہل“ قرار دیتے ہیں جس کے بغیر روایت ٹک نہیں پہنچا جا سکتا۔ روایت کے اس تسلسل سے جالبی صاحب نے بعض دوسرے اہم نتیجے بھی نکالے ہیں مثلاً فرماتے ہیں :

(۱) ”جیسے دسویں صدی ہجری کی قدیم غزل پر محمود، فیروزہ اور خیالی کا سایہ پڑتا نظر آتا ہے، اسی طرح نصف سے زیادہ گیارہویں صدی ہجری تک حسن شوق کا اثر واضح طور پر نظر آتا ہے اور پھر یہ اپنا ونگ دوسرے ونگوں میں سلا کر خود ہماری نظروں سے اوجھل ہوتا ہے“

(۲) ”حسن شوق کی زبان اس زمانے کے دکن کی عام بول چال کی زبان ہے۔ اس میں ان تمام بولیوں اور زبانوں کے اثرات کی ایک کھچڑی سی پختی دکھائی دیتی ہے جو آئندہ زمانے میں ایک جان ہو کر اردو کی معیاری شکل متعین کرتے ہیں۔ زبان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان اپنے ارتقاء کی اس ترکیبی منزل میں ہے جہاں سے اردو حروف علت کا موجودہ نظام پروان چڑھنے لگا۔ اس کی سب سے واضح شکل صیغہ ماضی کے افعال میں ملتی ہے“

(۳)

جلیل جالبی تحقیق میں پروفیسر شیرانی کے طریق کار سے بہت متاثر

ہیں۔ لسانی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ دکن کی تاریخ بھی ان کے پیش نظر ہے اور دونوں کی روشنی میں نتائج ترتیب دیئے ہیں۔ شیرانی صاحب کا یہ اثر صرف یہیں تک نہیں بلکہ دلائل کی ترتیب میں بھی جاری و ساری ہے۔ فتح نامہ نظام شاہ کے قلمی نسخوں پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سے اختلاف کیا ہے اور نسخہ ثانی کے اشعار کو الحاق نہیں بلکہ اصلی مانا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے سات دلیلیں قائم کی ہیں۔ شیرانی صاحب کی طرح ان دلائل کی ترتیب میں انہوں نے قیاسی اور غیر یقینی دلیلوں کو پہلے اور حتمی دلائل کو آخر میں جبکہ دی ہے۔ قاری کو چونکا دینے والا یہ طریق کار شیرانی صاحب سے خاص ہے۔ جالبی صاحب نے بھی ناقابل تردید دلائل کو سب سے آخر میں جبکہ دے کر قاری کو تحیر اور استعجاب میں ڈالا اور اس طرح دلائل کو پیش کرنے کا وہ اسلوب اختیار کیا ہے جس میں محقق کے دلائل کو تسلیم کیے بغیر پڑھنے والے کے لیے کوئی چارہ کار باقی نہیں رہتا اور دلائل کے آخری سرے تک پہنچتے پہنچتے وہ محقق کا ہم نوا ہو جاتا ہے۔

(۴)

تحقیقی لحاظ سے دیباچے کے دو حصے سب سے زیادہ اہم ہیں، ایک وہ جہاں فتح نامے کے اشعار کو شیر العاقی قرار دیا گیا ہے، دوسرا وہ حصہ جہاں سیرجانی نامہ کے نواب مظفر خان کا تعین کیا گیا ہے۔ واقعاتی تحقیق کے علاوہ لسانی مسائل میں بھی جالبی صاحب نے اہم باتیں کی ہیں۔ لسانی مطالعہ کے زیر عنوان پیش کیے گئے ان نتائج سے کہیں کہیں اختلاف نو کیا جا سکتا ہے؛ لیکن مجموعی طور پر ان کے اہم اور نتیجہ خیز ہونے میں کلام نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے قدیم اردو کے لسانی مطالعے میں سندھی زبان کو پیش نظر رکھا ہے پنجابی کی اہمیت کو تسلیم نو کیا ہے لیکن اسے بہت دور تک لے جا کر نہیں دیکھا اس لیے ان کی بعض آراء سے جزوی اختلاف ممکن ہے۔ یہ درست ہے کہ پنجابی اور سندھی میں ساخت کے اعتبار سے بعض عناصر مشترک ہیں لیکن جالبی صاحب اسے صرف سندھی سے مخصوص خیال کرتے ہیں حالانکہ پنجابی بھی اس عنصر سے خالی نہیں۔

وہ فرماتے ہیں کہ "اردو اور سندھی میں حرف ربط تقریباً ایک ہے

ہیں فرق اتنا ہے کہ سندھی میں ”آہے“ بھٹ کھینچ کر اور دکھنی میں قدرے تخفیف سے بولا جاتا ہے۔ ”آہے کی یہ تحفیفی صورت ملتان اور ساہیوالہ کے علاقوں میں اب بھی پائی جاتی ہے اور اس کا رشتہ سندھی سے کہیں زیادہ پنجابی سے ملایا جا سکتا ہے۔ حروف جار کی بھٹ کرتے ہوئے سرائیکی ”کوں“ اور ”کی“ کی شکل ”منے“ بھی بیان ہوتی ہے۔ یہ شکلیں سرائیکی کے علاوہ پنجابی میں بھی مستعمل ہیں۔ منے کا لفظ ”کی طرف“ کے معنوں میں ابھی تک پنجابی میں زندہ ہے۔ سندھی اور اردو زبان کی مماثلت کے ثبوت میں انہوں نے میزابانی نامے کے ابتدائی سو اشعار میں سے سندھی کے مشترک الفاظ جدا کیے ہیں ان الفاظ میں اسی ہی صد پنجابی اور سندھی کے مشترک الفاظ ہیں انہیں صرف سندھی قرار دینا لسانی اعتبار کے بعض غلط نتائج کی طرف راہنمائی کر سکتا ہے۔ فہرست میں ذیل کے الفاظ پنجابی کے زندہ الفاظ ہیں اور انہیں کسی صورت میں صرف سندھی سے خاص نہیں قرار دیا جا سکتا :

شن ، ساڑیاں ، مڑے ، وٹے ، پھل ، سکاں ، رے ، سرہ ، لہے ، بھوئیں ، سالو ، پتہ ، رٹڑے ، سچلی ، کاجتے ، دوہڑے ، ڈھوئیاں ، سینا ۔ معانی میں بھی بعض جگہ جانی صاحب سے کسی قدر اختلاف ہے مڑے کا معنی کشیدہ کاری کرنا اور آراستہ کرنا درست نہیں منڈھنا صحیح ہے۔ وٹے کی اصل شکل وت کا مطلب پھر اور باز دہکر ہے۔ کاجتا ہاتھی کی آواز کے لیے مخصوص نہیں ، ممکن ہے ابتدا میں ایسا ہو ، اب گرجنا کے معنوں میں مستعمل ہے ۔

زیر تبصرہ کتاب کی نسری اہم خصوصیت اسلا سے متعلق مباحث ہیں : مثلاً حرف اضافت کی بجائے ے کا استعمال جیسے منارے عظیم (منار عظیم) شے شیر مرد (شہ شیر مرد) شے نامدار (شہ نامدار) وغیرہ کے عام استعمال اثر رکھتے ہوئے ان کا خیال بالکل صحیح ہے کہ یہ اسلوب اس دور میں عام ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ بارہویں صدی ہجری کے وسط تک ہمیں اردو کے جو قلمی نسخے ملتے ہیں ان میں حرف اضافت کے بجائے ”ے“ کا استعمال جاری ہے اور اس رجحان کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اردو کا بنیادی لسانی مزاج صوتی اعتبار سے ”ے“ اور حرف اضافت کو ایک ہی چیز سمجھنا ہے ۔ معلوم نہیں جالی صاحب اس سے اتفاق کریں گے یا نہیں کہ

اگر شمالی ہندوستان میں فارسی کی لسانی روایت زیادہ قوی نہ ہو گئی ہوتی تو حرف اخافت کی بجائے ”ے“ کا استعمال آج بھی عام ہوتا۔ انہوں نے اپنے متن میں دور حاضر کے املا کی بابت بھی کرتے ہوئے حرف اخافت کو بحال کر دیا ہے ایک آدھ جگہ، اگر ایسا نہیں ہو سکا تو یہ شاید کاتب کی زبردستی ہے۔ صفحہ ۵۰ پر شہ کی جگہ شے درج ہو گیا ہے۔ اسی طرح املا کے سلسلے میں جالبی صاحب نے س، ث، ه، ط، ظ اور ذ کی باہمی آوازوں کی مشابہت کا اثر املا پر بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے :

”میں نے ایسے الفاظ کا املا درست کیا ہے جو اس وقت بھی صحیح نہیں مانے جاتے ہوں گے جسے غوصر اعظم کو غوث اعظم کر دیا ہے۔ حجرت کو ہجرت اور نصل کو نسل۔“

مجھے ڈاکٹر صاحب کی اس بات سے اختلاف ہے کہ، یہ لفظ اس زمانے میں صحیح نہیں مانے جاتے ہوں گے۔ حرف اخافت کی بجائے ”ے“ کے استعمال کی مذکورہ حروف کی صوتی حیثیت ہی ان کے ادل بدل کا سبب بنتی ہے۔ اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ تیرھویں صدی تک کے قلمی نسخوں میں املا میں ایسی ہی صورت کار فرما ہے۔ اس لیے اس صورت حال کو ہم کیوں نہ صوتی تبدیلیوں کے ذیل میں شمار کرتے ہوئے تیرھویں صدی تک کا مسئلہ صوتی رجحان تسلیم کر لیں کیونکہ بعض صاحب علم کاتبوں کے ہاں بھی یہ عمل جاری دکھائی دیتا ہے۔ میرے نزدیک اسے ایک فطری لسانی عمل قرار دینا مناسب ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب نے جدید املا کے مطابق یہاں بھی اصل حروف کو بحال کیا ہے لیکن ایک آدھ لفظ ان کی نظر سے اب بھی رہ گیا ہے، مثلاً اس شعر میں :

ہمارا حسن ہے شوق معلم ذہن کوں تیرے
سبق کچھ انصری کا یا درس کچھ انوری کا ہے

یہاں ”انصری“ ”ع“ سے ہونا چاہیے تھا۔

(۵)

دیباچے کے بعد اصل متن آتا ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب نے بڑی

صحت آٹھائی ہے صرف دو تین مقامات پر اختلاف کی گنجائش ہے ، مثلاً -
ص ۹۳ :

بہر سطر میں لفظ زیبا فریب بہر لفظ معنی شکبیا شکب

اس شعر میں ”زیبا فریب“ غالباً کاتب کی کارفرمائی ہے ”زیبا و زیب“
ہو گا و کوف صحیح لیا گیا ہے - ص ۱۷۵ :

کیہیں الوان ہم کھاویں کیہیں ٹوکے ملیں روکھے
کیہیں بیا جی کیہیں ہالا کیہیں دن چار کے بھوکے
کیہیں ون بن ہمیں ہنڈی کیہیں ہستی منے سوتے
کیہیں دکھیا کیہیں سکھیا کیہیں ہسنے کیہیں روتے
کیہیں ہالے کیہیں بوڑھے کیہیں سیوک کیہیں ساسی
کیہیں گرو کیہیں چلے کیہیں پھٹے کیہیں غاسی

ان اشعار میں ٹوکے بھی کاتب کی کارفرمائی ہوگی لفظ ”ٹوکر“ ہونا
چاہیے یعنی ”روٹی“ ، ”ٹکر“ اسی طرح ”ساسی“ اور ”غاسی“ کی جگہ پنجابی
لسانی روایت کے مطابق ”سامے“ اور ”غاسے“ پڑھا جاتا چاہیے - اسی نظم
میں آگے چل کر ”دڑ پڑا“ درج ہے جو ”در پڑا“ ہے - فرہنگ میں لفظ کا
صحیح املا درج ہے لیکن معنی درست نہیں - در پڑا اس سالن کو کہتے
ہیں جس میں کھئی کم ہو اور منگوہ سا بن جائے یعنی یہ لفظ گاڑے مواد
کے لیے مستعمل ہے -

(۶)

کتاب کے آخر میں ایک طویل فرہنگ ہے - اس میں بہت سے ایسے لفظ
ہیں جو پنجابی اور دوسری مقامی زبانوں میں مشترک ہیں - فرہنگ بڑی صحت
سے تیار کی گئی ہے - چند مقام تصحیح طلب ہیں : مثلاً ”بلندر“ کے معنی
پہاڑ لکھا ہے پنجابی میں آج بھی پٹے کٹے ، دیہ قامت اور وحشی شخص
کے لیے استعمال ہوتا ہے - ”ٹھاڑے رہے“ کا مطلب ”جمے رہے“ درست
لیکن ”مسند رہے“ غلط ہے - ساؤ بمعنی شاہ درج ہے - ساؤ ”بہلے مانس“
کے لیے ہے - ”لرف“ کا مطلب بوریا بستر نہیں ”لحاف“ ہے - بعض لفظوں

کے معانی متعین نہیں کیے گئے مثلاً آراہ ، بارود خانہ - ہنڈے ، ایک سواری کا نام - بُرد ، شطرنج کی اصطلاح - بُران ، ہندوؤں کی مذہبی کتاب - تافے ، کیڑے کی ایک قسم - جیتل ، ایک سنگ - حاجب ، سفیر - سوسار ، ایک جانور - کابل ، نام مقام - ہشم ، ایک قیمتی پتھر - عام لغت کے انداز پر درج ہوتے ہیں - ان لفظوں کے معنی متعین ہیں - ضرورت تھی کہ فرہنگ میں بھی پوری وضاحت کی جاتی - لفظوں کی بعض املائی صورتیں بھی فرہنگ کا حصہ بن گئی ہیں جو میرے نزدیک درست نہیں - لاکے ، لاگے - لک ، لک - وغیرہ کو لغت کا حصہ نہیں ہونا چاہیے تھا - بعض لفظوں کے معانی بھی مزید غور کا تقاضا کرتے ہیں - اڑ کا معنی غرور دیا ہے ، ہٹے اور ضد کے معنوں میں اب بھی رائج ہے - انڈیاں کا مطلب ”الٹے“ دیا ہے حالانکہ چھوٹے انڈوں کو انڈیاں کہتے ہیں - بالن کا مطلب جلانا دیا ہے ، بالنا کا جلانا تو ہے لیکن بالن جلانے کی لکڑی کو کہتے ہیں - ہوسڑی کا معنی شور دیا ہے - ”ہو“ ہو کی ترکیب شور و غلغا کے لیے پنجابی میں اب بھی مستعمل ہے ، اس طرف اشارہ ضروری تھا -

فرہنگ میں بعض جگہ ماضی یا ماضی استمراری کے صیغوں میں لفظ درج ہیں لیکن معانی میں مصدری شکل اختیار کی گئی ہے - اگر اس کا لحاظ کر لیا جاتا تو اچھا تھا -

حالات حسن کے دو مآخذ

(۱)

اردو کے دوسرے قدیم شعراء کی طرح میر حسن کے مفصل حالات بھی نہیں ملتے۔ معاصر تحریروں میں حسن کے حال کے لیے قدیم ترین بیان گلزار ابراہیم کا ہے جو میر حسن کے اپنے بھیجے ہوئے حالات پر مبنی ہے۔ ان کے حلقہٴ احباب میں بھگوانداس بھی تھے جن کا سینہ ہندی ہانکی پور پتہ کی لاہری میں موجود ہے۔ یہ تذکرہ اگرچہ میر حسن کی وفات کے بعد لکھا گیا لیکن صاحب تذکرہ حسن سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے اور ان کے والد سے بھگوانداس کے دوستانہ روابط تھے۔ اس لیے حسن کے حال کے لیے یہ بھی اہم ہے۔ اسی طرح کمال کا مجمع الانتخاب ہے۔ قدرت اللہ شوقی کا طبقات الشعراء بھی میر حسن کے زمانے کا تذکرہ ہے لیکن حسن کے حال میں کوئی خاص بات پیش نہیں کرتا۔ تذکرہ مسرت افزا اگرچہ میر حسن کے حین حیات میں لکھا گیا لیکن اس میں ان کا ترجمہ تمام و کمال تذکرہ شعرائے اردو (میر حسن) سے ماخوذ ہے۔ مصحفی کا تذکرہ ہندی بھی اسی زمانے کی چیز ہے اور اس کے معلومات عام طور پر معلوم ہیں۔ مہتلا کا طبقاتِ سخن، قاسم کا مجموعہٴ نغمز اور احمد علی پکنا کا دستور الفصاحت بھی میر حسن کے قریبی زمانے کی چیزیں ہیں۔ ان سب کتب سے حسن کے حالات پر تسلی بخش روشنی نہیں پڑتی۔ اب لے ڈے کر میر حسن کی اپنی تحریریں ہیں جن پر زیادہ بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے تذکرہ شعرائے اردو میں جو کچھ درج ہے عام طور پر معلوم ہے۔ عہد حاضر کے مصنفین نے حسن کے حالات کے لیے بالعموم اسی پر انحصار کیا ہے۔ کلام حسن سے اس پر مزید کوئی اضافہ نہیں ہوتا؛ البتہ دیباچہٴ دیوان حسن ہماری معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔ دیباچہٴ دیوان حسن کا ذکر اب سے قبل دو ادیبوں نے کیا ہے۔ واقعات النور میں میر مہدی حسن احسن

لکھنوی نے (اصح المطابع لہوی ثلثہ لکھنؤ) میں اس کا ایک اقتباس درج کیا ۔ مرزا علی حسن نے غزلیات میں حسن (غیر مطبوعہ^۲) کے دیباچے میں اس سے کچھ کام لیا ہے ۔ لیکن دونوں ادیب اس بات کے مقرر ہیں کہ یہ دیباچہ^۳ کلیات حسن کا ہے ، حالانکہ یہ دیوان حسن کا دیباچہ ہے کلیات کا نہیں ۔ علاوہ ازیں اس کے نفس مضمون سے ان صاحبوں نے جو فائدہ اٹھایا ہے اس میں بہت کچھ تسامحات ہوئے ہیں ۔ دوسری تقریر جو حالات حسن پر روشنی ڈالتی ہے ۔ وہ میر شیر علی افسوس کا دیباچہ^۴ ”سحر البیان“ ہے ۔ یہ دیباچہ مثنوی کے ساتھ فورٹ ولیم کالج کی طرف سے ۱۸۰۵ء میں شائع ہوا ۔ ”سحر البیان“ کے بعض ایڈیشنوں میں میر حسن کا حال اسی مآخذ سے لیا گیا ہے^۵ ۔ علاوہ ازیں حسن کے حال کے لئے دلتاسی نے اپنی تاریخ ادب ہندی و ہندوستانی^۶ میں اس سے فائدہ اٹھایا ہے ۔ کریم الدین کے طبقات شعراء ہند میں میر حسن کا حال دلتاسی ہی سے لیا گیا ہے ۔ اس درمیانی واسطے کے سبب میر حسن کے حالات میں کریم الدین سے بعض غلطیاں بھی ہو گئی ہیں^۷ ۔ آپ حیات میں محمد حسین آزاد نے کریم الدین کی عبارت سے فائدہ اٹھا کر حسن کا حال لکھا ہے^۸ ۔

ان مآخذ کی اہمیت کے پیش نظر ذیل میں ہم انہیں دونوں کو پیش کرتے ہیں ۔

(۲)

پہلے دیباچہ^۹ دیوان حسن پیش کیا جاتا ہے ۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے ۔ یہ دیباچہ مکمل طور پر اب سے چلے شائع نہیں ہوا ۔ اس کا متن برٹش میوزیم کے نسخہ^{۱۰} کلیات حسن کے مائی کرو قلم پر مبنی ہے ۔ یہ نسخہ

۱ - ص ۲۰ تا ص ۲۴ -

۲ - طبع ۱۹۳۳ء ص ۳ تا ص ۱۰ -

۳ - اورینٹل کالج میگزین اگست ۱۹۲۶ء ص ۳ -

۴ - طبع ثانی جلد اول ص ۵۲۸ بعد -

۵ - ملاحظہ ہو طبقات شعراء ہند طبع اول ص ۲۱۳ -

۶ - آب حیات ص ۲۵۳ -

شعبان ۱۲۵۹ء میں کرلیل جارج ہملٹن کے لیے لکھا گیا اور غالباً الہیہ کی وساطت سے برٹش میوزیم میں پہنچا (تفصیل کے لیے دیکھیے فہرست مخطوطات مؤرخہ بریطانیہ - بلوم ہارٹ)۔ بعض حصوں کا مقابلہ واقعات الہیہ کے اقتباسات اور کلیات حسن رضا لائبریری رامپور کے اقتباسات سے بھی کیا گیا ہے۔ کلیات حسن (رضا لائبریری) کے اقتباسات ہم نے ریاض لائق (کلب علی خاں) سے حاصل کیے ہیں اور ان کی مزید تصدیق عابد رضا خاں صاحب کے ذریعے کتاب خانہ رامپور سے بھی کر لی گئی ہے۔ نسخہ رامپور کے مرقوق کی عبارت سے خاندانی نسخہ معلوم ہوتا ہے ”کلیات میر حسن گزرائیدہ لرزلد حسن فیبرہ میر الہیہ یکم جولائی ۱۲۹۰ء“ لیکن اس نسخے میں دیباچہ یک لخت ان الفاظ پر رہ جاتا ہے: ”تولع از صاحبان معنی دارم کہ ہر گاہ بد نسبی معانی“ (اس کے بعد چند ورق غائب ہیں)۔ مائی کرو قلم سے بعض حصے صاف نہیں پڑے جا سکے اور ان کا مقابلہ مذکورہ نسخہ سے بھی نہیں ہو سکا۔ اس لیے شروع کی عبارت گنجلک رہ گئی ہے۔

(۳)

(دیباچہ دیوان حسن)

بسم الله الرحمن الرحيم

(صفحہ ۲۳۲) سخن شہان گلشن مقال چون گل رخاں معانی را بر چار بالشی صفحہ دیوان زینت جلوس بشییدہ ، اول غرگاہ حمد سبحان الذی خلق الانسان و علمہ البیان ، نمایند و انجمن آرایان شہستان خیال ہر گاہ سخن بویان آیات را بر سبند ریاض مرابع لشین می کنند و تحت نشید (و بر تحت نشاد؟) صاحب و ما ینتطق عن الہوی ان هو الا وحی می سرایند ۔ اول خمس مثبت پنجہ قدرت کہ ید اللہ فوق ایدیہم بیان اوست دست او تبر (بسر؟ برتر؟) دارلد و کریمی لشینان مطلع تا بر (تائیر؟) سر (حتیز؟ میر؟)

۱ - پارہ ۲۷ سورہ الرحمن (مرتب)

۲ - پارہ ۳۰ (مرتب)

۳ - سورہ نجم (مرتب)

۴ - پارہ ۲۷ (مرتب)

عزل (عزل) مقام پاہند اول دوازده بند توصیف ایہہ 'اطہار علیہم الصلوۃ والسلام (صفحہ ۳۳۳) الملک الغفار در پردہ حسنی (حسن) بیان می آرند ۔ من ہیچمدان تھی دست کہ از حیرت رنگ بر رو ندارم ، چنان شبیدہ اطفال مقال خود را بر اوراق کاغذ لسم (کشم ؟) کہ صاحب نظران جہاں آتہا دیدہ دہن بدوود کشاید ، مگر سخن آفریں قبولے بخشد کہ منظور اولی الابصار گردد ۔ و حسنی عطا کند کہ دیدہ چشم برسان حسد کیش چون دیدہ تصویر بے نور شود کہ سا حون (کذا) حسن ما کم ؟ (وا کم ؟) کردہ حسن قبول ہگفتارم بر بے (بر بے ؟) یا (تا ؟) مقبول صاحبان اخلاق حسن شود ۔ آمین ، رب العالمین ۔ اما بعد بر سخنوران شاطر و دانشوران مابر [محقق نمائد] کہ اصل این موقوف این میر غلام حسین ابن میر عزیز اللہ ابن میر ہرات اللہ ابن میر امامی موسوی از شاہجہان آباد است کہ میر امامی موسوی در وقت شاہجہان آباد شاہ (سہو قلم : "در وقت شاہجہان بادشاہ" چاہے) از ہرات آمدہ منصب سہ ہزاری ذات بین الافران ممتاز گردیدند ۔ فاضل متبحر و فقیہ بہاں بودند و گاہ کہ بیست تفرج طبع فکر شعر ہم می نمودند کہ افکار معاد فرصت بے فائدہ گوئی نمی بخشند (بخشد) ، پس این عاجز پسخن را سر رشتہ شاعری اجدادی ست نہ اسروزی ، و قبلہ گاہی سلمہ اللہ تعالیٰ (با ؟) این ہمہ قدرت علم چون طبع سامعان را در سخن بلند لیاقت (لیاقتند) بقدر حوصلہ آں (ہا) بطرف ہزل توسل قلم راللد ، ہکم آں کہ ہر گاہ کہ زمانہ یا تو تسازد تو با زمانہ بساز ۔ چون این اجداد خوان دبستان سخن در سن صغیر (کذا) کہ ہنوز امام حبا منقضی نشدہ بود پتے گفتہ بود و آں ابن است :

یک سخن گویم ترا بشنوز من اے یار من
گر نخواستی رنج خود اے جاہ منہ آزار من

گفتہ ، بر صاحب سخنان ثابت گردیدہ کہ ابن طفل البتہ موزون است و ازین کلامے مقبول تر خواہد زد ، حاصل کہ السعید من سعید فی بطن آدم

۱ ۔ اس کا ترجمہ مرزا علی حسن صاحب نے یوں کیا ہے "تو میرے والد نے من کر کہا کہ بے شک یہ لڑکا موزون ہوگا" یہ ترجمہ کسی طرح صحیح نہیں ۔

والشقی من شقی فی بطن آدم^۱ ہر کرا حق سبحانہ تعالیٰ بہ ہر کارے میں
 آفرید ۔ از صغر من میلان طبیعت او بسوئے اکتاب [اکتساب] آن میں کند
 [کشد] و این امور کسی^۲ نیست بلکہ موہبی است ۔ لہذا عارفان ربانی
 زبان بطن کسی بھی کشایند کہ نظر اوشان بر فاعل حقیقی است و شکایت
 او تعالیٰ نمودن شرک عظیم عیاذ با اللہ (باللہ) غرض از گردش روزگار بہ
 اکنون [یہ لکھنؤ] رسیدم ، گفتم زبان فارسی کہ شیخ صاحب نور اللہ مرقد
 از زبان حضرت قبلہ گاہی ابد اللہ عاطفہ سنیہہ (شنیدہ) بحق این عاصی دعا
 فرمودہ اللہ^۳ (صفحہ ۳۳) [و شاید این نتیجہ^۴ دعائے : برٹش میوزیم کے
 نسخے میں سیاہی بھری ہوئی ہے] آن بزرگ عالی قدر باشد کہ توفیق سخن
 یافتہ و الا من کجا و این گفتگو ہا (کجا) [رباعی] اینست :

جانا(ں) ز تو امید نگاہے دارم

امید نگاہے ز تو گاہے دارم

ما گشتہ بہ چشم سرمہ سائیم ہایت ہستیم^۵

نئے لالہ و نئے فضاں نہ آہے دارم (کذا)

و شعرے نیز باین بود^۶ :

اے شمع میری سر گزشتہ خاموش کہ من ز سر گزشتہ

چون در قبض آہاد حزب اللہ تعالیٰ عن^۷ الافات رسیدم ، ہدایت میر

۱ - یہ حدیث اصل میں یوں ہے : السمید و من ہو سعیدہ فی بطن آدم

والشقی من شقی فی بطن آدم ۔

۲ - واقعات انیس میں ”مکتسی“ لکھا ہے ۔

۳ - ”فرمودہ“ ہونا چاہیے ۔

۴ - سائی کرو قلم میں ”ما گشتہ“ چشم سرمہ سائیم“ لکھا ہے جو درست

نہیں ۔

۵ - پیراہ این رباعی بود ؟ یا باین طور بود ؟

۶ - ”سائی کرو قلم اور بیاض فائق میں ”عن“ لکھا ہے لیکن واقعات

انیس میں ”عن“ موجود نہیں ۔

حبیب اللہ برادر زادہ [شاہ] سچن قدس اللہ سرہ کہ درویش معروف اند ،
و میر ابراہیم نور اللہ مشجعہ برادر ایشان نیز مشہور ، صحبت گزیدم ۔ زاد
ہائے طبع خود را می نمودم ، اگرچہ سید مسطور سوزون نداشت لیکن سلمہ اللہ
تعالیٰ در فہمیدن ممتاز سنجیدگاہند ۔ و بزرگان فہمیدن شعر را بہ از گفتن
جائز داشتہ اند کہ گفتہ اند :

شعر گفتن گر چہ در سفتن بود
بسکہ فہمیدن بہ از گفتن بود

روزے ہرمائشی آن شفیق ریختہ الشا کردم کہ در فصاحت زبان دانان
ہند نصیح آمد ، ازان باز چون زبان خود گفت " از فارسی گذشتہ آنجہ بدل
آمد گفتم ، لیکن اصلاح حروف و معنی (کذا) بخدست میر صاحب ، ضیائے
بزم سخیندانان بزم آتش زن کالون سوختہ دروٹان ، میر ضیاء الدین حسین
ادام الضالہ کہ [ضیاء] تخلص دارند ، گرفتہ ، لیکن طرز سخن ایشان گاہ
از من سر انجام نیافتہ ، بر قدم دیگر بزرگان ، مثال حضرت خواجہ میر درد
صاحب ، کہ درد مندی و بزرگی ہائے اوشان عالم گیر است ، از کلام درد
اوشان جگر عالمی فیض رسان درد و ذات با برکت اوشان میان درویشان
[چوں] فرید فرد ۔ دیگر صاحب وقت (کذا) رفیع منزلت میرزا محمد رفیع
[سودا] سلمہ اللہ تعالیٰ [کہ از رائے صاحب زیادہ فاضل الد] نظیر نظیری و
جان قنسی اشعار اوشان ست [میر] میر محمد تقی ، ہمیشہ زادہ شیخ سراج الدین
خان آرزو کہ سراج محفل شعراء بودہ و از صرصر زمانہ خاموش گردیدہ
نور اللہ مرقدہ کہ تخلص [میر] دارند [و] بابا فغانی را دو نالہ خود زیر
می خوانند و صیت فطرت اوشان طعنتہ در جہان افکنند [و] دیگرے بخیال
خود قائم نکردم کہ وضع آن را ہستم و دل یگفتار آن (ھا) بر بندم ۔
حق تعالیٰ ابی ہر سہ را چون موالید ثلاثہ تا جہاں ست قائم دارد ۔ و من
شعرہائے آبدار کہ بہ ہزار جانکنی جع نمودہ ام ، آتشے کہ بہ کلبہ فقیر

۱ ۔ مائی کرو غلم میں یہ لفظ نہیں ہے ۔

۲ ۔ یہ فقرہ آگہیا ہوا ہے مطلب نہیں کہلتا ۔ در زبان خود گفت ؟ او
گفت در زبان خود گو ؟

انتاد سراپا سوختہ مگر ہر زبان بھان کہ باقی بود ازان بار دیگر گرد
 آورده - پس آنجا آئند طبع زادہ معروف نموده^۱ توقع از صاحبان معنی دارم
 کہ ہر گاہ ہر لستے (کذا) معانی (صفحہ ۲۳۵) و الفاظ نگاہ کند از بلندنی
 حوصلہ خود قلم رو (ہر او؟) بکشند اگر توفیق باشد (در؟) اصلاح^۲ آن
 کوشند کہ در مذلت (مذلت؟) بزرگان دین سعی ہا نموده اللہ و سخن
 لکردہ و ما (لو) فیتی الا باللہ (علیہ) توکل واللہ (الیہ؟) مآب^۳ -

(۳)

دیباچہ^۴ سحرالبیان پہلی دفعہ سنہ ۱۸۰۳ء میں کلکتے سے شائع ہوا اور
 سحرالبیان کے شروع کے بعض ایڈیشنوں میں چھپتا رہا اور پینٹل کالج میگزین
 اگست سنہ ۱۹۲۶ء کے پرچے میں ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم
 نے ایک قلمی نسخے سے اس کا خاما حصہ شائع کر دیا (ص ۱ تا ص ۷)۔
 پھر سید احمد اللہ قادری صاحب نے ۲۷ رمضان سنہ ۱۳۵۲ء میں
 شمس الاسلام پریس حیدر آباد دکن سے مثنوی رموز العارفین کے ساتھ اسے
 شائع کیا - مولانا عبدالباری آلی مرحوم نے مثنویات میر حسن^۵ کے ساتھ
 بھی اسے طبع کیا - اتنی بار شائع ہونے کے بعد اسے پھر شائع کرنے کا
 کوئی موقع نہ تھا - لیکن برٹش میوزیم کے نسخے کے مافی کرو قلم کو
 بغور دیکھنے پر معلوم ہوا ہے یہ مطبوعہ مثنیٰ سے بعض جگہ مختلف ہے اور
 کچھ عجب نہیں جو مصنف کے اولین مسودے کی نقل ہو - اختلافات کو

۱ - اسی : زادہ طبع را معروف نموده -

۲ - مثنیٰ میں صلاح لکھا تھا -

۳ - مثنیٰ میں جو جملے یا الفاظ بڑی خطوط و حدانیوں میں ہیں وہ بیاض
 فائق ، واقعات انیس اور مرزا علی حسن کے مرتبہ دیوان کے اقتباسات
 سے لیے گئے ہیں - چھوٹی خطوط و حدانیوں کی عبارتیں قیاسی تصحیحات
 ہیں عربی عبارتوں کے اعراب قرآن پاک کی مدد سے لگائے گئے ہیں -
 جمل عربی کی تصحیح کے لیے مرلب جناب عبداللہ صدیقی کا
 ممنون ہے -

۴ - لولکشور پریس طبع سنہ ۱۹۳۳ء ص ۱۳ تا ص ۲۰ -

آسی کے انڈیشن سے فٹ نوٹوں میں پیش کیا جا رہا ہے ۔ دیباچہ نگار شبر علی افسوس میر علی مظفر داروغہؒ، توپ خاںہؒ، میر قاسم (ناظم ہنگال) کے لڑکے تھے۔ ۱۱۵۲ھ کے لک بھگ پیدا ہوئے عمدة الملک امیر خان انجام کی شہادت کے تین چار سال بعد جب ان کے والد تلاش معاش میں نکلے تو افسوس کی عمر گیارہ برس کی تھی۔ افسوس دلی میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد انجام کی سرکار میں تھے۔ میر مظفر کو ”نواب خان عالم بقا اللہ خان مرحوم نے لکھنؤ میں بلوایا اور سرکار وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ مرحوم کے مشاہیر میں تین سو روپے کے واسطے ان کے دربارہم ٹھہرایا“۔ شجاع الدولہ کا قیام لکھنؤ سنہ ۱۱۶۷ھ سے ۱۱۷۸ھ تک رہا اس کے بعد انھوں نے فیض آباد کو دارالحکومت کر لیا تھا۔ ”بعد کئی برس کے حسب الامر نواب صادق علی خان کے بڑے بیٹے نواب میر محمد جعفر خان صوبہ دار ہنگالہ کے تھے سید مظفر علی خان (پدر افسوس) وارد مرشد آباد ہوئے اور داروغہؒ، توپ خاںہ وغیرہ کے ساتھ مورد عنایت و امداد ہوئے۔۔۔ غرض جب وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ چادر مع صوبیدار ہنگالہ صاحبان عالی شان سے معرکہ آرا ہوئے تو سید مظفر علی خان بھی ہمراہ رکاب کے تھے۔ بعد میر محمد جعفر خان کی وفات کے روزگار نواب سیف الدولہ کا انھوں نے نہیں کیا بلکہ لکھنؤ چلے آئے اور بعد کئی برس کے حیدر آباد کی طرف گئے۔“ میر جعفر ۲۸ جون سنہ ۱۷۵۷ء کو سراج الدولہ کی جگہ نواب ہنگال ہوئے (شوال سنہ ۱۱۷۰ھ) ان کی نوابی کا زمانہ ۱۰ ربیع الاول سنہ ۱۱۷۳ھ تک ہے۔ گویا مظفر علی خان ۱۰ ربیع الاول سنہ مذکور سے قبل لیکن ۱۱۶۷ھ کے بعد لکھنؤ پہنچ چکے تھے اور چند سال وہاں رہ کر ۱۰ ربیع الاول ۱۱۷۳ھ سے قبل ہی مرشد آباد پہنچ چکے تھے۔ ۱۰ ربیع الاول سنہ مذکور میں میر قاسم ناظم ہنگال ہوئے تو یہ ان کے ساتھ

۱۔ تذکرۂ شعرائے اردو، ص ۲۱۔

۲۔ ارباب نثر اردو، سید محمد قادری، انجام ۲۳ ذالحجہ سنہ ۱۱۵۹ھ کو شہید ہوئے۔

۳۔ گلشن ہند، ص ۵۷۔

۴۔ گلشن ہند، ص ۵۷۔

تھے۔ بکسر کی لڑائی میں (۲۳ اکتوبر سنہ ۱۷۶۸ء = ۲۶ ربیع الثانی سنہ ۱۱۷۸ھ) یہ میر قاسم کی طرف سے شریک تھے۔ میر جعفر کو انگریزوں نے اپنی طرف سے ۷ جولائی سنہ ۱۷۶۸ء کو جنگال کا نالہم بنا دیا۔ لڑائی کے ساڑھے تین ماہ بعد ۱۳ شعبان روز سہ شنبہ سنہ ۱۱۷۸ھ کو میر جعفر فوت ہو گئے (۵ فروری) نجم الدولہ غالباً ذالحجہ سنہ ۱۱۷۹ھ میں اور سیف الدولہ اواخر سنہ ۱۱۸۳ھ میں فوت ہوئے۔ بکسر کی لڑائی کے بعد اودھ پر انگریزی قبضہ ہوا۔ ۱۶ اگست سنہ ۱۷۶۵ء الہ آباد میں شجاع الدولہ سے انگریزوں کا معاہدہ ہوا تو یہ علاقہ انہیں واپس ملا۔ شجاع الدولہ (سنہ ۱۷۷۹ء) اسی سال لکھنؤ آیا اور پھر فیض آباد کو دارالحکومت قرار دے دیا۔ بظاہر افسوس کے والد کو بھی سنہ ۱۷۷۹ء میں لکھنؤ آنا چاہیے اور شجاع الدولہ کے ساتھ ہی وہاں سے فیض آباد گئے ہوں گے۔ افسوس نے سنہ ۱۱۸۹ھ میں سالار جنگ برادر نسبتی شجاع الدولہ کی سرکار میں ملازمت کی اور دس سال تک اس کے بیٹے میر نوازش علی سردار جنگ کے زمرہٴ مصاحبین میں رہے (ملاحظہ ہو دیباچہ سحرالبیان) میر حسن سے دس سال تک ان کا ساتھ رہا۔ سنہ ۱۱۸۹ھ یا سنہ ۱۱۹۰ھ میں جب آصف الدولہ نے فیض آباد کی جگہ لکھنؤ کو دارالحکومت بنایا تو سالار جنگ بھی ان کے ساتھ لکھنؤ میں آئے تھے۔ میر حسن اور افسوس دونوں ان کے متوسلین میں تھے۔ ظاہر ہے یہ بھی لکھنؤ آ گئے ہوں گے، لیکن افسوس کی گذر اوقات لکھنؤ میں مشکل سے ہوتی تھی۔ سنہ ۱۱۹۳ھ میں صاحب مسرت انزا لکھتے ہیں :

”افسوس کہ از چندے فلک پلنگ فطرت برویاء بازی او را
در شاخ گوزن افلاک آویختہ و بتاخن کینہ جوئی رشتہٴ اقتدارش
گسیختہ اکنون در بلدۃ لکھنؤ بسر می برد“۔

۵ جمادی الآخر سنہ ۱۱۹۸ھ میں جہاندار شاہ لکھنؤ پہنچے۔ سنہ ۱۱۹۹ھ میں افسوس ان کی سرکار میں ملازم ہو گئے اور بتارس چلے گئے (ملاحظہ ہو دیباچہ سحرالبیان) ”چین ایام میں نیز اوج شہر یاری (جہاندار

شاہ) کا عہدہ مغرب کی سمت اڑلا اور کوچ شاہجہان آباد کو ہوا تو میر
مذکور (افسوس) بہ سبب بعضے عوارض کے رہ گئے اور ساتھ نہ جا سکے۔^۱
جہاندار شاہ سنہ ۱۲۰۱ھ میں دلی گئے تھے۔ ۲۲ ربیع الثانی سنہ ۱۲۰۱ھ
میں اکبر آباد میں تھے۔ ۱۵ رجب کو نرخ آباد کے راجے سے لکھنؤ
آئے^۲ اور پھر بنارس پہنچے ہوں گے جہاں الہوں نے ۲۵ شعبان ۱۲۰۲ھ
میں وفات پائی (قاہوس المشاہیر ترجمہ جہاندار شاہ)۔ سر جادو لالہ سرکار
کا بیان ہے کہ ۲۱ مئی سنہ ۱۷۸۸ء (۲۳ شعبان سنہ ۱۲۰۲ھ) کو
وفات پائی۔ افسوس سنہ ۱۲۰۱ھ کے اوائل میں (لیکن وفات شیر حسن کے
بعد) لکھنؤ آئے ہوں گے۔ بعد میں مرزا فخرالدین احمد خان کی سفارش پر
طورث ولیم کالج میں نوکر ہوئے۔^۳ کلکتہ جاتے ہوئے مرشد آباد میں
افسوس مرزا علی لطف (صاحب گلشن ہند) سے بھی ملے تھے۔ افسوس نے
کلکتے میں سنہ ۱۲۲۳ھ میں وفات پائی مندرجہ ذیل دیباچہ، سحرالبیان سے
میر حسن اور افسوس دونوں کے حالات اور تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔

(۵)

(دیباچہ "سحرالبیان")

(شیر علی افسوس)

حد کی لیاقت اسی صالح کو ہے جس نے عناصر اربعہ کو کہ آپس میں
ایک دوسرے کی خد میں اپنی قدرت کاملہ سے ربط دے کر ارکان ٹھہرایا
اور کیفیت متوسط پر مرکبات کے اجسام کو بنایا، لیکن انسان کو ہر
خلوق سے شریف تر اور لطیف تر خلق کیا کہ نفس لاطفہ نے علاقہ اسی

۱۔ گلشن ہند، ص ۵۷۔

۲۔ تاریخ اودہ، نجم الغنی، جلد سوم، ص ۲۶۶۔

۳۔ Later Mughals، جلد چہارم، ص ۲۲۵۔

۴۔ دستور الفصاحت۔ احمد علی پکنا، ص ۱۰۲، ۱۰۳ نیز آرائش بھٹل،

افسوس۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو، طبع اول، ص ۵۔

۵۔ اسی کے ایڈیشن میں "اربعة"۔

ہے پکڑا اور وہی کلیات و جزئیات کی حقیقت ہے ماہر ہوا - یہاں تک کہ تعلیم و تعلیم کا سلیقہ آئے بغوی آ گیا اور اس کی زبان میں بھی استعداد پر لغت کے لفظ کی بخشی - چنانچہ اس نے جس بولی کو چاہا سیکھ لیا بلکہ سکھا دیا - پس لازم ہے کہ اس شکر میں ہر دم اپنی زبان گویا رکھے اور اس کی حمد کو ہر حال میں اپنا ورد کرے - مثنوی :

نہ بھول اپنے خالق کو اے دل نہ بھول
کہ یاد اس کی ہے دونوں جگ کا حصول

اسی کو مددگار اپنا سمجھ
اسی کو قسط یار اپنا سمجھ

برے وقت میں کوئی اس کے سوا
نرے کام آوے یہ اسکا کیا

محبت ہے سب کے اٹھا اپنا دل
لفظ اس سے ہی بس لگا اپنا دل

زبان تیری گویا رہے جب تلک
اور اسکا سخن کا رہے جب تلک

کیا کر نئے جہاں آفریں
سخن کوئی بس اس سے بہتر نہیں

جو بعد اس کے منظور ہو کوئی بات
تو کہہ نعمت احمدؒ شد کائنات

فی الواقع ستودہ خدا سب انبیاء و اولیاء ہیں ، تعریف ان کی موافق مقدور ہر ایک کو ضرور ہے ، خصوصاً امت و سنت خاتم المرسلین اور اس کے وصی امیر المومنین علیہا السلام کی کیونکہ انہوں نے دنیا میں ہم کو راہ ہدایت کی بتلائی کہ ہم نے منزل ایمان کی سہولت پائی ، عاقبت

میں بھی آئند شفاعت کی اور لمبائے جنت کی الہی ہے رکھتے ہیں۔ مثنوی ۱ :-

بہر وہ کسی کا نہیں اک ذرا
ہے آن کا ہی ہم کو نقط آسرا
نہی "و علی" اپنے ہیں ہیشوا
نہی "و علی" اپنے ہیں رونما
انہیں ہے ہے کسولیں میں مجھ کو کام
وے سولا ہیں سبرے میں آن کا غلام
دروہ آن ہر اور آن کی اولاد ہر
بدل پہنچنا ہوں میں شام و سحر

بعد اس حمد و نعت کے مثنوی شعر الیہان اسم یا معمول ہے کیونکہ اس کا ہر شعر اہل مذاق کے دلوں کے لپھانے کو موہنی منتر ہے اور داستان اس کی شعر ساری کا دفتر، جو چیز کہ حقیقت میں خوب ہوتی ہے وہی طباع کو مقبول و مرغوب ہوتی ہے، راست ہے کہ اس کا انداز سراپا اعجاز ہے، اور وہ ہر ایک صاحب طبیعت کے دم ساز، تعریف اس کی جہاں تک کہجے بجا ہے کیونکہ فصاحت و بلاغت کا اس میں ایک دریا بہا ہے^۲ صلے کا اس کے مابرا یہ ہے کہ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر

۱ - یہ لفظ آس کے ہاں نہیں ہے -

۲ - آس : "اور" کے بعد "ہر" -

۳ - آس کے ہاں یہ فقرے بھی ہیں : احياناً اگر کسی شعر میں غلطی یا اس کی ہندش میں سستی پائی جائے تو قابل نام دھرنے کے اور اعتراض کرنے کے نہیں۔ اس لیے کہ جہاں ہنر کی کثرت ہوتی ہے وہاں عیب بہ قلت شمار میں نہیں آتا اور تعرض آس کا منصف مزاجوں کو نہیں بھاتا - بقول شخصے :

شعر گر اعجاز باشد ہم بلند و پست نیست

۴ - آس : "بہادر" نہیں لکھا -

مرحوم نے ایک دو سالہ خاص اپنے اوڑھنے کا دست بچھا میں سے لٹکوا کر مصنفؒ عنایت کیا۔ وہ تو اس کا البتہ پڑھا پہ دل گھٹ گیا۔ اس لیے کہ مطلب دلی حاصل نہ ہوا؛ لیکن یہ کھوٹ صرف طالع کی ہے کیونکہ مال کھرا، خریدار اتنا بڑا، اور سودا خاطر خواہ نہ ہوا، بلکہ گھاتا آیا۔ مصنف سحرالبیانؒ پر حسنؒ خلف میر غلام حسین صاحب؟ (ضاحک)۔

| وطنِ اجداد شہر ہرات قوم سادات اور دادا اس عالی قدر کا فاضل متبحر اور فقیہ ہے مثال تھا اور باپ کو فصیلت تھی لیکن فارسی کی استعداد خوب ہے بلکہ شعر بھی رنگین گائے گائے اس زبان میں کہتا تھا چنانچہ رباعی طبع زاد اس کی راقم نے اس کی زبانی سنی ہے۔ رباعی: | :

فریاد دلا کہ غم گساراں رفتند
سیمیں بدلتاں و گھمزاراں راستند

۱۔ دست بچھے۔

۲۔ کو۔

۳۔ اسی: ”یہ چند سطر میں مصنف کے حسب و نسب اور احوال میں ہیں۔“

۴۔ ”اس کا“ ”سحرالبیان“ کی جگہ۔

۵۔ اضافہ: ”دہلوی متخلص بہ حسن۔“

۶۔ اضافہ ”ضاحک کا“۔

۷۔ اس پر سے کی جگہ اسی نے مندرجہ ذیل عبارت دی ہے: ”وطن اجداد شہر ہرات قوم سادات، گردش فلسفی سے انہوں نے شہر مذکور کو چھوڑا اور دلی میں آکر پرانے شہر کا رہنا اختیار کیا۔ وہیں یہ بزرگ پیدا ہوا بلکہ سن کمیز کو پہنچا۔ دادا اس عالی قدر کا سننے میں کہ حاجی و فاضل تھا؛ لیکن باپ کو فصیلت نہ تھی مگر طالب علمی میں شرح ملا تک پڑھا تھا، ہر فارسی میں استعداد اچھی تھی؛ بلکہ شعر بھی سنیں و رنگین گائے گائے اس زبان میں کہتا تھا چنانچہ یہ رباعی طبع زاد اس کی راقم نے اس کی زبانی سنی ہے:“

چو ہوئے گل آمدند بر باد سوار
در خاک چو قطره ہائے باران رفتند

قصیدہ بھی ایک اور اسی مغفور کا تہ دار^۱ دیکھا ہے۔ لیکن ہزل
پر از ہسکہ مزاج مرعوب تھا۔ ہزل کہنی ترکہ کی تھی، قیامت ہنسوا اور
ٹھٹھول تھا، تخلص اس کا اس پر دال ہے۔ ہر ظاہر نہایت قند اور متشرع،
اکثر عہدہ سبز سر پر باندھتا تھا اور جامہ کم گہر اہل بی کا گلے میں،
ڈاڑھی متوسط لیں لی ہوئی^۲، قد میانہ گندم گون لیکن میر حسن ڈاڑھی
منڈوائے تھے پر جامہ نیمہ ان کا بھی ویسا ہی تھا اور پکڑی کی بندش قدیم
ہندوستان زادوں کی سی۔ قد لمبا تھا اور رنگ گندمی، ہر چند وضع تو
ایسی تھی پر شوخ مزاج و لطیفہ گو^۳ بھی تھے۔

سوائے اس کے بردباری اور مناساری آن کی خلقت میں تھی، کسی
کو میں نے اس عزیز سے شاک نہیں دیکھا^۴ طبع اس کی موزوں طفولیت سے
تھی۔ شعر کی طرف رغبت رکھتا تھا، خواجہ میر درد کی صحبت سے مستفید
شاہجہان آباد میں اکثر لڑکانے کے بیچ ہوا ہے اور بعد پرہم ہوئے سلطنت
کے شہر مذکور سے مجبور اپنے والد کے ساتھ صوبہ^۵ اودھ میں آیا، سکونت
فیض آباد کی اختیار کی، علاقہ روزگار کا نواب سالار جنگ بہادر مرحوم کی
سرکار میں ہم پہنچایا۔ مرزا صاحب^۶ مرزا نوازش علی خان بہادر سردار جنگ
دام ثروت کا ہوا، مرزائے موصوف بڑا بیٹا نواب مغفور کا ہے، خدا آجے

- ۱۔ اور کی جگہ ”آدھ“۔
- ۲۔ ”تہ دار“ کی جگہ ”رتبہ وار“۔
- ۳۔ ”لی ہوئی“ کی جگہ ”لی ہوئی“۔
- ۴۔ اضافہ ”وئے“۔
- ۵۔ اضافہ : ”زہ ہزال و فحاش“۔
- ۶۔ ”دیکھا“ کی جگہ ”ہایا“ اور بیزار نہیں دیکھا“۔
- ۷۔ ”اکثر“ نہیں ہے۔
- ۸۔ مرزا صاحب کی جگہ ”صاحب“ (برٹش میوزیم کے نسخے میں ہنکن
ہے کاتب کی غلطی ہو)۔

سلاست^۱ کہ اشعار فارسی^۲ سے آئے رغبت اور شعر کی آئے^۳ محبت ہے ، چنانچہ میر مذکور کو بھی اس نے اپنا جلس و انیس^۴ کیا تھا اور وہ تھا بھی اسی لائق ، اگرچہ علم سہیا^۵ نہ تھا بلکہ^۶ فارسیت بھی بلکہ جستہ جستہ شعر یا کوئی رباعی^۷ کہہ^۸ لیتا تھا ؛ لیکن علم مجلس میں بے بدل اور شعر ہندی میں اکمل تھا ۔ مشق سخن اس نے اسی ملک میر ضیاء الدین ضیا تخلص سے ، کہ ہم مشق مرزا سودا اور میر تقی میر کے تھے ، کی تھی | لیکن میدان سخن میں ان صاحبوں سے توسن طبع کو بڑھا لے گیا^۹ | غرض میر مرحوم صاحب دیوان ہے ۔ غزل ، رباعی ، مثنوی ، مرثیہ میں سلیقہ نہایت خوب رکھتا ہے ، بلکہ سوائے قصیدے کے ہر قسم کی نظم پر قادر تھا ، سچ تو یہ کہ ادا ہندی کا حق اُن نے خوب ادا کیا اور انداز شعر کا کس خوبی سے کہا | کہ بیان اس کا کیا نہیں جاتا^{۱۰} | خدائیش بیامرزا | حلیہ ہائے بہشت عطا کنند^{۱۱} | راقم کو اس سے دوستی دلی تھی کبھی^{۱۲} خلگی و رنجش^{۱۳} باہم نہیں ہوئی ، حالانکہ اسی سرکار میں میں بھی لوکر اور

۱ - اضافہ : رکھے ۔

۲ - "فارسی" نہیں ہے ۔

۳ - "شعر کے آئے" کی جگہ "شعرا سے" ۔

۴ - "انیس و جلس" ۔

۵ - "سہیا" کی جگہ یہ عبارت ہے "عربی آئے مطلق" ۔

۶ - "بلکہ" کی جگہ "ہاں" ۔

۷ - اضافہ : "کہو" ۔

۸ - اضافہ : بھی ۔

۹ - اس فقرے کی جگہ مندرجہ ذیل عبارت : "سوائے ان کے مرزا سے

مرحوم سے بھی ان کی غیبت میں اکثر اوقات اصلاح لی تھی ، چنانچہ

اس کا المرار راقم کے سامنے کیا ہے" ۔

۱۰ - اس فقرے کی جگہ صرف "رکھا" ۔

۱۱ - یہ فقرہ بھی نہیں ہے ۔

۱۲ - "کہو"

۱۳ - "رنجش خلگی"

اسی صاحب زادے کا ہم لشین تھا ، دس برس تک دن رات ایک جگہ رہے بلکہ اکثر آپس میں غزلیں طرچ ہوئیں اور صحبتیں شعر کی رہیں ، لیکن نہ بطور استفادہ کے جتنا " کہ " علی ابراہیم خان مرحوم " نے بے تحقیق اپنے تذکرے میں لکھا ہے ، صاف اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میں نے مشورہ سخن کا اس مرحوم سے بھی کیا ہے ، اگر یہ بات حقیقت میں ہوتی تو کچھ عیب نہ تھا ۔ ہر گاہ حلیہ میر حیدر علی حیران کی شاگردی کا مقر ہے ، باوجود اس کے کہ شاعری ان کی میر حسن سے زیادہ نہ تھی ۔ پھر کس لیے اس بات سے انکار کرتا ۔ قاعدہ یہی ہے کہ ایک سے سیکھتے ہیں اور دوسرے کو سکھاتے ہیں ، لیکن جھوٹی بات پر اقرار نہیں کیا جاتا اور سچی سے انکار نہیں کیا جاتا ہے " |

آخر چرخ تفرقہ پرداز نے باہم تفرقہ ڈالا ۔ اتفاقاً میرا روزگار سنہ گیارہ سے ننانوے میں صاحب عالم مرزا جوان بخت کی سرکار میں ہوا ، میں ان کے ہمراہ بنارس میں آیا ۔ بعد اس کے اس بزرگ کو آخر ذالحدید | سنہ بارہ سے میں مرض الموت لاحق ہوا بدان (کذا) ماہ محرم کہ سنہ بارہ سے ایک شروع ہو چکے تھے کہ بتاریخ ہالہویں ماہ محرم کے اس دار فانی سے اس سرانے جاودانی کو کوچ کیا " | اور شہر لکھنؤ میں مفتی گنج بیچ مرزا قاسم علی خان بہادر دام ظلہ کے باغ کے پیچھے مدفون ہوا ۔ خدائے کریم اس کو یہاں دارالسلام عطا کرے اور وہاں قصر جنت بخشے :

عدم سے مسافر جو آیا یہاں
مقر وہ ایک روز جاوے گا وہاں

۱ - اضافہ : ہم

۲ - "جیسا"

۳ - اضافہ : "نواب"

۴ - "مرحوم" کی جگہ "مفتور"

۵ - "ہو سکتا"

۶ - اس فقرے کی جگہ : "سنہ بارہ سے ہجری میں مرض الموت لاحق ہوا ، بدان لغز محرم کو کہ سنہ بارہ سے ایک شروع ہو چکے تھے اس دار فانی سے اس سرانے جاودانی کو کوچ کیا"

رہے جگ میں ہر چند وہ ہر کہیں
ہر آس کا ٹھکانا ہے زیر زمیں

نہ غفلت میں اپنی تو اوقات کھو
اوسے بے خبر جاگتے ہیں نہ سو

جہاں میں تو سہان ہے چند روز
ترے جسم میں جاں ہے چند روز

یہ مہلت غنیمت ہے کر لے وہ کام
کہ جس سے رہے تا ابد نیک نام

فی الواقع نیک نامی ایسی عجیب چیز ہے ، انسان کا نام اس سے زندہ رہتا ہے ، یا کلام و اولاد سے ، سو وہ خوش نصیب ہی (کذا) | دونوں اس سمت (کذا) | چھوڑ گیا ، چار بیٹے فضل الہی سے اس کے اب تک موجود ہیں ، تین شاعر ہوئے ، کہ بود و باش الہوں نے فیض آباد میں اختیار کی ۔ معاش لوکری پر ہے ، چنانچہ میر مستحسن خلیق قضاں اور میر حسن حسن قضاں ، مرزا تقی بیو بیگم صاحب مادر آصف الدولہ مدظلہا کے داماد کے رفیق ہیں اور میر احسن "خلق قضاں داراب علی خان ناظر کے ساتھ ہیں" ۔ یہ اور خلیق دولوں صاحب دیوان ہیں ، شعر اپنے باپ ہی کے انداز پر کہتے ہیں ، لیکن خلیق کا سرشتہ اصلاح کا مصحفی سلمہ اللہ سے تعلق رکھتا ہے ۔ خدا انہیں سلامت رکھے یہ چند قترے بطور دیباچہ زندہ دوستانہ عالی

۱ - "اے" (اور یہی صحیح ہے)

۲ - "دولوں آس سمیت" (جی دوست ہے)

۳ - "میر حسن خلیق" (یہ درست نہیں ۔ صحیح وہی ہے جو اوپر مذکور ہے)

۴ - "ہیں" کی جگہ "ہے"

۵ - اضافہ : "آئے اور"

۶ - "ہے"

۷ - "دوستانہ" کی جگہ "دولوں"

شان^۱ شیر خاص شاہ کیوان ہارکامہ الکستان مارکونس ولزلی لاڈ^۲ گورنر
 بہادر دام اتبالہ کے عہد میں^۳ ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء کے ہیں، حسب الارشاد
 صاحب والا مناقب جان گلکرسٹ صاحب^۴ بہادر مدرس ہندی دام دولہ کے
 اس عاصی نے لکھے اور ان کو اس مثنوی کا ضخیمہ (کذا)^۵، کیا، | واللہ
 الی التوفیق^۶، | تمام شدہ۔

۱ - اضافہ ”منظہر“

۲ - ”لاڈ“

۳ - اضافہ : ”کرہ“

۴ - ”صاحب“ تدارد

۵ - ضخیمہ (اور یہی صحیح ہے)۔ نسخہ برٹش میوزیم میں کاتب کی غلطی
 معلوم ہوتی ہے۔

۶ - آسی کے ہاں یہ عبارت نہیں ہے۔

۷ - تمام شدہ کے بعد آسی کے ہاں : ”دیباچہ“ میر شیر علی انیسوس“

سحرالبیان کا ایک نادر قلمی نسخہ

(۱)

میر حسن کی مثنوی سحرالبیان کے لاتعداد قلمی نسخے دنیا کی معلومہ لائبریریوں میں بکھرے پڑے ہیں^۱۔ ذائق کتاب خالوں میں بھی اس کے بے شمار نسخے پائے جاتے ہیں۔ سند^۲ تکمیل (۱۱۹۹ھ) سے لے کر اب تک اس کی مقبولیت میں برابر اضافہ ہوتا رہا ہے۔ کئی کتاب خالوں میں مثنوی کے مصور نسخے بھی ملتے ہیں^۳۔ بعض کاتبوں نے اعراب لگا کر بھی نسخے ترتیب دیے^۴۔ اس کی نوٹ بھی آئی کہ ماری مثنوی کا خمسہ کیا گیا^۵۔ مثنوی کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ڈرامے کی شکل میں بھی اسے ڈھالا گیا^۶۔ مثنوی کی شہرت نے اسے افسانوں اور طلسمی قوتوں کا

۱۔ تہران (۵۳) قلمی نسخوں کی تفصیل کے لیے دیکھیے مقدمہ مثنویات میر حسن جلد اول مرتبہ راقم الحروف، ناشر مجلس ترقی ادب لاہور۔

۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے راقم الحروف کی کتاب میر حسن اور ان کا زمانہ متعلقہ صفحات۔ تین نسخے حیدرآباد کے عجائب گھر میں ہیں جن میں دوستان دکن کی تصاویر ہیں (نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۵۵ء، صفحہ ۴۲) کتاب خانہ سالار جنگ میں کئی مصور نسخے ہیں (مہرست کتاب خانہ مرتبہ نصیرالدین ہاشمی)۔

۳۔ کم از کم دو نسخوں کا علم ہے: ایک علی گڑھ اور دوسرا پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں۔

۴۔ خمسہ باطنی نومبر ۱۸۹۲ء۔

۵۔ اس قصے کو سات مصنفین نے اردو ڈرامے کے طور پر لکھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ”ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں“ (ڈاکٹر گوپی چند نارنگ) صفحہ ۳۵۲۔

حاصل بھی بنا دیا ، اور عوام میں اس کے بارے میں طرح طرح کے خیالات مشہور ہوئے ! مثلاً یہ عقیدہ کہ جہاں سحرالبیان زیادہ پڑھی جائے گی وہاں تفرقہ ضرور پیدا ہوگا ، یا یہ کہ جس گھر میں اس کا ورد ہوگا اس خاندان پر ضرور بیتا پڑے گی ۔ سعادت خان ناصر نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ سحرالبیان سے ”ہزار یا عورت فاحشہ ہو گئیں“ ۔ افسانہ طرازی کی اس فضا میں سحرالبیان کے لاتعداد نسخے رقم ہونے اور شہر شہر گاؤں گاؤں اس کی شہرت ہوتی ، اب تک ہزاروں کی تعداد میں مثنوی شائع بھی ہو چکی ہے ۔ اس وقت تک راقم الحروف کو اس کی ۴۸ اشاعتوں کا حال معلوم ہے^۱ ۔ جو کتاب اس کثرت سے قلمی صورت میں اور اس کے بعد مختلف اشاعتوں کے مرحلے سے گزری ہو اس کے متن میں بعض جزئی اختلافات کا پیدا ہو جانا عین ممکن ہے ۔ مثنوی کے مستند اور غیر مستند نسخے کثرت سے ملتے ہیں ۔ اس لیے متن کی تصحیح میں مرتبین کو خاصی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔

(۲)

اب تک جو مطبوعہ نسخے دیکھنے میں آئے اور جن کا متن بہت حد تک صحیح اور قابل اعتنا ہے وہ یہ ہیں :

(۱) فورٹ ولیم کالج کا نسخہ ، ۱۸۰۳ء (مرتبہ میر شیر علی الموسوی)

(۲) مطبع جعفری بمبئی ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء ۔

(۳) مخزن پریس دہلی کا نسخہ ۱۹۰۸ء

(۴) نولکشور کا نسخہ مرتبہ آسی ۱۹۳۵ء

(۵) شمس بریلوی کا مرتبہ نسخہ ۱۹۳۷ء

ان میں فورٹ ولیم کی اشاعت قدیم اور قابل اعتناء ہے ، اس کے بعد آسی اور شمس بریلوی کے نسخوں کا بکھر آلا ہے ۔ مخزن پریس کا نسخہ صحت متن کے اعتبار سے ان کے بعد ہے ۔ ان نسخوں کے مرتبین نے اپنے متون

۱ ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے مقدمہ^۲ مثنویات میر حسن (جلد اول) مرتبہ راقم الحروف ۔

ایک سے زائد قلمی نسخوں پر منحصر کیے ہیں اور اس میں بھی قدیم اور نسخوں کو چھانٹ کر بنیاد بنایا ہے ۔ لیکن اب بھی معاصر اور قریب السہد نسخوں کی مدد سے متن کی ترتیب ممکن ہے ۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل نسخے قدیم ترین قرار دیے جا سکتے ہیں :

(۱) ۵۱۱۹۹ کا مکتوبہ نسخہ در کتاب خانہ "انجمن ترقی اردو کراچی"

(۲) ۵۱۲۰۸ کا مکتوبہ نسخہ در کتاب خانہ "نواب سالار جنگ حیدر آباد دکن"

(۳) ۵۱۲۰۹ کا مکتوبہ نسخہ در کتاب خانہ "انجمن ترقی اردو کراچی"

لیکن سحرانیان کے ایک قلمی نسخے کا تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے جو سب سے زیادہ قدیم اور راقم کی رائے میں میر حسن کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے ۔ اس پر میر حسن کے دستخط نہیں ہیں اور ہمارے پاس حسن کی تحریر کا کوئی دوسرا نمونہ بھی نہیں ہے جس سے ان کے خط کا اندازہ کیا جا سکے ۔ اشپرنگر کی اودہ کٹالاک میں دیوان حسن کے ایک نسخے کا حال درج ہے جس پر تحریر مصنف کا گان ہو سکتا ہے ۔ مولیٰ محل (لکھنؤ) کی لائبریری میں دیوان حسن کے دو نسخے موجود تھے جن کا حال اشپرنگر نے دیا ہے ۔ ان میں ایک کے بارے میں یہ اندراج ملتا ہے :

An other copy in the same collection, without preface, written in a bad hand, with many erasures and corrections, is apparently an autograph. At the end is written in red ink, but it is not certain whether in the same hand :

۱ - بحوالہ مکتوبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق بنام راقم ۲۲ اکتوبر ۱۹۵۶ء -

۲ - کتب خانہ نواب سالار جنگ مرحوم کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست مرتبہ نصیر الدین ہاشمی صفحہ ۲۵۶ نسخہ نمبر ۸۴۶ ، اس میں ۱۶ تصاویر دکن اسکول مصوری کی شامل ہیں ۔

۳ - مکتوبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق بنام راقم ۲۲ اکتوبر ۱۹۵۶ء -

۲۵ ذوالحجہ پنج شنبہ ۱۱۹۲ھ در بنگلہ

آج یہ نسخہ اگر مل سکتا تو سحرالبیان کے خط اور اس دیوان کی تحریر کے باہمی مذاہلے سے ہم حسن کی تحریر کے بارے میں زیادہ یقین کے ساتھ کچھ کہہ سکتے : تاہم سحرالبیان کے اس نسخے کا بغور مطالعہ اور بعض دوسری شہادتوں سے یہ نسخہ میر حسن کے اپنے ہاتھ ہی کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔

(۴)

نسخے کی پیشانی پر ”قصہ فیروز شاہ قلمی“ لکھا ہوا ہے ۔ اس تحریر اور مثنوی کے متن کی تحریر میں فرق ہے ۔ نسخہ کرم خوردہ ہے ، مثنوی کے اکثر اشعار اس سے بری طرح متاثر ہیں ۔ جلد کے گئے کاغذ کے ٹکڑے آپس میں جوڑ کر تیار کیے گئے ہیں ۔ ان کاغذوں کو اگر کسی طرح الگ کر کے دیکھا جا سکے تو قدیم تحریر کے بعض نمونے ضرور ہاتھ لگیں گے ۔ جلد کے اندر کے رخ کاغذ کی بعض عبارات خوانا ہیں اور ان پر ۱۰ سوال ۵۱۲۳۳ کی تاریخ درج ہے ۔ یہ ورق کھر کے روزانہ حسابات کا گوشوارہ بیٹھی کرتے ہیں اور مثنوی کے کاتب سے جداگانہ شخص کی تحریر ہیں ۔ جلد کے اندر کے رخ کے اس صفحے پر ایک نام ”انور شاہ“ بھی لکھا ہے جو گوشوارے کے تحریر کنندہ سے مختلف ہے اور نسخے کی پیشانی کی عبارت (قصہ فیروز شاہ قلمی) سے ملنا جاتا ہے ۔

اس نسخے میں چار مثنویاں ہیں : سحرالبیان ، مثنوی لال و گوہر ، قصہ سوداگران ، قصہ پٹیان اور باہمی ۔ سحرالبیان ورق ۲ و تا ۶۳ و ، مثنوی لال و گوہر ۶۳ ب تا ۸۳ ب ، قصہ سوداگران ۸۳ و تا ۸۷ و ، قصہ پٹیان و باہمی ۸۷ ب تا ۹۲ و پھیلی ہوئی ہیں ۔ تحریر کے دوائر پختہ ہیں ۔ ابتداء میں جہاں سنبھل کر لکھا ہے تحریر نستعلیق مائل بہ شکستہ ہے ، آگے چل کر بعض مقامات پر بوری طرح شکستہ ہو گئی ہے ۔ پہلی دو مثنویاں ایک ہاتھ کی ، دوسری دو دوسرے ہاتھ کی نقل کردہ معلوم ہوتی ہیں ۔ قصہ سوداگران کا آخری حصہ آسانی سے پڑھا بھی نہیں جا سکتا ۔ سحرالبیان کے متن اور باقی مثنویوں میں ایک فرق نمایاں ہے ۔ سحرالبیان کے

بعض تر شعر کاٹ چیاٹ اور ترمیم و اضافے کی زد میں ہیں لیکن باقی تینوں مشنوں اس عمل سے خالی ہیں۔ ایک دو مقامات کے سوا جہاں روانی تحریر میں کاتب کوئی مصرعہ صریحاً غلط نقل کر گیا ہے یا لکھنے ہوئے بے احتیاطی سے پہلی سطر کا کوئی حصہ یا پورا مصرعہ دوسری سطر کے عہاد میں لکھ گیا ہے تو اسے کاٹ کر اصل مصرعہ لکھ دیا ہے، ورنہ مؤخر الذکر مشنوں میں کسی جگہ کوئی رد و بدل یا حک و اصلاح نہیں ہے، لکھنے والے نے کسی جگہ اپنے دستخط نہیں کیے اور نہ مسودات پر دستخطوں کا رواج کسی زمانے میں بھی رہا ہے۔ سحرالبیان کا متن میری دانست میں میر حسن کا ذاتی مسودہ ہے جس پر مصنف نے خود ہی ترمیم و اصلاح کی ہے۔

(ج)

اس متن کے تحریر مصنف ہونے کے قوی داخلی شواہد پائے جاتے ہیں۔ مندرجہ ذیل دلائل کی روشنی میں میرد اچھے مصنف کا خود نوشت مسودہ قرار دینے پر مجبور ہوں :

(الف) اس متن کے مرتب نے بعض اشعار متن سے خارج کر دیے ہیں اور وہ اشعار اب متداول نسخوں میں نہیں ملتے۔

(ب) بعض اشعار کی ہندشیں اور ترکیبیں بدل کر چست کر دی گئی ہیں اور اب یہ اشعار اس آخری شکل میں ہی مروجہ نسخوں میں درج ہیں۔

(ج) بعض اشعار کے قوافی بدل دیے گئے ہیں اور آخری صورت مؤخر نسخوں اور طباعتوں میں پائی جاتی ہے۔

(د) بعض مقامات پر اشعار حاشیے میں بڑھائے گئے ہیں کبھی سات کا ہندسہ بنا کر (۷) اور کبھی خط کہینچ کر، ان اشعار کو داخل متن شمار کیا گیا ہے۔ عام نسخوں میں یہ اشعار انہیں مقامات پر شریک متن ہیں۔

(۵) اشعار میں بعض بنیادی تبدیلیاں آئی گئی ہیں اور اس ترقی یافتہ صورت میں یہ اشعار عام نسخوں میں ملتے ہیں۔

(و) اشعار میں ایسی کٹ چھانٹ ہے جو عموماً خود مصنف کرتا ہے ۔

(ز) اشعار کے آدھے آدھے مصرعے لکھ کر خیال کی رو بدل جانے پر مصرعوں کا تحریر شدہ حصہ یا اس کا کوئی جز بدل دیا ہے اور شعر کا رخ اور طرف موڑ دیا ہے ۔

(۵)

اب اس اجمال کی تفصیل پیش کی جاتی ہے :

(الف)

مثنوی کے اس نسخے میں بعض ایسے اشعار ہیں جو متداول نسخوں میں نہیں پائے جاتے ۔ ذیل میں منقبت امیر المومنین کے سلسلے سے قبل کے چند شعر دیے جاتے ہیں :

آلہی بصدق ابانکر خاص کہ بودش بہ محبوب [تو] اختصاص
آلہی بگردان بعدل عدل درخت اسید مرا بارور
آلہی بعثمان شد شرمگین نگہدار شرم بندلما و دیس
آلہی بعلم و [بد] نور علی درو چشم کن در جہاں منجلی ..
اس کے بعد مندرجہ ذیل دو شعر لکھ کر کٹ دیے گئے ہیں جو متداول نسخوں میں بحال رکھے گئے ہیں :

نہیں ہم سر اس کا کوئی جز علی کہ بھائی کا بھائی وصی کا وصی
ہوئی جو لبوت لہی ہر تمام ہوئی نعمت اس کی وصی ہر تمام
اس کے بعد نیچے حاشیے پر یہ شعر ہے جو متداول نسخوں میں نہیں پایا جاتا :

گہر خمر چہار اند و گوہر چہار سروشنہ را ہا فضولی چہ کار
اس کے بعد بارہ شعر لکھ کر کاٹے گئے ہیں جو مروجہ نسخوں میں علیٰ حالہ ہیں ۔

(ب)

نسخے کے حاشیے پر کئی مقامات پر اشعار اضافہ کیے گئے ہیں اور وہ متداول نسخوں کے متن میں شامل ہیں۔ چند مثالیں، جہاں نشان (L) بنا کر حاشیے پر اضافہ کیا ہے، یہ ہیں :

کہا زہر سے ہم نے پھر شکوں
کہ دوں دوں خوشی کی خبر کیوں نہ دوں
کہانہوں کو سارنگیوں کو بنا
خوشی سے ہر اک اس کی طریں ملا
کوئی فن میں سنگیت کے شعلہ رو
ہرم جوگ لچھی کی لے پر ملو
کوئی دائرہ میں بجا کر ہرن
کوئی ٹھٹھی میں دکھا اپنا فن
کوئی ڈیڑھ گت ہی میں پاؤں تلے
کھڑی عاشقوں کے دلوں کو ملے
وہ کیلوں کی اور مولسریوں کی چھانو
لکی چاؤے آنکھیں لیے جن کا نانو
لیے ہاتھ میں پہلچھڑی مانتیں
جن کو بہریں دیکھنے بھالیں
کہیں تھم پاشی کرسی گود کر
چدیری لگائیں کہیں کھود کر
کروں علم اس کا کہا تک بیاں
کہ ہے خوب اب مختصر پر بیاں

لہذا خط کھنچ کر حاشیے کی طرف اشارہ کر کے جو اشعار درج ہوئے ہیں، ان میں سے ایک مثال یہاں پیش کی جاتی ہے۔

حبت کی آئی جو دل میں ہوا ویاں سے اے لے اڑی دل رہا

ہوا جب زمین سے وہ شعلہ بلند ہوا میں ستارا سا چمکا دو چند
 جلے رشک سے اس کے شمع و چراغ کہ اس سہ کا پہنچا فلک پر دما
 شب سہ میں وہ یوں زمیں سے اٹھا چلے شیر جس طرح سے جوش کھا
 غرض لے گئی آن کی آن میں اڑا کر وہ اس کو پرستان میں

(ج)

اکثر مقامات پر شاعر نے مصرعوں میں لرمیم کر کے بندشوں کو
 چست اور مصرعوں کو روان بنایا ہے۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں :

ہوئی شب لیا سہ نے جام شراب
 کیا سجدہ میں شکرخ کر آفتاب
 ہوئی شب لیا سہ نے جام شراب
 کیا سجدہ شکر میں آفتاب

یہ دیکھا جو عالم تو غش کر گئی
 وہ جیتی جو آہیں تھیں سب مر گئی
 یہ عالم جو دیکھا تو غش کر گئی
 وہ جیتی جو آہیں تھیں سب مر گئی

دکھا شاہزادے نے پشت کمر
 وہ چوٹی کا کولھے پہ آنا نظر
 وہ گدی وہ شانہ و پشت کمر
 وہ چوٹی کا کولھے پہ آنا نظر

وہ ہر اک طرف کیاریاں سے شہار
 چنیں اک طرف ڈالہیوں کی قطار
 اور اک طرف وہ کیاریاں سے شہار
 چنیں اک طرف ڈالہیوں کی قطار

کہا خوان ہز کون خبردار کر
 کہ رکھو تو خاصہ کون تیار کر
 کہا خاصہ ہز کون خبردار کر
 کہ رکھو تو خاصہ کون تیار کر
 ولے پاؤں جب اس کا نہ لٹک گیا
 کنواں اس کے درشن سے روشن ہوا
 ولے پاؤں جب اس کا نہ تک گیا
 کنواں اس کے اندوہ سے بھر گیا
 درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ ہے دھوپ
 وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ
 درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ وہ دھوپ
 وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ
 وہ دل لینا رکھ اپنے ہاتھوں پہ ہات
 اٹھانا وہ دامن کا ٹھوکر کے سات
 وہ دل پستنا ہاتھ پر دھر کے ہات
 اچھلنا وہ دامن کا ٹھوکر کے سات

پہلا سا قبا ساغر سے نظیر
 کہ ہجران خم میں ہے بدر منیر
 پہلا سا قبا ساغر سے نظیر
 بھنسی دام ہجران میں بدر منیر

(د)

اکثر مقامات پر توالی بھی بدل دیے گئے ہیں ۔ ان کی چند مثالیں یہ

ہیں :

وہ حمد میں تیری عز و شرف
 تجھے سجدہ کرتا چلوں سر ہدف

وہ حد میں تیری عز و جل
 تجھے سجدہ کرتا چلوں سر کے بل

چمن میں ہے وحدت کے یکتا وہ کل
 کہ مشتاق ہیں جس کے دریا سنبل
 چمن میں ہے وحدت کے یکتا وہ کل
 کہ مشتاق ہیں جس کے ہاں جزوکل

رہیں لعلِ خُشے اس میں روشن مدام
 معطر شب و روز صبح و شام
 رہیں لعلِ خُشے اس میں روشن مدام
 معطر شب و روز جس سے مشام

بہبھوت اپنے تن سے صفائی ہے مل
 رکھ اللہ کو مد کے شب آن لکل
 بہبھوت اپنے سر تن سے ملا سر بسر
 کیا دلُ جو اپنے کو خونی جگر

کہا تب ہری زاد نے بات اٹھا
 انگوٹھا اوپر بات یوں کر کہا
 کہا تب ہری زاد نے بات لا
 انگوٹھا دکھایا کہ اترا نہ جا

گیا ماہ رخ کون یہ فرمان جب
 ہوئی خوب میں وہ پریشان عجب
 گیا ماہ رخ کون یہ فرمان جب
 ہوئی خوب میں وہ پریشان تب

کہا اس نے تب اپنی جوتی دکھیا
ارے دیو تو کیوں دوانا ہوا
کہا اس نے تب اپنی جوتی دکھیا
ارے دیو تو اتنا اترا نہ جا

غرض اس طرح سے سواری چلی
کہے تو کہ ہائی کی جیسے جھڑی
غرض اس طرح سے سواری چلی
کہے تو کہ یاد بہاری چلی

(۰)

اس سودے میں اشعار کے اندر معانی و مطالب کے اعتبار سے بھی
بعض بنیادی تبدیلیاں کی گئی ہیں ، اس کی دو مثالیں ملاحظہ ہوں :

سبھوں کو وہی دین و ایمان ہے یہ دل ہے تمام اور فشاں جان ہے
... یہ تن ہیں تمام اور وہی جان ہے
دھرے تھے جو تکے اک انداز کے سر نہر بیٹھی تھی وہ ناز سے
دے کہنی تکے ہر انداز سے سر نہر بیٹھی تھی وہ ناز سے

(و)

ایسی کاٹ چھانٹ کثرت سے موجود ہے جو صرف مصنف ہی کیا
کرتے ہیں ۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں :

کروں پہلے توحید یزداں رقم
جھکا جس کے سجدے میں پہلے قلم
کروں پہلے توحید یزداں رقم
جھکا جس کے سجدے میں اول قلم

کسی میں برا آوے نہ کچھ کام جان
جو وہ مہربان ہو تو سب مہربان
کسی میں برا آوے نہ کچھ کام جان
جو وہ مہربان ہو۔ تو کل مہربان

کیا حق نے نبیوں کا سردار اے
بنایا نبوت کا سردار اے
کیا حق نے نبیوں کا سردار اے
بنایا نبوت کا حقدار اے

نہ ہونے کا سایہ کے یہ ہے سب
ہوا صرف کعبہ کے پوشش کوں۔ سب
نہ ہونے کا سایہ کے تھا یہ سب
ہوا صرف پوشش میں کعبہ کے سب

وہ بارہ آسمانوں کا گلشن کا گل
بہار ولایت کا باغ منجیل
دیار امانت کے گلشن کا گل
بہار ولایت کا باغ منجیل

خدا سے لگا کرنے وہ التجا
کہ مسجد میں کرنا وہ یاد الہ
خدا سے لگا کرنے وہ التجا
لگا آپ مسجد میں دکھانے دیا

ہوا جب کہ لوح خط وہ شیریں قلم
بڑھا کر لکھنے اس نے سائون قلم

ہوا جب کہ لو خط وہ شیریں قلم
ہڑا کر لکھے سات ہے لو قلم

عجب لازئیں عالم اس پر ہوا
اثر گدگدی کا جہیں پر ہوا
عجب عالم اس لازئیں پر ہوا
اثر گدگدی کا جہیں پر ہوا

ہڑا عکس دونوں کا جو نہر میں
لکے ٹوٹنے چاند پر لہر میں
ہڑا عکس دونوں کا جو نہر میں
لکے ٹوٹنے چاند پر لہر میں

(ز)

مثنوی کا سب سے اہم پہلو اشعار کی اس طرح کی کاٹ چھانٹ ہے جس میں اشعار کی تحریر میں چلنے چلنے پورا مصرعہ ، اس کا کوئی جز یا کوئی ایک آدھ لفظ کاٹ کر مصرعے کا رخ بدل دیا گیا ہے ۔ اس کی مثالیں اس نسخے میں کثرت سے ہائی جاتی ہیں ۔ ذیل میں صرف چند مثالیں نمونہ مشنے از خروارے دی جاتی ہیں :

ہلا ساقیا جھکو۔۔

ہلا جھکو ساقی محبت کا جام کہہ مہمانیوں کا ہوا دن تمام
خس و خار حسن۔۔

خس و خار ہے عشق حسن آگ ہے سدا حسن اور عشق میں لاگ ہے
بری زاد نے لب مونہ۔۔

بری زاد نے لب بکڑ اس کا بات فٹابی پٹھا تخت پر اپنے سات
اسی طرح پر شب دیا کیجے

اسی طرح پر شب کدوم کیجے مری بزم رشک ارم کیجے

مرے بیٹھنے سے یہ شکل ہوئی

مرے بیٹھنے سے اذیت ہوئی کہ، سہالیوں سے مصیبت ہوئی

ہوا ایک دیوؤں کا ہمان وان گذر

ہوا لاگہاں ایک کا وان گذر

مرا عذر ہووے یہ تقصیر —

مرا عذر تقصیر ہووے قبول بحق نبی و بہ آل رسول

... .. بحق صحابی بہ آل رسول

لے آیا ہوں خدمت میں پھر نثار

لے آیا ہوں خدمت میں پھر نیاز یہ امید ہے پھر کہ ہوں سرفراز

ان قرائن و شواہد کی بنا پر یہ نتیجہ نکلانا بے موقع نہ ہوگا کہ

سحر الہیان کا یہ قلمی نسخہ خود مصنف کا مسودہ ہے ۔

(۶)

نسخے میں تین ہائیں الیہ ایسی ہیں جو مدتوں میرے لیے سوچ بچار

کا سبب رہی ہیں ۔ یہ قلمی نسخہ پہلی بار ۱۹۵۱ء میں میری نظر سے گذرا

تھا ۔ اس وقت سے لے کر ۱۹۶۵ء تک اظہار رائے میں ہنس و ہنس

کا سبب یہی ہائیں تھیں ۔ اول یہ کہ اس میں بعض الفاظ جو ملا کر لکھنے

چاہئیں تھے جدا جدا کر کے لکھے گئے تھے ؛ مثلاً سوجاؤ بجائے سجھائی ،

ٹوٹ نے بجائے ٹوٹے وغیرہ ، دوسرے اس میں اضافت کے مقامات پر بھی

بے کا استعمال اور بالعکس بھی دیکھنے میں آیا ؛ شرح نبی کی بجائے شرحی

نبی ، وہ حمد کی جگہ رہی حمد ۔ تیسرے بعض املا کی غلطیاں بھی ملیں

مثلاً کہ کی جگہ کے ، ازہمام کی جگہ ازدھام ، گلزار کی جگہ کفار ۔ اس سے

شبہ ہوتا تھا کہ شاید نسخہ مصنف کا نہ ہو ۔ لیکن دوسرے قریبے اٹنے

قوی تھے کہ پھر فیصلہ نسخہ مصنف ہونے کے حق میں جانا تھا ۔ ان

چودہ برس میں اس دور کے کئی قلمی نسخے نظر سے گزرے اور اس بات

کا یقین ہو گیا کہ لفظوں کو توڑ کر لکھنے کا رواج پاک و ہند کے کاتبوں

کے ہاں دسویں گیارھویں صدی سے چل کر بارھویں صدی تک برابر رہا

ہے ، اضافت اور 'یے' کے سلسلے میں بھی غفلت کی مثالیں بکثرت بارہویں صدی ہجری میں دیکھنے میں آئیں۔ ازدحام اور ازدحام کی غلطی مصنفین آج تک کرتے ہیں۔ گلزار کا لفظ حسن کے معاصرین کے لکھے ہوئے قلمی نسخوں میں بھی "ذ" سے ہے۔ چنانچہ مجموعہ نغز کے علاوہ خود میر حسن نے گلزار میں ز کی جگہ ذ شمار کر کے مثنوی گلزار ارم کا سندہ تصنیف لکلا ہے۔ اس لیے میری دانست میں حوالیہ بیان کا یہ مسودہ مصنف کا خود نوشت ہے۔ اس کی بنیاد پر راقم الحروف مثنویات میر حسن کی جلد دوم ترتیب دے چکا ہے جو عنقریب مجلس ترقی ادب لاہور کی طرف سے شائع ہوگی۔ اس نسخے کے بارے میں بعض دیگر معلومات اس ایڈیشن میں ملیں گی۔

(۷)

حوالہ بیان کے اس نسخے کے ساتھ تین مثنویاں اور بھی ہیں جو زبان و بیان کے اعتبار سے دکنیات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس میں مثنوی اعلیٰ و کمر از عاجز تو یقیناً اسی کاتب کی لکھی ہوئی ہے۔ باقی دو مثنویاں کا انداز تحریر صرف ایک حد تک ملتا جلتا ہے۔

قصہ لال و گوہر کا مصنف عاجز ہے۔ مثنوی کے خاتمے میں خود کہتا ہے :

ارے عاجز سخن کب تک کہے گا سخن کی فکر میں کب تک رہے گا
غموشی میں زبان کون آشنا رکھ ہوا اللسانہ آخر مدعا رکھ
الہی عاشقوں کی آبرو رکھ اونہوں کوں دوجہاں میں سرخرو رکھ

عارف الدین عاجز دکن کے مشہور شاعر ہیں ، ان کی پیدائش اورنگ آباد میں ہوئی ، دربار آصفی میں عروج پایا اور فوج کے بخشی ہوئے۔ مثنوی لال و گوہر کے علاوہ ان کے دیوان کا نسخہ بھی کتب خانہ آصفیہ میں پایا جاتا ہے۔ مثنوی کے متعدد قلمی نسخے یورپ اور دکن کے کتاب خانوں

میں ملتے ہیں۔ بقول ہاشمی عاجز کا انتقال ۱۱۷۸ھ میں ہوا۔ لیکن اگر کل عجائب پر بھروسہ کیا جائے تو عاجز ۱۱۷۵ھ میں فوت ہوا۔ مثنوی لال و گوہر کا سنہ تالیف معلوم نہیں۔ جناب نصیر الدین ہاشمی کی رائے ہے کہ یہ مثنوی ۱۱۵۰ھ کے بعد کی تالیف ہے۔ اس لحاظ سے اس کا زمانہ تالیف ۱۱۵۰ھ اور ۱۱۷۵ھ کے مابین قرار دیا جا سکتا ہے۔ مثنوی کم از کم چار بار طبع ہو چکی ہے۔ ۱۸۷۳ء اور ۱۸۷۷ء میں مدراس اور بمبئی سے، ایک اشاعت مسطفاٹی پریس مظفر گڑھ سے اور ایک مطبع حدردی بمبئی سے ۱۳ وجہ ۱۲۸۲ھ کو بارہ نصوص کے مجموعے میں چھپی۔ آخر الذکر اشاعت راقم الحروف کے کتاب خانے میں موجود ہے۔ مثنوی کے قلمی نسخے کئی لائبریریوں میں پائے جاتے ہیں۔

نصہ سوداگراں کے مصنف کا نام معلوم نہیں اور نہ اس کے کسی اور قلمی نسخے کا علم ہے۔ نسخہ زیر بحث کے ورق ۸۷ الف پر درج شدہ اشعار صحیح طور پر نہیں پڑھ جا سکے۔ ان سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ شاعر غوث الاعظم کا مدح خواں اور انہیں کے سلسلہ ارادت سے تعلق رکھتا ہے۔ شاہ میراں کا ذکر بھی ہے۔ ایک شعر یوں معلوم ہوتا ہے :

توجہ رحمت اپنے پر کرو تم اے شاہ میراں

صفائے باطنی ہوئے آئے از حضرت میراں

- ۱۔ دکن میں اردو (نصیر الدین ہاشمی) طبع پنجم (۱۹۹۰ء) صفحہ ۳۳۳۔
- ۲۔ دکن میں اردو (ہاشمی) طبع ششم (۱۹۹۲ء) صفحہ ۳۲۱ اور دکنی ادب کی تاریخ (ڈاکٹر عی الدین قادری زور) طبع ۱۹۹۰ء صفحہ ۱۴۷ لکھا ہے کہ عاجز آخری زمانے میں ٹالندڑ میں ایک عزیز کے ہاتھ مقیم تھے کہ سنہ ۱۷۶۳ء میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔
- ۳۔ کل عجائب صفحہ ۸۵۔
- ۴۔ کتاب خانہ نواب سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرستہ (ہاشمی) ۱۹۵۷ء صفحہ ۶۳۶۔
- ۵۔ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں ایک نصہ سوداگر از شاہ رحمن مکتوبہ ۱۲۹۳ھ موجود ہے معلوم نہیں کہ اس سے جدا ہے یا نہیں ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے فہرست مخطوطات صفحہ ۳۳۳ بذیل نشان ۹۰۳۔

ہفتہ بڑی جاچے سو بسیر
 کہ رنج میں ہوں ایچے دوستی خبر
 دیکھن مقصد میں جگہ اور ہیں
 کہ میں اس کے لیے میرا ہن بڑی ہوگی
 بہت دھکا تو سو کا ولی کی کہیں
 غلطی ہو کسی بار میں برس ہیں
 نہ آتی بہت غور شید بلا ہی نام
 ہندی کے خطر ہی اس کے نام
 نہ کھلی بہت بارہ برس کھڑے
 ہی میں نہ بارہ
 کہنا سکان شیعہ تھا کئی ہیں
 کہو ہی کا خطر تو اس کا نہیں
 کہنا جاکنی سب طرح خبر ہی
 کہو دشت غربت کی جگہ سیری
 کوئی ہوسہ عاشق جو چو ہی ہوا
 کوئی اس کے خوف میں سو سیری
 کچھ لبت لکھتا ہی ہوتی ہیں
 وہ بہت کچھ لکھتا ہی ہے
 چو ہی جگہ خوشی نہ کرن تو کہہ
 کہو دشت میں تو ہم ہیں شادی
 کہ نہ نہ سب سب نہیں افسدہ
 جو چو ہی مری میرا بڑھکا
 بہت فرما کس میں درد کہہ سوری
 منہ دانتے ہوا کہہ سوری
 خدا پر سب تو سکا تھا اعتقاد
 لگا مانگے ہی سکا ہی مراد
 خدا سے لگا کر نہ دے
 کہ مسجد میں کوئی یا وہی
 سب کو کم نہ کی
 کہ کشتیا جیہے باہر

اللہ

دو سہ سال بن بہرہ ناست بند

رہا ایک محل زوہر بہرہ

خوشی میں بدایاں تی بکوں سر
کردن نئے شہیت کو جس شروع
کئے زمین جٹ سپر خور
خواروں کی خواہ سے کو نہ جا
جداک بکلی ای نہ نیک بخت
سکندر نزلہ اور دارا چشم
بہر سستی ہی نرودہ چھٹا نماز
تجلی نقد کرتے نہیں گھٹے بار
دوکانہ خرمن شکر کا گروا
جب اس شکر سے سواد پذیر
وہ نظریں خواہو بکلی خوشی

کون دم بین بکھائی جگہ
کہ ایک بکھتر کو سر مدح
سو اکوہاں شکر کر تو دیوہ
اوشی ایک تپا ہوا نقاب
کئے تدریں کھڑکیاں اور کہا
کہ جدا سوا دلش تاج تخت
فلک جہنم اور عمارت دہم
غلامی کر ہی دوسکی خاتمان چین
کئے لاکھ سجدہ ای پے نیاز
نہو جسے پاپوس امیدوار
تجلی نقد کرتے نہیں گھٹے بار
دوکانہ خرمن شکر کا گروا
جب اس شکر سے سواد پذیر
وہ نظریں خواہو بکلی خوشی

دیر سار دیر غار دیر سار کہ تر آصف اندام جدا
 خانے اوٹکی سر سید دیر سار ابرو زلف و کجا جراح دیر سار
 بخت حسین و نام حسن اہمہ سندھ میں دیر سار
 نذر اسفندیار کہ دریا کھوٹا دیر سار
 بخت حسین کہ بخت حسین شب بخت حسین دیر سار
 بخت حسین کہ بخت حسین شب بخت حسین دیر سار

دیر سار دیر غار دیر سار

دیر سار دیر غار دیر سار دیر سار دیر غار دیر سار
 دیر سار دیر غار دیر سار دیر سار دیر غار دیر سار
 دیر سار دیر غار دیر سار دیر سار دیر غار دیر سار
 دیر سار دیر غار دیر سار دیر سار دیر غار دیر سار
 دیر سار دیر غار دیر سار دیر سار دیر غار دیر سار
 دیر سار دیر غار دیر سار دیر سار دیر غار دیر سار
 دیر سار دیر غار دیر سار دیر سار دیر غار دیر سار
 دیر سار دیر غار دیر سار دیر سار دیر غار دیر سار
 دیر سار دیر غار دیر سار دیر سار دیر غار دیر سار
 دیر سار دیر غار دیر سار دیر سار دیر غار دیر سار

رحمت بظاہر تخلص ہے ۔ اس سے اوپر ایک شعر ہے :

مرا یہ حال سب دیکھیا شفقت مجھ پہ کی رحمت

خدا نے آن کی برکت سے مری سب دور کی رحمت

اس مثنوی کی زبان دکنی ہے ۔ رحمت نام کا ایک شاعر دکن میں ملتا ہے ۔ دور آصفی کے شعرا میں خواجہ رحمت اللہ رحمت ایک صوفی بزرگ اور شاعر ہوئے ہیں ۔ یہ عاجز کے معاصر ہیں اور ان کے نام پر اوڈگیر کے قلعہ دار عبدالقادر خان نے رحمت آباد کا گاؤں بھی آباد کیا تھا ۔ نائب رسول اللہ کے لقب سے بھی مشہور ہیں ۔ انھوں نے کئی مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے تہذیب النساء نے زیادہ شہرت پائی^۱ ۔ ۱۱۹۵ھ میں ان کا انتقال ہوا^۲ ۔ لیکن اس دور کے کسی بزرگ شاہ میراں کا حال معلوم نہیں ۔ شاہ میراں اللہ سے اقدم ہوئے ہیں ۔ قطب شاہی دور میں میراں شاہ معروف تھے جن کو بھی الدین ثانی فرار دیا گیا ہے ۔ ان کے مرید سلطان تھے اور سلطان کے مرید افضل تھے ۔ افضل شاعر ہوئے ہیں ۔ انھوں نے بھی الدین نامہ (مثنوی) لکھی ۔ یہ مثنوی ۱۰۵۰ھ کے بعد کی تصنیف ہے ۔ مثنوی کے علاوہ افضل کے مرثیے بھی ملتے ہیں ۔ افضل نے اپنی اس مثنوی میں اپنے مرشد سلطان اور ان کے مرشد میراں شاہ کی تعریف کی ہے اور حضرت غوث الاعظم کے مناقب و فضائل بیان کیے ہیں^۳ ۔ مصنف خواہ افضل ہو یا کوئی دوسرا اپنے مرشد کا نام سلطان بھی الدین بتاتا ہے جو معروف شاہ یا شاہ معروف میراں کے خلیفہ تھے ۔ شاہ معروف نے مصنف کی تربیت اپنے خلیفہ سلطان کے سپرد کی ۔ شاہ معروف کا حال معلوم نہیں ڈاکٹر زور نے سید شاہ معروف مدفون کڈلور اور ان کے پوتے شاہ معروف کا ذکر کیا ہے لیکن یزین کے ساتھ ان میں سے کسی ایک کو شاہ سلطان کا مرشد

۱ ۔ دکن میں اردو ۔ طبع ششم صفحہ ۴۶۶ ۔

۲ ۔ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری (کتب خانہ آمفیہ) کے اردو مخطوطات

(تھیر الدین ہاشمی) جلد دوم ۱۹۹۱ء صفحہ ۸۹ ۔

۳ ۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست

(ہاشمی) صفحہ ۷۸۳ ۔

نہیں بتایا ۱۔ اس طرح شاہ میراں افضل کے بزرگ معاصر قرار پاتے ہیں۔
ممکن ہے ان کے مریدوں میں رحمت تخلص کا کوئی شاعر بھی ہو جس نے
قصہ سوداگراں لکھا ہے۔

تیسری مثنوی قصہ پٹھان و باہمنی نجم الدین کی تصنیف ہے اور شاعر
نے مثنوی کے آخر میں اپنا نام اور سنہ تصنیف درج کیا ہے :

نجم دین قصہ کوئی کر تو ختم عجب کچھ بنایا گھر کر ظلم
سنہ یک ہزار سو اوپر شصت سال بنایا ہوں قصہ عجب تیک فال ۲

یہ مثنوی گویا ۱۱۶۰ھ میں تصنیف ہوئی۔

میر حسن کا انتقال ۱۲۰۱ھ میں ہوا۔ تینوں مثنویاں حسن کی
وفات سے قبل تصنیف ہو چکی تھیں، لال و کوہر ۱۱۵۰ھ اور ۱۱۷۵ھ کے
مابین، قصہ سوداگراں ۱۱۹۵ھ سے قبل اور پٹکان غالب ۱۱۰۵ھ کے کچھ
بعد، قصہ پٹھان و باہمنی ۱۱۶۰ھ میں۔ اگر اس تمام نسخہ زیر نظر کو
میر حسن کا مکتوبہ بھی قرار دیا جائے جب بھی باقی تینوں مثنویوں کے
سبب تالیف ہمارے استدلال کے خلاف نہیں جاتے۔

۱۔ نسخہ زیر بحث ورق ۹۶ الف۔ اس کے دو قلمی نسخے کتاب خانہ
انجمن ترقی اردو کراچی میں ہیں (فہرست ص ۸۳، ۸۵) نیز ایک
نسخہ انڈیا آفس میں (بلاوم ہارٹ شاہ ۵/۷۳) ادارۃ ادبیات کی فہرست
مخطوطات کی رو سے دکنی میں بھی نسخہ ہے (فہرست جلد اول
ص ۲۵۳)۔

۲۔ فہرست مخطوطات انجمن ترقی اردو جلد اول ص ۸۳، ۸۴۔

میر حسن اور سحر البیان

(۱)

’سحر البیان‘ کے مصنف میر حسن (غلام حسن) ساداتِ ہرات میں سے تھے^۱۔ ان کے مورثِ اعلیٰ میر امامی موسوی بھندر شاہجہان واردِ دہلی ہوئے^۲۔ خاندان کی بود و باش دہلی میں تھی^۳۔ والد کا نام میر غلام حسین خاں تھا۔ خاں کے والد میر عزیز اللہ بھی حسن اور خاں کے کچھ حصے شاعر تھے، ان کا تخلص غلص بیان کیا جاتا ہے^۴۔ میر خاں صاحبِ دیوان تھے۔ ان کا دیوان اب دریاوت ہو چکا ہے اور اس کے کچھ حصے شائع بھی ہو گئے ہیں^۵۔ ان کا لہجائی تعلق حضرت بندہ نواز گیسو دراز^۶ کے خاندان سے تھا^۷۔ وہ عقیدے کے اعتبار سے شیعہ تھے۔

میر غلام حسن، حسن، میر خاں کی اولاد تھے۔ محمد سید واڑہ (برانی دلی) میں ۱۱۷۳ھ/۱۷۵۸ء کے قریب پیدا ہوئے^۸۔ ابتدائی حالات تفصیل سے معلوم نہیں۔ صرف اس قدر معلوم ہے کہ دلی میں سیرِ تنہا کو پہنچے۔ پھر سے موزوں طبع تھے ’بیچ لڑکانی کے‘ خواجہ میر درد کی صحبت

۱۔ میر حسن، دیباچہ دیوانِ حسن، مخطوطہ برٹش میوزیم ص ۱۳۳۔
شیر علی السوس، دیباچہ سحر البیان عبدالباری آسی (مرتب) مثنویات
میر حسن، ص ۱۶، طبع نولکشور ۱۹۳۵ء۔

۲۔ میر حسن، دیباچہ دیوانِ حسن، نیز تذکرۂ شعرائے اردو، ص ۲،
۱۵۳، ۱۰۳، طبع ثانی ۱۹۳۰ء۔

۳۔ دیباچہ سحر البیان، ص ۱۶۔

۴۔ قللی بیاض مملو کہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔

۵۔ معاصر، ہشتہ، شماره ۱۸، ۲۰، ۲۱۔

۶۔ ابوالحسن (مترجم) تذکرۂ شعرائے اردو، ص ۲۲۔

۷۔ میر حسن اور ان کا زمانہ، ص ۱۹، تا ۲۰۔

سے دلی میں مستفید ہوئے۔ آغاز جوانی تھا کہ دلی کے سیاسی حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر میر ضامک نے اپنے اہل و عیال کے ساتھ اودھ کا رخ کیا۔^۱ - برائن اصبح میر حسن ۱۷۶۵ء/۱۱۷۹ھ کے لگ بھگ اپنے باپ کے ہمراہ دلی سے نکلے۔ راستے میں ڈیگ میں چار ماہ قیام رہا، مکن پور سے ہوتے ہوئے لکھنؤ آئے۔ یہاں ایک برسات گزار کر فیض آباد چلے آئے۔ فیض آباد اس زمانے میں اودھ کا دارالسلطنت تھا۔ "تذکرۂ شعرائے اردو، (میر حسن) کے ایک انشواج سے میر حسن کے فیض آباد پہنچنے کا زمانہ ۱۷۶۸ء - ۱۷۶۹ء/۱۱۸۰ھ - ۱۱۸۱ھ کے مابین محصور کیا جا سکتا ہے۔"

میر حسن اگرچہ بچپن سے شعر کہنے لھے لیکن ان کی شعر گوئی کا باقاعدہ سلسلہ فیض آباد ہی میں شروع ہوا۔ چلے وہ میر ضیاء الدین ضیا (ہاگرہ سودا) کے حلقہ تلمذ میں داخل ہوئے، جب سودا فیض آباد آئے (۱۷۷۲ء/۱۱۸۶ھ) تو میر حسن ان سے بھی اصلاح لینے رہے۔^۲ - میر حسن شجاع الدولہ کے برادر لسانی سالار جنگ (م ۱۷۹۷ء/۱۲۱۲ھ) کے زمرہ ملازمین میں شامل ہوئے اور ان کے فرزند نوازش علی خان سالار جنگ کے صاحب مقرر کئے گئے۔^۳ - ذی القعدہ ۱۷۷۳ء/۱۱۸۸ھ میں شجاع الدولہ کا انتقال ہوا اور آصف الدولہ وارث سلطنت ہوئے۔ انھوں نے فیض آباد کی بجائے لکھنؤ کو دارالحکومت بنایا۔ ۱۷۷۶ء/۱۱۸۰ھ - صفر ۱۱۹۰ھ کے بعد غالباً میر حسن بھی اسی زمانے میں لکھنؤ آ گئے ہوں گے۔

سالار جنگ کی سرکار سے میر حسن کو بہت معمولی رقم ملتی تھی

۱ - انیسوس ، دیباچہ شعر البیان ، ص ۱۶ ، ۱۷ -

۲ - ایضاً - صفحات متعلقہ ، نیز میر حسن اور ان کا زمانہ ، ص ۲۰۹ تا ۲۲۶ -

۳ - انیسوس ، دیباچہ شعر البیان ، نیز میر حسن اور ان کا زمانہ ، ص ۲۶۰ -

۴ - صحیفی ، تذکرۂ ہندی مرتبہ مولوی عبدالحق ، ص ۱۶ ، طبع ۱۹۳۳ء -

۵ - میر حسن اور ان کا زمانہ ، ص ۲۷۲ ، ۲۷۳ -

۶ - تاریخ طرح پٹن متعلقہ صفحات -

اور گزر اوقات مشکل سے ہوتی تھی۔ شاید اسی لیے بعض دوسرے اصحابِ اقتدار کے قعیدے بھی ان کے ہاں ملتے ہیں۔^۱ ۱۹۸۱ء/۱۹۹۶ء کے بعد جب سالار جنگ آصف الدولہ کے معنوب ہو گئے تو میر حسن کو مالی مشکلات نے اور بھی ستایا ہوگا۔ چنانچہ میر حسن نے آصف الدولہ کے دامن سے وابستہ ہونے کی سعی بھی کی۔^۲ انھوں نے قصائد کے علاوہ ایک مثنوی آصف الدولہ کے باورچی خانے کی تعریف میں بھی لکھی۔ 'سحرالبیان' بھی آصف الدولہ ہی کے نام سے معنوں کی گئی، اگرچہ خاطر خواہ صلہ نہ ملا۔^۳ میر حسن کا آخری سرمایہٴ حیات 'سحرالبیان' ہے جو ۱۹۸۴ء/۱۹۹۹ء میں مکمل ہوئی۔ میر حسن ۱۹۸۵ء/ذی الحجہ ۱۴۰۰ء میں بیمار ہوئے اور ۱۹۸۶ء/عشرہ محرم ۱۴۰۱ء میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔ انھیں مفتی گنج میں دفن کیا گیا۔^۴

میر حسن کے دس گیارہ برس کے ساتھی اور سالار جنگ کے متوسل میر شیر علی افسوس کا بیان ہے کہ میر حسن کے چار بیٹے تھے۔^۵ بعض محققین کو اس سے اختلاف ہے۔ ان کی رائے میں میر حسن کے تین بیٹے ہوئے۔^۶ میر حسن کی اولاد میں خلی اور خلیق بطور شاعر کچھ شہرت رکھتے ہیں۔ خلیق کے بیٹوں میں سے میر الیس نے مرثیہ نگاری میں بڑا نام پایا۔

(۴)

میر حسن کا کل سرمایہٴ شعری ایک دیوان (جس میں چھ قعیدے،

۱۔ میر حسن، تذکرہ شعرائے اردو، صفحہ ۵۵، مرزا علی لطف گلشن، ہند، ص ۱۸۸، طبع ۱۹۳۳ء، امر اللہ الہ آبادی، تذکرہ مسرت المزا (ترجمہ، حسن)۔

۲۔ میر حسن اور ان کا زمانہ، ص ۳۰۳، ۳۰۴۔

۳۔ افسوس، دیباچہ سحرالبیان، ص ۱۶۔

۴۔ میر حسن اور ان کا زمانہ، ص ۳۱۱، ۳۱۲۔

۵۔ افسوس، میر شیر علی، دیباچہ سحرالبیان، ص ۱۶۔

۶۔ زمانہ تہذیب الاخلاق، لاہور، جنوری، مارچ، ۸، ۱۳۔ ہماری

زبان، علی گڑھ، ۱۵ جنوری ۱۹۹۷ء، ۸ مارچ ۱۹۹۷ء۔

غزلیات کا دیوان اور رباعیات وغیرہ شامل ہیں) ، بارہ مثنویوں اور ایک تذکرے (تذکرۂ شعرائے اردو) پر مشتمل ہے۔ 'دیوان میر حسن' غالباً ۱۱۹۳/۱۱۷۹ء میں مدون ہو چکا تھا۔ 'تذکرۂ شعرائے اردو' کا آغاز ۱۱۷۹/۱۱۸۳ء میں اور اولین تکمیل ۱۱۷۹/۱۱۸۹ء میں ہوئی اور ۱۱۹۳/۱۱۷۹ء سے باقاعدہ مرتب کیا گیا اور ایک آدھ اضافہ بعد میں بھی ہوا۔ مثنویوں کے نام یہ ہیں : 'نقلہ کلاوت' ، 'نقلہ زہر فاحشہ' ، 'نقلہ قصاب' ، 'نقلہ قصائی' ، 'مثنوی در شادی' آصف الدولہ (۱۱۷۹/۱۱۸۳ء) ، 'رموز العارفین' (۱۱۷۹/۱۱۸۸ء) ، 'مثنوی ہجو حویلی' (۱۱۷۹-۱۱۸۹/۱۱۸۹ء) ، 'گلزار ارم' (۱۱۷۹/۱۱۷۹ء) ، 'مثنوی در تہیت عید' (۱۱۷۹/۱۱۸۳ء) ، 'مثنوی خوانِ نعمت' (غالباً ۱۱۷۹/۱۱۸۳ء)۔ 'سحر البیان' کی تحریر کا زمانہ کئی برس پر محیط ہوگا۔ الہوں نے اس کی تحریر میں جان کاوی سے کام لیا ہے۔ اس نظم ہارے میں ان کی محنت اور صنایع اپنے عروج پر ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن نے دیگر مثنویوں میں جو فنی تجربے کیے ہیں ان کا بہترین سرمایہ یہاں استعمال کیا ہے۔

(۴)

مثنوی نگاری کا فن میر حسن کے ہاں کم از کم تین مرحلوں سے گزرا ہے۔ 'نقلہ کلاوت' ، 'نقلہ زہر فاحشہ' ، 'نقلہ قصاب' اور 'نقلہ قصائی' میں اسلوب کا وہ لٹکھار ، لہجے کی ہمواری اور تجربے کا وہ تنوع اور وسعت نہیں ہے جو دوسرے دور میں میر حسن کو حاصل ہوا۔ گویا حسن کاری کے لحاظ سے یہ مثنویاں اعلیٰ معیار کی نہیں ہیں۔ ان میں کہیں کہیں بول چال کی زبان پر قدرت اور ڈرامائی اشارات کا استعمال ضرور پایا جاتا ہے۔

۱۔ امپریلنگر Oudb Cat. متعلقہ اندراج

- ۲۔ زمانہ نقوش ، لاہور (مقالہ پر تذکرۂ شعرائے اردو) ، جنوری ۱۹۵۷ء۔
- ۳۔ وحید قریشی ، مقدمہ مثنویات میر حسن ، ص ۳۰ تا ۳۸ طبع لاہور۔
- ۴۔ وحید قریشی (مرتب) مثنوی سحر البیان ، ص ۱۹۳ ، لاہور اکیڈمی ، لاہور طبع ۱۹۶۶ء۔

’فقرِ قصاب‘ اور ’فقرِ ثعالبی‘ میں قصاب ٹولے کی زبان اور اقتدارِ طبع کا نقشہ کھینچا گیا ہے، لیکن یہ کاوشیں فنی لحاظ سے ادھوری اور ناقص ہیں۔ دوسرا دور ’مثنوی در شادی‘ آصف الدولہ، ’مثنوی ہجو حویلی‘، ’گزارِ ارم‘، ’مثنوی در تہیت عید‘ اور ’مثنوی در وصف قصرِ جواہر‘ پر مشتمل ہے۔ جہاں حسن کی فنی بصیرت زیادہ جاذب و دلکش ہے۔ ان مثنویوں میں موضوع اور طریقہ کار کا اشتراک ہے۔ صرف ’رموز العارفین‘، باقی مثنویوں کے انداز و موضوع سے مختلف ہے۔ اس دور کی دیگر مثنویوں میں میر حسن نے وصفیہ پہلوؤں پر زیادہ توجہ صرف کی ہے ’رموز العارفین‘ میں بیانیہ انداز زیادہ نمایاں ہے۔ موضوع کی عظمت کے باوجود ’رموز العارفین‘ ہم پر وہ اثر نہیں چھوڑتی جو میر حسن کی دوسری مثنویوں سے ہوتا ہے۔ اس میں بیان کیے گئے مسائل تصوف، میر حسن کے گہر کی فضا سے متعلق ہونے کے باوجود اس کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں۔ روحانی تجربات کی فلسفیانہ تعمیم میر حسن کے جذباتِ زندگی سے گہرا علاقہ نہیں رکھتی، جہاں میر حسن کی ذات اور موضوع کے درمیان بہت بڑا فاصلہ معلوم ہوتا ہے۔ میر حسن مادی زندگی سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں، چنانچہ ماحول سے گہرے جذباتی رابطے کی وجہ سے میر حسن کی دوسری مثنویاں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔

(۴)

ان کی شاعری کا تیسرا دور ’سحر البیان‘ کی شکل میں بارے سائے ہے۔ دونوں ادوار کا سرمایہ ”تجربات جہاں زیادہ سلینے سے صرف ہوا ہے۔ خصوصاً دربار کے مناظر، شادی کی رسومات، محلوں کی زندگی کی تفصیل، فضا کو روشنی اور سائے کے حوالے سے بیان کرنے کا ڈھنگ میر حسن کے جذباتی ردِ عمل کا عکس ہے۔ میر حسن نے باقی مثنویوں میں زبان و بیان کے نئے تجربے محدود پہنائے ہوئے ہیں اور ’سحر البیان‘ میں انہیں زیادہ تنوع اور سہارت سے برتا ہے۔ مکالمے میں مختلف طباقوں کے لب و لہجے اور روزمرہ کا اہتمام بھی ہے۔ وہ طبعاً تصویر کاری کے شائق ہیں اور ان کا یہ رجحان بھی دوسرے دور میں زیادہ نمایاں ہوا ہے۔ زندگی کے مختلف دائروں سے تعلق رکھنے والی اصطلاحات و معلومات کا ذخیرہ بھی پہلے کی نسبت زیادہ ہے۔ یہ سارے ذرائع فیض آباد اور لکھنؤ کے گلی

کوچوں پر پہلے آزمائے گئے ہیں ، اس کے بعد 'سحر البیان' کی تھیلی کہانی میں ان سے کام لیا گیا ہے ۔ میر حسن کے ہاں علمِ بھاس کا ذوق ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشرتی زندگی کے مختلف مظاہر ، طبقات کے خصوصی میلانات اور انسانی سرشت سے واقفیت کا میر حسن نے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے ۔ یوں تو ہماری مظلوم و مشور داستانوں میں تدریسی رجحان اہمیت رکھتا ہے ، لیکن میر حسن اس پاس کی زندگی سے گہرے جذباتی لگاؤ کی وجہ سے اس انداز کے زیادہ ہی مشتاق ہیں ۔ اگرچہ 'سحر البیان' ایک خیالیہ ہے ، جس سے میر حسن نے اپنی ذاتی خواہشات کے نسکاس کا کام لیا ہے لیکن تخیل بھی اپنا مواد تو آخر زندگی ہی سے حاصل کرتا ہے ۔ 'سحر البیان' میں داستانی سرمائے کا کچھ حصہ بھی استعمال میں آیا ہے ۔ کہانی کے اجزاء مختلف داستانوں سے ماخوذ ہیں ، لیکن مثنوی کے غار و بود ، گرد و ہش کے شعور اور زندگی کے بھیلان کو جذباتی سطح پر محسوس و محصور کرنے کا جو انداز میر حسن نے اختیار کیا ہے اس نے مثنوی کو مؤثر و دلکش بنا دیا ہے ۔ اس سماجی پیش منظر اور عقلی فضا میں شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کا عہد صاف جھلکتا ہے ۔ مثنوی کی چارتوں بہت واضح ہیں :

(الف) ایک رخ وہ ہے ، جس میں میر حسن ہارے سامنے ایک داستان گو کے روپ میں آئے ہیں ۔ کہانی کے مختلف اجزاء قدیم داستانوں میں بکھری ہوئی صورت میں ملتے ہیں ۔ میر العقول کاوناسے ، جن ، ہریاں ، دیو ، کل کا گھوڑا ، وقت کا تہم جانا ، فاصلوں کا سٹ جانا ، کہانی سننے والوں کو ایک دوسری ہی دنیا میں لے جاتی ہے ۔

(ب) دوسرا پہلو یہ ہے کہ زندگی کا ہر پہلو اصل سے زیادہ خوبصورت اور اصل سے زیادہ اطمینان بخش ہے ۔ 'سحر البیان' کے مناظر بھی اسی دوسری دنیا کے منظر معلوم ہوتے ہیں ۔

(ج) تیسرا پہلو یہ ہے کہ تخیل کی سطح پر تخلیقی قوتوں کے اظہار میں ایک عینی انداز اختیار کیا ہے ۔ داستان گو کے ہاں کچھ

۱ ۔ وحید قریشی (مقالہ) مثنوی سحر البیان ، رسالہ اردو ، کراچی ، اکتوبر

مثالی تصورات ، کچھ ماضی کے کارنامے ، کچھ ذاتی خواہشات کی ترجمانی ہوا کرتی ہے ۔ 'سحر الیہان' بن السطور میں عصری معاشرت کی جھلک رکھتی ہے ۔ ان عصری تفصیلات کے ساتھ ساتھ اعتقادات و نظریات کی وراثت بھی ہے ۔ میر حسن نے اپنے دور کی معاشرتی زندگی کی عکاسی کرتے ہوئے ماحول میں بعض خامیوں کو محسوس کیا اور اس کی ثلاثی تحلیل کی مدد سے کی ۔ میر حسن کے زمانے میں اسن و اسان کی جنس ناباب ہو رہی تھی ۔ ذلی کے غیر مطمئن سماجی حالت نے انسانی زندگی کو غیر محفوظ اور غیر یقینی ہونے کا احساس دلایا ۔ میر حسن کا تحلیل اور مشنوی کے قصے کہانیاں اس کمی کو پورا کرتے ہیں ۔ میر حسن نے اصل زندگی کی تصویر کشی میں زندگی کا معیاری اور مثالی نمونہ بھی سامنے رکھا ۔ میر حسن صرف اپنے دور کی جھلکیاں نہیں دکھاتے ، اپنے معاشرے کے ساتھ ساتھ مثالی تصورات کو بھی پیش کرتے ہیں ۔ وہ بھی بتاتے کہ ان کا ماحول کیسا ہے بلکہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ اسے معیاری شکل میں کیسا ہونا چاہیے ۔ 'سحر الیہان' کا بادشاہ بادشاہت کا مثالی نمونہ ہے اور شہزادہ معیاری شہزادہ ہے ، وزیر زادی غزل و خرد کی معراج ہے ۔ ملک میں کہیں چوری کا ڈر نہیں ، کہیں کوئی خرابی نہیں ۔ روپے کی ریل ریل ہے ، سخاوت کی انتہا ہے ۔ وفاداری کا معیاری نمونہ نجم النساء ہے ، عشق کا معیاری نمونہ ہے نظیر اور بدر منیر ہے ، طوائف کا مکمل روپ عبس باقی ہے ۔

(د) 'سحر الیہان' کا چوتھا پہلو یہ ہے کہ مشنوی کی معاشرتی زندگی بہت بھیل ہوئی نہیں ہے ۔ عصری معاشرت کے تمام مظاہر میر حسن نے پیش نہیں کیے ۔ اپنے دور کی معاشرتی زندگی میں سے انہوں نے صرف ایک طبقے کو منتخب کیا ہے اور باقی

طبقات اسی مرکزی طبقے کے حاشیہ برداروں کے طور پر پیش ہوئے ہیں۔ یہی حاکم طبقہ کہانی کا مرکز و محور ہے۔^۱ 'سحر البیان' اپنے دور کی معاشرت کے صرف ایک پہلو کی عکاس قرار پاتی ہے۔ اس کی اہل (اثر) اتنی وسیع نہیں رہی جتنی پیر وارث شاہ کی، جس میں تمدنی زندگی کا حلقہ میر حسن کی مشنوی سے کہوں زیادہ وسیع ہے۔

آصف الدولہ کے انتقال کے بعد اودھ پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کا سایہ تیزی سے پھیلنے لگا۔ ریاست اقتصادی شکنجے میں کسی دی گئی۔ اس دوسرے دور کے شعراء میں ناسخ کو اہمیت دی گئی۔ اردو شاعری داخلیت اور خارجیت کے استزاج کی بجائے سرعت سے خارجیت کی طرف چلی گئی۔ میر حسن کے زمانے کے لوگ زندگی کی ظاہری چمک دمک کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ نفاس اور خوش سلیقگی کی لذتوں نے فن کی جگہ لہنی شروع کر دی تھی۔ مجلسی آداب اور رسم و رواج کو آرٹ کا درجہ حاصل ہونا چلا گیا۔ زندگی کا براہ راست تجربہ موقوف اور خارجی سپارے زیادہ اہم ہوئے۔ اچھے لفظ و خوش نما ترکیبیں، عمدہ محاورہ و خوبصورت شعر تحریکِ شعری کا سبب ہو گئے۔

(۵)

میر حسن کے زمانے میں شعراء اپنی حقیقی زندگی سے ابھی اتنے اجنبی نہیں ہوئے تھے اور نہ اپنے آپ ہی سے ہراساں ہو کر زندگی کا کوئی مصنوعی بدل تلاش کرنے میں مصروف تھے۔ ابھی تمدنی زندگی اتنی کھوکھلی ابھی نہیں تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ دولت تھی، لیکن اس کے استعمال کا عمدہ مصروف نہ تھا، اس لیے عیش و عشرت ہی کو اصل زندگی سمجھ لینا ممکن تھا۔ 'پر شوکت درباری زندگی، باغات، شادیوں کے مناظر اور طوائفوں کی اہمیت معاشرتی زندگی میں بڑھ گئی۔ عہد شاہی آدابِ معاشرت فیض آباد اور لکھنؤ کے گلی کوچوں میں بکھر گئے۔ اس دور کے عام

۱۔ رضیہ سلطانہ، مشنوی سحر البیان (ایک تہذیبی مطالعہ)، ص ۲۰۸،

ہاشندوں کے لیے بھی یہی جاگیردار گروہ معیاری طبقہ ہو سکتا تھا۔ ساری معاشرتی زندگی اسی کے گرد کھومتی تھی۔ جاگیردارانہ نظام میں سلطنت کا وارث اور اس کے خاندان کا تمدنی درجہ دھاریا کے لیے مثال بنتا ہے۔ ہماری داستانیں، ہماری مشنویاں دربار اور اس کے گرد و بیش کی فضا سے مزین ہیں۔ سحر البیان میں بھی اسی اونچے طبقے کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دربار کی زندگی، امیروں کی زندگی، درباری آداب، یہی اس تمدنی زندگی کے اصل رنگ ہیں اور اس ماحول کا ہر ادنیٰ سے ادنیٰ ملازم بھی اپنے آپ کو اس معیاری سانچے میں ڈھالنے کی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے۔

دراصل 'سحر البیان' میں ایسے معاشرے کی تصویر کشی ہے جسے فراغت حاصل ہے۔ قصے کے تمام کردار اسی آسودہ حالی اور فارغ البالی کے مظہر ہیں۔ ان کے مصائب یا تو ان کے اپنے پیدا کردہ (اور عام عاشقانہ نوعیت کے) ہیں یا بھر عالمِ بالا سے نازل ہوئے ہیں اور اسباب و علل کی کڑیوں کے پابند نہیں۔ عارضی غموں سے ہٹ کر زندگی لذتِ مادی کا وسیلہ ہے۔ مال و دولت عام ہے، شراب ہے، موسیقی ہے، لذتیں ہیں، درباری ٹھانڈے ہیں، جلسے ہیں، جلوس ہیں، شادی ہے، شہنائیاں ہیں، نقیب ہیں، چوہدار ہیں، کھانے یا افراط ہیں، سامانِ آرائش بکثرت ہیں، بالغات کی شوکت اور محلات کا قبیل بھی ہے، خواص، کنیزی، مغلانیاں خدمت کو حاضر ہیں۔ ہرستان میں بھی اودھ کے دربار کا سا جاکو ہے بلکہ دربارِ اودھ کی بو بھو اقل ہے، یعنی جنوں اور برہمنوں کی مملکت میں بھی درباری آداب، رہنے سہنے کے طریقے اور معاشرتی لوازم ملتے ہیں اور وہ بھی عام انسانوں کی طرح سوچنے اور عمل کرتے ہیں۔ غالباً اسی پہلو کے پیش نظر مصحفی نے مشنوی کو "نکار خالہ" جین" قرار دیا تھا اور زندگی کے قریب ہونے کی وجہ سے انہی عناصر نے 'سحر البیان' کو ایک روایت کا درجہ دے دیا ہے۔ 'سحر البیان' کے موسمی لہجے اور السالی زندگی سے قرب ہی کی وجہ سے کچھ سادہ سادہ قویں اس سے منسوب ہو گئیں۔ دورِ دراز کے ملکوں تک اس کے قلمی نسخے لے جائے گئے۔ قارئین کے مختلف طبقوں نے اپنی اپنی ذہنی سطح کے مطابق

۱۔ کوپی ٹائپنگ ڈاکٹر (مقالہ سحر البیان) نقیذی ادب جلد دوم، مرتبہ

میرزا ادیب، طبع لاہور ۱۹۴۵ء

اس سے لطف لیا ۔ مقلدین نے تقلیدیں کیں ، بعض نے جواب لکھے ، کسی نے لٹرکا روپ دیا اور کسی نے ڈرامے کی صورت میں ڈھالا اور ’سحر البیان‘ کی سادہ سی کہانی پر شعلص کے لیے نئی معنویت اختیار کر گئی ۔

(۶)

بدر منیر کی آرائش و زیبائش لکھنؤ اور دلی کے ملے جلے فیشن پر مشتمل ہے ۔ اودھ کے فرمانروا بھی معیار پرست تھے ۔ انہوں نے فیض آباد اور لکھنؤ میں جو لضا قائم کی وہ دلی کے تیموری فرمانرواؤں کے نمونے پر تھی ۔ میر حسن بھی مجبور ہیں کہ سواری کا جلوس ، لوبت ، لغارے ، ماہی مراتب ، سائبان اور دوسرے لوازم اسی ماحول سے اخذ کریں ۔ عیش بائی کا ناک نقشہ لکھنوی طوائف کے عین مطابق ہے ، اس کا راگ رنگ ، رقص و سرود نور بائی کائن کی یاد دلاتا ہے ۔ یہی طوائف اردو شاعری کی روائی محبوبہ تھیں ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ فراغت کی زندگی سے عیاشی پیدا ہوئی ۔ ’سحر البیان‘ کے بے عمل کردار بھی عیاش لوگ ہیں ۔ وہ واقعات کو آگے بڑھانے میں مدد نہیں کرتے ، بلکہ حالات کے دھارے میں بے دست و پا ہیں ۔ بے نظیر دنیا بھر کے علم حاصل کرتا ہے ، بہادر ہے ، عقل مند ہے ، لیکن اس کی زندگی میں جب بھی عمل اور بیش فلسفی کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہماری توقعات کو پورا کرنے سے قاصر رہتا ہے ۔ اس کا باپ بھی قسمت پر شاکر ہے ۔ شہزادے کے گم ہونے پر اسے واویلہ کرنے کے سوا کچھ کام نہیں ، شہزادی بدر منیر عشق و محبت میں صرف رونا دھونا جالتی ہے ۔ غشی کے مسلسل دورے اس کی بے بسی اور بے چارگی کو ظاہر کرتے ہیں ۔

اس طرح کے بے عمل کرداروں کے سہارے پلاٹ کی تعمیر ممکن نہ تھی ، اس لیے میر حسن کو جابجا غیبی سہاروں کی ضرورت محسوس ہوئی ۔ اتفاقات بار بار کہانی میں شریک ہوئے ہیں ۔ کبھی بے نظیر کی عمر بارہ سال سے ایک دن کم ہونے کی وجہ سے کہانی پیچیدہ ہو کر آگے بڑھتی ہے ، ناکہانی طور پر بری کا ورود ہوتا ہے ، بھر گل کا گھوڑا تیسری پیچیدگی پیدا کرتا ہے ۔ اتفاقاً دیو بے نظیر اور بدر منیر کو دیکھ لیتا ہے ، کہانی بھر آگے بڑھنا شروع کر دیتی ہے ۔ نجم النساء اتفاقاً فیروز شاہ سے ملتی ہے ،

اچانک فیروز شاہ کو اس سے عشق ہو جاتا ہے ۔ فیروز شاہ نے نظیر کو بری کی قید سے رہائی دلاتا ہے اور یوں غیبی طاقتیں کہانی کو آگے بڑھاتی چلی جاتی ہیں ۔ جاہلا اتفاقات رونما ہوتے ہیں ، یہاں تک کہ داستان اپنے اہتمام تک جا پہنچتی ہے ۔ یہ عناصر اس دور کی معاشرتی حالت کا بالواسطہ اظہار ہیں ۔ یہ زمانہ سیاسی اور سماجی ہستی کا ہے ۔ خارجی زندگی کی ناکامیوں نے بے عملی کو جنم دے رکھا ہے ۔ ایسی حالت میں کہانی کے کردار بھی عمل اور حرکت سے عاری نظر آتے ہیں ۔

(۷)

کہانی کا ہیرو نے نظیر اردو غزل کا مثالی عاشق ہے ۔ وہ اس نقشے کو پیش نہیں کرتا جس کے مطابق ایک عاشق کو دوسرے عاشق سے اس کے داخل کوائف اور خارجی افکار کی مدد سے الگ کیا جا سکے ۔ وہ تو ایسی مثالی تصویر ہے جہاں عاشق میں ساری دنیا کی خوبیاں جمع ہو جاتی ہیں یعنی وہ معیار ہے جس پر عاشق کو پورا الرٹا چاہیے ۔ وہ حسن میں بے مثال ہے ، ذہانت میں بڑے چڑھ کر ہے ، ہریاں بھی اسے دیکھ کر عاشق ہو جاتی ہیں ، بدر منیر بھی پہلی نظر میں گھائل ہو جاتی ہے ۔ اسے وصل کی لعلت میسر ہوتی ہے ، لیکن زیادہ تر ہجر کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں ۔ وہ وفاداری بشرط استواری کا قائل ہے ۔ محم میں گریباں چاک کرتا ہے ۔ بدر منیر بھی محبوبہ کا مثالی روپ ہے ۔ حسن میں بے مثال ، جلی کٹی ستارے میں تاک ، ہار منگھار کی شائق اور عاشق کو چلانے کے انداز جانتی ہے ۔ ہجر کا صدمہ اسے بھی بے حال کرتا ہے ، لیکن جذبات کی تندہی و تیزی اسے کسی خارجی عمل پر مجبور نہیں کرتی ۔ لکھنوی طوائف کی طرح وہ بھی کھل کھیلنا جانتی ہے ۔ طوائف کا بھی روپ ہیں نجم النساء میں بھی ملتا ہے ، اگرچہ ”نجم النساء“ سحر البیان کا واحد جاندار کردار ہے جس کی حرکت اور عمل قصے کو آگے بڑھانے میں مدد دیتی ہے ۔“

”سحر البیان“ کا بادشاہ چاہے وہ بے نظیر کا باپ ہو ، چاہے مسعود شاہ ہو ، انہی لہجے اور روپ سے بادشاہ معلوم ہوتا ہے ۔ شہزادہ نے نظیر کے

۱ ۔ فہمیدہ شیدا ، میر حسن کی کردار نگاری (تحقیقی مقالہ ایم ۔ اے اردو)

روئے سننے کا طریقہ اور انداز گفتگو شہزادوں کا سا ہے۔ پدر سنیر شہزادیوں کی سی گفتگو کرتی ہے اور اپنی ہمجولیوں سے خصوصاً نجم النساء سے چہلیں کرتے ہوئے لکھنؤ کے اونچے گھرانے کی عورتوں کا روزمرہ بولتی ہے۔ رمال اور نجومی اپنی خاص اصطلاحات استعمال کرتے ہوئے بھی بادشاہ کے دہلے کے سامنے مرعوب ہیں، ہڈتوں کی بول چال اور جوگن ہنسنے وقت نجم النساء کا لہجہ ہندوالہ ہو جاتا ہے۔ نعلیہ طبع کی عورتیں درباری رسم و رواج کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہیں عیش بافی ایک ایسی طوائف ہے جس کے ہر انداز میں بے حیائی اور کھل کھیلنے کا انداز موجود ہے۔ ہریانہ اور جنات بھی مافوق الفطرت طاقت رکھنے کے باوجود اپنے کرداروں میں بہت کچھ انسانی اوصاف رکھتے ہیں۔ نجم النساء وزیر زادی ہے۔ ہاری داستانوں کے معیار کے مطابق عقل و تدبیر کے جملہ محاسن وزیر اور وزیروں کی اولاد کو حاصل ہیں۔ اس کی گفتگو کا انداز شہزادوں کے مرتبے سے ایک درجہ نیچے رہتا ہے۔ اس طرح کہانی کے بنیادی کردار اپنی نوع کی نمائندگی کرتے ہیں۔

(۸)

فنی لفظ سے 'سحر البیان' کا جائزہ لیا جائے تو اس میں میر حسن کی ذہانت پلاٹ کی تشکیل میں بروئے کار آتی ہے۔ پلاٹ کے اجزاء نئے نہیں ہیں، لیکن میر حسن کہانی سننے کے فن سے واقف ہیں اور سننے والے کے لیے دلچسپی کا مسلسل سامان مہیا کرنے کے گر سے بھی آشنا ہیں۔ 'سحر البیان' بڑھتے ہوئے ہاری توجہ کسی بھی کہانی کے بہاؤ سے نہیں ہٹتی۔ واقعات کی کڑیاں باہم مربوط ہیں اور ہاری یہ واقعہ ہر جگہ قائم رہتی ہے کہ اگلے قسم پر کوئی نہ کوئی اہم بات ہونے والی ہے۔ کہانی سلسلہ وار پیچیدگی اختیار کرتی جاتی ہے اور آخر تک پہنچنے پہنچنے میں حسن واقعات کا ایک ایک تار سلجھاتے چلے جاتے ہیں۔ کہانی کے ان اجزاء میں افسانے کی سی تکنیکی بازیکیاں تلاش کرنا مناسب نہ ہوگا، کیونکہ داستان کو نہ افسانہ نگار ہے نہ ناول نویس۔ اس کے ہاں واقعات کی معمولی بے تدبیروں کا ہونا یقینی ہے اور 'سحر البیان' بھی اس سے خالی نہیں ہے۔ داستانوں میں پلاٹ کا محیر العقول ہونا اور سننے والوں کی دلچسپی کو بحال رکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے، اس میں تخیل کی رنگ

آمیزی کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ہلاٹ اور اس تفصیلات ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لیے قصے میں معمولی کوتاہیاں روا رکھی جاتی ہیں اور اس کی تلافی کرداروں کو زندگی کے مطابق بنا کر اور مناظر کو دلکش اور دلنشین دکھا کر کی جاتی ہے۔ میر حسن طبعاً محاکات پسند ہیں۔ موقعے اور محل کے مطابق تصویریں کھینچ کر وہ بڑھنے والے کو کیف و مستی میں ڈبو دیتے ہیں۔ ان کے ہاں پس منظر نکھرا ہوا ہے اور اس میں نور کی چمکا چوند ہے۔ ایک کامیاب فن کار کی طرح وہ وحدتِ نائر کے گر سے واقف ہیں اور شہوانی خواہشات کی ہر اسرار فوتوں سے کہانی کے اجزاء کو ربط و تسلسل عطا کرتے ہیں۔ 'سحر البیان' کے دیو اور پریاں اپنے، ہنسنے بولنے اور سماجی قیود کے اعتبار سے ہماری آپ کی طرح کے انسان ہیں۔ ان کی زندگیاں بھی اسی طرح غوشی اور رنج و غم سے عبارت ہیں جس طرح عام انسان کی۔ ان کی سرشت کا یہ انسانی پہلو جنوں اور پریوں کو ہمارے قریب تر کر دیتا ہے۔

مگر اس بات کو تسلیم کرنے پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے کہ 'سحر البیان' اردو کی چند عظیم مشنوں میں سے ہے۔ اس میں اگرچہ محدود زندگی کی تصویر کشی کی گئی ہے لیکن اپنی محدودیت کے باوجود میر حسن نے جس زندگی کو پیش کیا ہے وہ ہمارے لیے دلچسپی کا وافر سامان مہیا کرتی ہے۔ اس میں جذبات و احساسات کا تنوع، کرداروں کا نازک فریق اور زبان و بیان کے لطیف پیرائے ہیں۔ ہندی، عجمی طریقہ بود و باش کو میر حسن نے ایک ماہر فن کی طرح منعکس کیا ہے۔ مشنوی کی شہرت اور مقبولیت کا راز میر حسن کی اعلیٰ فنی صلاحیت ہے۔

”خوانِ نعمت“۔ ایک محاکمہ

(۱)

”ماہِ نو“ اکتوبر ۱۹۶۳ء کے شمارے میں جناب عبادت بریلوی نے میر حسن کی مثنوی ”خوانِ نعمت“ کو شائع فرمایا ہے اور ابتداء میں ایک تمہید ہے جو غالباً قلم برداشتہ لکھی گئی ہے۔ فاضل محقق نے معاصر مواد کو پیش نظر نہیں رکھا، اس لیے بعض مقامات پر وہ ایسی باتیں لکھ گئے ہیں جو حلیت کے خلاف ہیں۔ مثنوی کا متن ترتیب دیتے وقت بھی قلمی نسخوں کی عباوتوں پر مناسب توجہ نہیں فرمائی گئی جس سے میر حسن کی مثنوی کا متن اصل سے انحراف کر گیا ہے، ذیل میں چند مقامات کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

۱۔ ڈاکٹر صاحب میر حسن کے اجداد کے بارے میں فرماتے ہیں :

”میر اباسی کے بیٹے عزیز اللہ تھے اور ان کے بیٹے میر خاںک تھے جو اپنی فارسی شاعری کے لیے مشہور ہیں۔“

اس جملے کی تردید خود اسی قلمی نسخے سے ہوتی ہے جو فاضل محقق کے پیش نظر ہے۔ اس کے شروع میں میر حسن کا اپنا دریاچہ درج ہے، جس میں اپنے خالدان کے بارے میں میر حسن نے لکھا ہے :

”اصل ابن مؤلف ابن میر غلام حسین ابن میر عزیز اللہ ابن میر برات اللہ ابن میر اباسی بوسوی از شاہجہان آباد است۔“

لذکرہ شعرائے اردو کے مطبوعہ نسخے میں مراتب کی غلطی یا شاید ناقص نسخے کے سبب برات اللہ کا نام رہ گیا ہے۔ دریاچہ دیوان میں شجرہ مکمل طور پر درج ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا دوسرا جملہ بھی محل نظر ہے۔ میر خاںک کو فارسی شاعری میں نہ اس زمانے میں کوئی مقام حاصل تھا نہ اب ہے اور ان

کی شہرت کی نشا بنیاد ان کے غیر مستحیدہ اردو کلام کی وجہ سے ہے جس کا قلمی لہجہ، ہند میں دریافت ہو چکا ہے اور اس کے اقتباسات بھی رسالہ معاصر ہند میں شائع ہوئے تھے۔ میر حسن نے بھی اپنے باپ کی فارسی شاعری کا ذکر نہیں کیا۔ میر شیر علی القسوس (جو میر حسن کے دوست اور ساتھی تھے) دیباچہ شعر البیان میں لکھتے ہیں :

”میر حسن کا دادا سنتے ہیں کہ حاجی و فاضل تھا ، لیکن باپ کو فضیلت نہ تھی ، مگر طالب علمی میں شرح ملا تک پڑھا تھا۔ فارسی استعداد اچھی تھی بلکہ شعر بھی ستین و رنگین کاہے کاہے اس زبان میں کہتا تھا۔ قصیدہ بھی ایک آدھا اس مغفور کا رتبہ وار دیکھا ہے لیکن بزل پر از بسکہ مزاج مرغوب تھا۔ غزل کہنی ترک کی تھی۔“^۱

ظاہر ہے اس سے میر ضاحک کی فارسی شاعری کی مقبولیت کا قیاس کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

۲۔ ڈاکٹر صاحب میر حسن کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ”وہ فیض آباد میں عرصہ دراز تک رہے۔“ میر حسن فیض آباد میں ۱۱۸۵ھ کے لگ بھگ پہنچے اور ۱۱۸۹ھ میں آصف الدولہ جب فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوئے تو سالار جنگ لکھنؤ آئے اور ان کے متوسل میر حسن بھی لکھنؤ چلے آئے۔ وہ عنفوان شباب تک دہلی میں رہے تھے اور ۱۱۸۹ھ سے ۱۲۰۱ھ تک لکھنؤ میں قیام پذیر تھے۔ اس لیے دلی اور لکھنؤ کے قیام کے مقابلے میں فیض آباد میں قیام کی مدت نو برس کے قریب پہنچی ہے اور اسے عرصہ دراز قرار دینا کسی طرح صحیح نہیں تا آنکہ قیام لکھنؤ کو ”دراز تر“ نہ قرار دیا جائے۔

۳۔ فرماتے ہیں :

”میر حسن کی تعلیم و تربیت ان کے والد میر ضاحک کے زیر سایہ ہونی انھوں نے بہت جلد فارسی زبان و ادب میں سہارت حاصل کر لی۔“

میر ضاحک کی اپنی فارسی ذاتی عمل نظر ہے۔ بیٹے نے باپ کی تربیت سے فارسی زبان و ادب میں مہارت حاصل کر لی۔ یہ بات بھی تحقیق طلب ہے کہ میر حسن فارسی زبان اور ادب دونوں میں مہارت رکھتے تھے۔ میر حسن کا دیباچہ دیوان اور تذکرہ شعراء بارے سامنے ہیں۔ اس سے فارسی زبان میں مہارت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ فارسی ادب سے ان کی واقفیت معمولی اور سرسری تھی۔ مہارت والی بات بہر حال مشکوک ہے اور میر حسن نے ”بہت جلد“ مہارت حاصل کر لی ہو اسے کسی معاصر بیان یا شہادت سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ میر حسن ۱۱۵۴ھ کے قریب پیدا ہوئے۔ ان کا دیباچہ دیوان (یہ قیاس غالب) ۱۱۹۲ھ اور تذکرہ ۱۱۸۸ھ تا ۱۱۹۲ھ میں لکھا گیا۔ اس لحاظ سے ان کی فارسی تحریر کے جو نمونے ملتے ہیں وہ ۳۶-۳۷ برس کی عمر کے بعد کے ہیں اور اگر ۱۱۴۰ھ کو تاریخ پیدائش قرار دیا جائے (جیسا کہ آسی مرحوم کا قیاس ہے) تو یہ نمونے ۳۸ برس کی عمر کے بعد کے ہیں۔ ان کی بنیاد پر یہ قیاس کرنا کہ میر حسن نے بہت جلد فارسی میں مہارت حاصل کر لی ہوگی کسی طرح صحیح نہیں۔

۵-۶- لکھتے ہیں :

”ثقابت کو انہوں نے (میر حسن نے) کبھی ہاتھ سے نہیں دیا اور درد و گداز کو وہ کبھی غیر ہاد نہ کہہ سکے۔“

یہ دواںوں ہائیں بھی صحیح نہیں۔ میر حسن کے اسی کلیات میں جو ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب کے پیش نظر ہے۔ وہ ہجو موجود ہے جو سکندر کے خلاف لکھی گئی۔ یہ انتہائی فحش اور رکبہ ہے اور اسے کسی طرح بھی ثقابت کے ذیل میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر صاحب میر حسن کی مثنویات دھڑا دھڑ چھاپ رہے ہیں۔ انہوں نے اس قلمی نسخے میں میر حسن کا وہ کلام بھی دیکھا ہوگا، جس میں نصاب اپنی بیوی سے گفتگو کرتا ہے، حسن کی یہ مثنوی ”ہجو قصائی“ کے عنوان سے برٹش میوزیم کے اسی نسخے میں درج ہے جس پر ڈاکٹر صاحب نے مثنوی خوانہ نعمت کے متن کی بنیاد رکھی ہے۔ ”ثقابت کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا“ کا جملہ اس اعتبار سے صحیح نہیں رہتا۔ ان کا دوسرا دعویٰ بھی حقانی کے خلاف ہے۔ حسن کے کلام کا کم از کم دو تہائی حصہ وہ ہے جس میں درد و گداز سرے

ہے موجود ہیں نہیں۔ صرف ایک تھائی کلام درد و گداز رکھتا ہے۔ اس لیے ”درد و گداز کو کبھی خبریاد نہ کہہ سکتے“ یہی ساقط الاعتبار ہے۔

(۲)

۷۔ ۸۔ فرماتے ہیں :

”(دیوان حسن) کے دو اہم قلمی نسخے موجود ہیں ایک نسخہ نو علی گڑھ کی لٹن لائبریری میں ہے اور دوسرا برٹش میوزیم لندن میں۔ میوزیم کا نسخہ وہی نسخہ ہے جس کا ذکر اسپرنگر نے اپنی فہرست مخطوطات اودہ میں کیا ہے اور جو شاہان اودہ کے کتب خانوں میں رہ چکا ہے۔“

میر حسن کے دیوان کے ۲۴ نسخے معلوم ہیں اور ان میں سے کم از کم بیس نسخے آج تک موجود بھی ہیں۔ نسخوں کی اہمیت کا تعین متون کی درستی اور قدامت تحریر پر منحصر ہے، ذیل میں ان نسخوں کی فہرست دی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ یہ اعتبار قدامت متون محل کا نسخہ (جو ۱۱۹۲ھ کا مکتوبہ ہے) سب سے قدیم ہے۔ اس کے بعد کتب خانہ راسپور کا نسخہ (۱۲۵۳ھ) اور پھر علی گڑھ کے نسخے (۱۲۴۷ھ) ازاں بعد خدا بخش پٹنہ لائبریری (۱۲۵۴ھ) کا نمبر آتا ہے۔ برٹش میوزیم کا نسخہ ۱۲۵۹ھ کا مکتوبہ ہے۔ علاوہ ازیں متن کی صحت کے اعتبار سے بھی مشکوکہ ہے۔ اس لیے اسے اہم نسخوں میں شمار کرنا صحیح نہ ہوگا۔ لٹن لائبریری کے نسخے کا متن بھی ہر جگہ قابل اعتناء نہیں۔ اس کا قیاس ان اقتباسات سے کیا جا سکتا ہے جو محمود فاروقی نے اپنی کتاب ”میر حسن اور ان کے خاندان کے شعراء“ میں اس نسخے سے نقل کیے ہیں۔

۱۔ کلیات حسن خدا بخش لائبریری پٹنہ مکتوبہ ۱۲۵۴ھ

۲۔ کلیات حسن مملوکہ سید محمد عباس چوہدری محلہ لکھنؤ

۳۔ کلیات حسن : کتب خانہ عالیہ راسپور، مکتوبہ

محمد رحیم اللہ خطاط۔ ۱۲۵۳ھ (گفرانیدہ)

فرزند حسن لیبرۃ میراث ۱۹۰۶ء

۴۔ کلیات حسن : کتب خانہ عالیہ راسپور

- ۵ - کلیات : (شمس بریلوی)
- ۶ - کلیات : (نصیر حسین خیال)
- ۷ - کلیات حسن : (حسرت شروانی) مکتوبہ ۱۲۵۶ھ
- ۸ - کلیات حسن : مملوکہ مرزا علی حسن (حسن کا خالاندانی نسخہ)
- ۹ - کلیات حسن : نسخہ عبدالسلام - علی گڑھ قبل از ۱۲۷۰ھ
- ۱۰ - دیوان حسن : نسخہ سبحان اللہ کلکشن علی گڑھ (ناقص الاخر)
- ۱۱ - دیوان حسن : " " "
- ۱۲ - کلیات میر حسن دہلوی : مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مکتوبہ ۱۲۳۷ھ
- ۱۳ - کلیات میر حسن : برٹش میوزیم ۱۲۵۹ھ
- ۱۴ - کلیات میر حسن : (مولوی عبدالحق) ۱۹۴۷ء میں ضائع ہوا
- ۱۵ - کلیات میر حسن : " " "
- ۱۶ - کلیات حسن : مملوکہ عبدالعلیم شیر کوئی
- ۱۷ - دیوان حسن : مملوکہ ذکی الحق پٹنہ
- ۱۸ - دیوان حسن : مملوکہ قاضی عبدالودود
- ۱۹ - دیوان حسن : (سری رام مرتب خطمانہ جاوید)
- ۲۰ - کلیات : بحوالہ سپرنگر
- ۲۱ - کلیات : سوئی محل لکھنؤ بحوالہ سپرنگر (۱۱۹۲ھ کا مکتوبہ)
- ۲۲ - دیوان حسن : کتب خانہ سالار جنگ
- ۲۳ - لخت حسن : (الغالب ۱۳۳۷ھ)
- ۲۴ - دیوان حسن : سالار جنگ ، مکتوبہ ۱۲۳۳ھ

ڈاکٹر صاحب کا یہ بیان بھی درست نہیں کہ برٹش میوزیم کا نسخہ وہی ہے جو شاہان اودہ کے کتاب خانے میں رہا۔ برٹش میوزیم کے نسخے کا مائی کرو فلم میرے سامنے ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نسخہ مذکورہ جارج ہشٹن کے پاس تھا اور ۱۲۵۹ء میں نقل ہوا۔ اس نسخے کا شاہان اودہ کے کتاب خانے سے کوئی تعلق نہیں۔

(۴)

۹۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں :

”میر حسن کی بعض مثنویاں ایسی بھی ہیں جو ابھی تک شائع نہیں ہوئیں۔ ان میں ۱۔ خانہ“ میر حسن ، ۲۔ قصر جواہر ، ۳۔ خوان نعمت خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں۔ خانہ“ میر حسن راقم نے ”انکار“ جولائی ۱۹۶۳ء میں شائع کر دی ہے۔ قصر جواہر ادب لطیف میں شائع ہو رہی ہے۔ خوان نعمت کا متن اب ماہ نو میں پیش کیا جاتا ہے۔“

قصر جواہر ہانکی پور ہشتہ کے نسخوں کی مدد سے قاضی عبدالودود صاحب نے معیار ہشتہ میں دو قسطوں میں شائع کی تھی اور جون و جولائی ۱۹۳۶ء کے پرچوں میں تمام و کمال چھپی تھی۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کا بیان صحیح نہیں کہ ”میں سب سے پہلے اسے شائع کر رہا ہوں“۔ مثنوی خانہ“ میر حسن اگرچہ مکمل طور پر شائع نہیں ہوئی اس کے بعض اجزاء محمود فاروقی کی کتاب ”میر حسن اور ان کے خاندان کے شعراء“ طبع اول (راولپنڈی اور طبع ثانی لاہور) میں پائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں راقم کے تحقیقی مقالے ”میر حسن اور ان زمانہ“ میں بھی درج ہیں۔

۱۰۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں :

”الموس ہے کہ مجھے اس کے (خوان نعمت کے) متن کی نیاری میں علی گڑھ کے نسخے کو دیکھنے کا موقعہ نہیں ملا۔ میں نے صرف میوزیم کے نسخے کو اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ اس لیے بعض عبارتیں اس میں صحیح طور پڑھی نہ جا سکیں اور میں ان کی تصحیح بھی نہ کر سکا۔ پھر یہی اس اشاعت افادیت سے خالی نہیں۔“

ڈاکٹر صاحب کو اقرار ہے کہ مثنوی کا متن صحیح طور پر مرتب نہیں ہوا۔ اور انہوں نے متن میں ان مقامات پر سوالیہ نشان بھی ڈال دیے ہیں جو ان سے حل نہیں ہو سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان اشعار میں اور بھی بہت سی اغلاط ہیں جن پر ڈاکٹر صاحب نے کوئی نشان نہیں کیا۔ اگر تمام غلطیوں کی نشاندہی کی جائے تو مقالہ خاصا طویل ہو جائے گا۔ میں مجلس ترقی ادب کے لیے ”مثنویات میر حسن“ تراجم دے چکا ہوں۔ زیادہ تفصیل ان کے حواشی میں ملے گی۔ فی الحال اس بحث کو چند مثالوں تک محدود رکھوں گا۔

(۴)

مثنوی کے متن کے بارے میں عرض یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ہر جگہ متن ”ایک“ اور حاشیے میں سوالیہ نشان دے کر ”ایک“ کا اندراج کیا ہے۔ اس بارے میں یہ صراحت شاید بے موقع نہ ہوگی کہ تیرھویں صدی تک قلمی نسخوں میں یہ طریقہ رائج رہا ہے کہ ایک، پہاں، تیرا، تیری، میرا، میری اشعار میں ان مقامات پر بھی بشمول یا ی لکھتے تھے جہاں یہ الفاظ بدون یا ی بالذمے کئے تھے۔ لیکن ان الفاظ کو پڑھنے وقت بدون یا (ی) پڑھتے تھے۔ یہی کیفیت ”و“ کی ہے کہ بشمول واؤ لکھ کر بعض اوقات بہ تخفیف واؤ پڑھتے تھے۔ اس لیے متن کی تصحیح میں یا تو جدید املا کو اختیار کرنا چاہیے تھا یا پھر ان الفاظ کو بشمول یا، واؤ لکھ کر ابتداء میں نوٹ دینا کافی تھا۔ ہر جگہ حاشیے پر جدید املا اور سوالیہ نشان کی ضرورت نہ تھی۔

قدیم نسخوں میں پائے معروف اور پائے مجہول کے املا میں پابندی نہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس میں زمانہ حال کے املا کی پابندی کی ہے اور پائے معروف و مجہول کا امتیاز قائم کیا ہے؛ لیکن بعض الفاظ کے معانی نہ جاننے کے سبب وہ غلطیاں کر گئے ہیں؛ مثلاً دریائی کباب کو دریائے کباب بنا گئے ہیں۔ اس طرح کی لاتعداد غلطیوں سے قطع نظر متن میں کئی مقامات پر سوالیہ نشان نہیں دیے۔ ظاہر ہے وہ غلطیاں خود ان سے سرزد ہوئی ہیں۔ ہر شے میوزیم کے نسخے ہیں یہ مذکورہ مقامات صحیح طور پر درج تھے لیکن ڈاکٹر صاحب انہیں پڑھ نہیں سکے اور غلطی کیا گئی ہیں۔ ان اشعار کی صحیح شکل ذیل میں درج کی جاتی ہے :

خطائی اور کجاج اور گاؤدیدے
 رومے کے خشنختے ستھرے^{۱۷} ملیدے ۱۷ شہرے
 ملائی کے ہیمالے اور سکے^{۱۸} ۱۸ ... کے
 زبالوں میں ہیں اب لک جس کے چسکے (ڈاکٹر صاحب بدوا لفظ
 بڑھ نہیں سکے)

دسکتے نقل تھے وہ کورے کورے
 رجھاوے جن کو مصری لے کے ڈورے^{۱۹} ۱۹ دوڑے
 اگر اس وقت نعمت خاں بھی آئے^{۲۰} ۲۰ ہوتے
 تو اک است بنا گلے^{۲۱} کی گلے ۲۱ کھانے کی کھانے
 حسن کے جو سخن سے حظ اٹھاوے
 خدا روز^{۲۲} اس کو یہ نعمت کھلاوے ۲۲ اور
 بقیں ہی جانیو اے میرے غم خوار
 کھارے بن تو دیکھا میں یہ گلزار^{۲۳} ۲۳ گلزار

عبادت صاحب نے بعض الفاظ پر سوالیہ نشان بھی دیے ہیں ، مثلاً
 زیر برائی ، است اور سکے پر علامت استفہام ہے اس کی وجہ سجدہ میں
 نہیں آئی ۔ یہ الفاظ قلمی نسخے میں بالکل صحیح طور پر مذکور ہیں اور
 ان پر کسی شک یا شبہ کی گنجائش نہ تھی اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب
 نے دو شعر بدیں سبب خارج کر دیے ہیں کہ ان میں الفاظ کا املا مشکوک
 تھا حالانکہ ان اشعار پر ذرا سی توجہ ان کو حل کر سکتی تھی ۔ ذیل میں
 یہ دونوں شعر دیے جاتے ہیں :

* یہ شعر امیر اللغات میں است کے ذیل میں اسی طرح درج ہے ۔ میں
 قیاس کرتا ہوں کہ دوسرا مصرعہ یوں ہوگا :

تو اک است بنا گلے کی گلے

** قلمی نسخے میں ذال ہے اور میر حسن ہمیشہ ذال سے لکھتے تھے ۔
 گلزار کی تاریخ بھی الھوں نے ذی ہی کی مدد سے نکالی ہے ۔

جہاں کرم اور ستھرے وہ پہلکے ***
 روں کے جیسے گالے ہلکے ہلکے
 پیالے کھیر کے جون ماہ تاباں
 سہکتے ، جیسے نسروں کا کالستان
 یہ چند مثالیں صرف بشرے از خروارے دی گئی ہیں ۔

مقدمہ: مثنویات میر حسن

(۱)

میر حسن ابن میر غلام حسین ضاحک دہلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے سورت اعلیٰ میر اماسی موسوی بروی شاہجہان کے عہد میں وارد ہند ہوئے اور دلی میں اقامت اختیار کی۔ خاندان کے تفصیلی کوائف معلوم نہیں۔ میر ضاحک ۱۱۱۲ھ کے لگ بھگ دلی میں پیدا ہوئے^۱ بڑل گوئی میں اپنے زمانے میں نام پیدا کیا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے صاحبزادے میر غلام حسن پرانی دلی کے محلے میدواڑے میں ۱۱۵۳ھ کے گرد و پیش عالم وجود میں آئے^۲ ابتدائی حالات کا علم نہیں۔ میر شعر علی الموسوی (کہ ان کا حسن کا مدتوں ساتھ رہا) میر حسن کے ابتدائی حالات کے بارے میں صرف اس قدر بتاتے ہیں کہ حسن دلی ہی میں ’سن ممیز‘ کو پہنچا، یہیں سے موزوں طبع تھا اور شعر کی ’رغبت‘ رکھتا تھا ”اور اکثر خواجہ میر درد کی صحبت سے مستفید ہوا“^۳۔ حسن نے اپنے دیوان کے دیباچے میں ابتدائی کلام میں سے ایک فارسی شعر بھی دیا ہے جس سے ان کی استعداد کا اندازہ ہوتا ہے۔^۴ ابتدائی تربیت میں عربی سے معمولی واقفیت اور فارسی کے گہرے

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ”میر حسن اور ان کا زمانہ“ (وحید قریشی) صفحہ ۱۰۷۔ بعد۔

۲۔ ایضاً صفحہ ۱۹۰ تا ۲۰۲۔

۳۔ ”طبع اس کی موزوں طفولیت سے تھی، شعر کی رغبت رکھتا تھا۔ اکثر خواجہ میر درد کی صحبت سے مستفید شاہجہان آباد میں اکثر لڑکائی کے بیچ ہوا ہے“ (”مثنویات حسن“، دیباچہ، مرتبہ آسی صفحہ ۱۶، ۱۷) نیز ”کلیات حسن“ غزلوں، برٹنی سوزیم، مکتوبہ - ۱۱۲۵۹۔

۴۔ ”میر حسن اور ان کا زمانہ“ (وحید قریشی) صفحہ ۲۰۵۔

لگاؤ کا پتا چلتا ہے لیکن میر حسن کا اصل کمال شاعری کے علاوہ علم مجلس میں سہادت کی صورت میں رونما ہوا۔ مثنوی ”گلزارِ ارم“ سے معلوم ہوتا ہے کہ دلی میں میر حسن زلف گرہ گیر کا اسیر بھی ہوا تھا۔ اس کی نوبت اس وقت آئی جب حسن اپنے باپ کے ہمراہ دہلی سے اودھ کی طرف روانہ ہوا۔ ”تذکرہ شعرائے اردو“ کے بعض اندراجات اور دلی کے عام سیاسی حالات نیز ”گلزارِ ارم“ کی مدد سے میر حسن کے دلی چھوڑنے کا زمانہ یہ قرائن اصح یہ ہے کہ حسن محرم ۱۱۷۹ھ میں دلی سے نکلے، چار ماہ ڈھکے میں قیام کیا، ۱۷ جمادی الاول کو مکن پور میں تھے، اسی ماہ کے آخر میں لکھنؤ گئے، یہاں برسات کڑاری اور جمادی الاول ۱۱۸۰ھ میں یا اس کے بعد فیض آباد میں جا کر رہائش پذیر ہوئے۔ میر حسن اس زمانے میں فیض آباد پہنچے جب نواب شجاع الدولہ وہاں ترقیولہ، لال باغ وغیرہ تعمیر کر چکے تھے۔ ”تذکرہ شعرائے اردو“ کے ایک اندراج سے فیض آباد جانے کا زمانہ محدود کر کے ۱۱۸۰ھ اور ۱۱۸۱ھ کے مابین قرار دیا جا سکتا ہے۔^۲

حسن فیض آباد میں حبیب اللہ برادر زادہ شاہ سجن اور میر ابراہیم سے روابط قریبہ رکھتے تھے۔ میر حبیب اللہ ہی کے کہنے سے الہوں نے فارس کی بجائے اردو شاعری کی طرف توجہ کی۔ اصلاح سخن میر ضیا (شاگرد سودا) سے حاصل کی۔ میر ضیا غالباً ۱۱۸۳ھ میں فیض آباد سے چلے گئے ان کے جانے کے بعد سودا ۱۱۸۶ھ میں فیض آباد آئے۔ سودا اور میر ضاحک کے درمیان ایک ادبی سرکہ انہیں دنوں پیش آیا، یہ غالباً ۱۱۸۶ھ اور ۱۱۸۸ھ کے درمیان کا واقعہ ہے۔^۳ یہ گان غالب اس سے کچھ قبل میر حسن سودا

۱۔ بعد ابراہیم ہونے سلطنت کے شہر مذکور (دہلی) سے مجبور اپنے والد کے ساتھ صوبہ اودھ میں آیا۔ سکونت فیض آباد میں اختیار کی، علاقہ روزگار نواب سالار جنگ بہادر مرحوم کی سرکار میں جہم پہنچایا۔ دیباچہ ”سحر البیان“ مرتبہ آئی صفحہ ۱۷۔

۲۔ ”میر حسن اور ان کا زمانہ“ (وحید قریشی) صفحہ ۲۲۳ تا صفحہ ۲۶۰۔

۳۔ ”میر حسن اور ان کا زمانہ“ (وحید قریشی) صفحہ ۲۷۰ بعد۔

سے اصلاح لینے لگا اور جھگڑے کے فرو ہونے کے بعد پھر حسن کے تعلقات سودا سے استوار ہو گئے۔ میر حسن، شجاع الدولہ کے برادر نسبی نواب سالار جنگ کے زمرہ ملازمین میں تھے۔ ۱۱ صفر ۱۱۸۸ھ اور ۲۳ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ کے مابین حسن نے یہ ملازمت اختیار کی^۱ ان کے سپرد سالار جنگ کے بیٹے نوازش علی خان بھادر سردار جنگ کی مصاحبت تھی۔ اس نوکری ہی کے زمانے میں شجاع الدولہ نے ۲۳/۲۳ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ میں انتقال کیا اور آصف الدولہ اودھ کے نواب ہوئے۔ اسی زمانے میں آصف الدولہ نے مختار الدولہ سید مرتضیٰ خان کو خلعت نیابت عطا کیا^۲ مختار الدولہ نے آصف الدولہ کی ماں اور دادی سے ناراض ہو کر آصف الدولہ کو مشورہ دیا کہ سہندی گھاٹ چلیں^۳ چنانچہ ۱۱ ذی الحجہ ۱۱۸۸ھ کو آصف الدولہ اور اس کا لشکر سہندی گھاٹ چلے گئے۔ آصف الدولہ بیگمات اودھ (ماں اور دادی) سے دہاؤ ڈال کر روپے وصول کرتا رہا اس طرح سہندی گھاٹ پر چار پانچ مہینے لٹ گئے، جب گرمیوں کا خاتمہ ہوا اور برسات آئی تو آصف نے فیض آباد کی بجائے متھرا کا رخ کیا۔ آخر شعبان ۱۱۸۹ھ میں آصف نے دریا عبور کر کے الاوے کا سفر کیا۔ ۲ صفر ۱۱۹۰ھ کو مختار الدولہ قتل ہوا اور اس کے بعد آصف الدولہ لکھنؤ چلا آیا اور اسے اپنا دارالحکومت بنا لیا۔ آصف الدولہ کا ساموں سالار جنگ بھی اس وقت آصف کے ہمراہ تھا اور یہ بھی لکھنؤ چلا آیا۔ میر حسن سالار جنگ کے متوسلین میں سے تھا اس لیے وہ بھی لکھنؤ آ گیا۔ مشنوی "تہنیت عید" سے اس کے لکھنؤ جا کر بس جانے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس طرح گویا

۱۔ حسن کے سودا سے اصلاح لینے کی شہادت افموں نے خود میر حسن کی زبانی بیان کی ہے۔

۲۔ "میر حسن اور ان کا زمانہ" (فحید قریشی) صفحہ ۱۷۲—۲۷۳۔

۳۔ "تاریخ اودھ" (نجم الغنی) جلد سوم صفحہ ۱۵ میں ۲۵ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ میں لیکن "تاریخ فرح بخشی" (انگریزی ترجمہ از ہونے صفحہ ۱۳) میں ہے کہ سات آٹھ دن بعد آصف الدولہ نے دربار کر کے مرتضیٰ خان کو نائب بنایا۔

۴۔ "تاریخ اودھ" (نجم الغنی) صفحہ ۲۹۔

میر حسن ۱۱۸۹ھ کے اواخر یا ۱۱۹۰ھ کے شروع میں لکھنؤ چلے آئے۔ حسن کو سالار جنگ کے ہاں گزر اوقات کے لیے معمولی رقم ملتی ہوگی، اس کی عسرت کا کٹنا یہ ذکر خود اسی کے ”تذکرہ شعرائے اردو“ میں موجود ہے^۱ اور اس کی تائید مرزا علی لطف کے بیان سے بھی ہوتی ہے^۲۔ سالار جنگ کی سرکار سے تعلق غالباً ۱۱۹۶ھ تک بجال و برقرار رہا اس کے بعد کے حالات کا پتا نہیں چلتا۔ یہ زمانہ خود سالار جنگ کے لیے خاصا پریشان کن ہوتا ہے کیونکہ آصف الدولہ کے ہاتھوں اس کی جاگیر کی ضبطی ہو جاتی ہے^۳ تاہم میر شیر علی افسوس کا بیان اسے سالار جنگ سے وابستہ ظاہر کرتا ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ یہ تعلق رسمی سا رہ گیا ہوگا۔ آخری زمانے میں میر حسن کی پریشان حالی کا مفصل ذکر ”تذکرہ مسرت افزا“ کے مرتب نے کیا ہے^۴۔ اس زمانے میں حسن نے دوسرے امرا اور خود آصف الدولہ کے لیے مثنویاں اور قصیدے لکھے۔ اس کی آخری تصنیف ”سحرالبیان“ بھی آصف الدولہ کے نام سے منسوب ہوئی۔ حسن کو اس مثنوی پر بہت العام و اکرام کی توقع تھی لیکن جو ملا اس کی قیمت افسوس کی زبان سے سنئے :

”صلیٰ کا اس کے (”سحرالبیان“ کے) ماجرا یہ ہے کہ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر مرحوم نے ایک دوشالہ خاص اپنے اوڑھنے کا دستہ ہتھ میں سے لٹکوا کر مصنف کو عنایت کیا۔ و تبہ اس کا البتہ بڑھا یہ دل گھٹ گیا۔ اس لیے کہ مطلب دلی حاصل نہ ہوا لیکن کھوٹ صاف طالع کی ہے کیوں کہ مال کھرا، خریدار اتنا بڑا اور سودا خاطر خواہ نہ ہوا بلکہ کھاٹا آیا“

۱۔ ”تذکرہ شعرائے اردو“ صفحہ ۵۴۔

۲۔ ”گشت ہند“ صفحہ ۱۱۸۔

۳۔ ”تاریخ فرخ بخش“ (انگریزی ترجمہ ہونے) جلد دوم صفحہ ۱۲۰۔

۴۔ ”تذکرہ مسرت افزا“ صفحہ ۲۴، ۲۵۔

۵۔ دیباچہ افسوس۔ آبی صفحہ ۱۶۔

”سحرالبیان“ اس کا عمر بھر کا سرمایہ تھا جو ۱۱۹۹ء میں تکمیل کو پہنچا۔ حسن آخر بڑی العجیہ ۱۲۰۰ء کو بیمار پڑے اور غرہ محرم ۱۲۰۱ء کو انتقال کیا اور لکھنؤ ہی میں مفتی گنج میں مرزا قاسم علی خان کے باغ کے چھوڑے دفن ہوئے۔

میر حسن نے اپنے انتقال پر چار بیٹے چھوڑے۔ ان میں سے تین، میر مستحسن خلیق، میر محسن محسن، میر احسن خلیق کے نام یہ طور شاعر عام طور پر معلوم ہیں چوتھے بیٹے سید احسان حسن غفاری کا ذکر مصحفی نے ”ریاض الفصحا“ میں کیا ہے، اغلب یہ ہے کہ یہ حسن کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ خلیق کے بیٹے میر انیس نے مرثیہ گوئی میں جو شہرت حاصل کی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

(۲)

حسن کی اولاد حقیقی کے ساتھ ساتھ اولاد معنوی بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ خصوصاً ”مثنوی سحرالبیان“ نے اس کی شہرت کو عروج تک پہنچا دیا۔ آج دنیا انہیں بھی اسی مثنوی کے خالق کی حیثیت سے جانتی ہے حالانکہ وہ صرف ”سحرالبیان“ کے خالق نہیں بلکہ ایک درجن مثنویوں کے مصنف، غزل اور دیگر اصناف پر مشتمل ایک دیوان کے مالک بھی ہیں۔ انہوں نے ابتدا میں فارسی شاعری کی، لیکن فیض آباد آنے کے بعد ان کی توجہ اردو کی طرف ہو گئی۔ ”دیوان حسن“ اسلوب کے اعتبار سے دو قسم کی چیزوں پر مشتمل ہے، ضیاء کی طرز پر کہیں کئی غزلیں اور سودا، میر، سوز، درد، حسرت کے انداز کی چیزیں۔ گان غالب یہ ہے کہ پہلی طرز کی چیزیں ۱۱۸۶ء سے قبل کہیں گئی ہوں گی اور دوسری طرز کی نویت بعد میں آئی ہوگی۔ ”تذکرہ شعرائے اردو“ کا آغاز ۱۱۸۸ء میں ہوا اور اولین روایت کی تکمیل ۱۱۸۹ء میں۔ اس میں حسن نے اپنی تصانیف میں مثنوی ”رسوز العارفین“ ترکیب بند (واسوخت) اور سات آٹھ ہزار ابیات (دیوان) کا ذکر کیا ہے۔ ۱۱۸۹ء تک حسن کی تخلیقات کا اتنا سرمایہ جمع ہو چکا تھا۔ اسپرنگر کے ہاں ”دیوان حسن“ کے

۱۔ ”ریاض الفصحا“ صفحہ ۳۰۷۔

۲۔ تذکرے میں اضافے ۱۱۹۲ء کے بعد تک ہوتے رہے ہیں۔

دو نسخوں کا ذکر ہے ان میں ایک نسخے کے بارے میں یہ اندراج ملتا ہے :

“An other copy in the same collection without preface, written in a bad hand, with many erasures and corrections, is apparently an autograph. At the end is written in red ink, but it is not certain whether in the same hand

۲۵^۱ ذوالحجہ پنج شنبہ ۱۱۹۲ھ در بنگلہ

گویا میر حسن کا دیوان غزلیات (مع مفرق کلام) ۱۱۹۲ھ تک دیوان کی صورت میں مدون ہو چکا تھا - حسن کے کلیات و دواوین کے کم و بیش ۲۶ قلمی نسخوں کا علم ہو چکا ہے^۲ جن میں ۱۱۸۹ھ کے بعد کا کلام بھی پایا جاتا ہے اور اشعار کی تعداد نو ہزار کے لگ بھگ ہوگی - ۱۱۹۱۲ھ میں دیوان کا کچھ حصہ دیوان میر حسن کے نام سے لوگ کشور پریس سے شائع ہوا - پھر الخطاب سخن کے سلسلے میں حسرت موہانی نے حسن کی غزلیات کا انتخاب شائع کیا (دسمبر ۱۹۱۲ء) - ۱۹۴۳ء میں ”غزلیات میر حسن“ (غیر مطبوعہ) کے عنوان سے میرزا علی حسن نے سرفراز پریس لکھنؤ سے ۸۵ غزلوں کا ایک مجموعہ شائع کیا - مولانا صلاح الدین احمد مرحوم نے حسن کی غزلیات کا ایک مجموعہ پریس میں دیا تھا اور اس کے کچھ قریبے چھپ بھی گئے تھے کہ ان کے انتقال کی وجہ سے کام اذھورا رہ گیا - ہند سے جناب ذکی الحق نے میر حسن کی غزلیات کا متن تیار کیا تھا یہ غالباً ابھی تک شائع نہیں ہوا -

(۴)

”تذکرۃ شعرائے اردو“ اور دیوان کے علاوہ میر حسن کی بارہ مثنویات کا علم ہو چکا ہے - میر حسن کی تمام مثنویات پر مشتمل کوئی مجموعہ ابھی تک شائع نہیں ہوا - مجلس نوح احمدی کی طرف سے اب ”مثنویات حسین“ کو

۱ - ”اودھ کٹالاگ“ متعلقہ صفحات -

۲ - ”نامہ نو“ دسمبر ۱۹۹۵ء مقالہ راقم الحروف (بہ عنوان ”غوانِ نعمت“ - ایک محاکمہ) -

دو جلدوں میں پیش کیا جا رہا ہے۔ پہلی جلد میں گیارہ مثنویاں ہیں۔ دوسری جلد ”سحرالبیان“ اور پہلی اور دوسری جلد کے مکمل حواشی اور استمراعات پر مبنی ہوگی۔ فرہنگ اور اشارے بھی دوسری جلد کے آخر میں درج کیے جائیں گے۔ ”سحرالبیان“ حسن کی تخلیقات میں سب سے آخری تصنیف معلوم ہوتی ہے اگرچہ اس کی تحریر کا زمانہ خاصی مدت پر منحصر ہوگا۔ حسن خود کہتے ہیں :

زہی عمر کی اس کہانی میں صرف
لب ایسے یہ لکھتے ہیں موتی سے حرف
جوانی میں جب ہو گیا ہونہ میں پیر
لب ایسے ہونے ہیں سخن دل پذیر^۱

بالذیل لاہوری کی فہرست غلطوبات کے مراتب کا بیان اگر قبول کیا جائے تو ”سحرالبیان“ ۱۱۹۳ھ میں مکمل ہو چکی تھی^۲ یہ رائے کسی بیان پر قائم کی گئی تھی اس کا حال نہ کھلا۔ شاید سعادت خان ناصر کے ”تذکرۂ خوش معرکہ“ زیبا“ (۱۲۹۱ھ) پر بھروسہ کیا گیا۔ ناصر لکھتے ہیں :

”یہ بھی کیا خوب لطیف ہے کہ جب مرزا رفیع سودا نے وہ مثنوی سنی نہایت خوش ہوئے۔ فرمایا تم نے یہ مثنوی ایسی کہی ہے کہ غلام حسین (ضاحک) کے بیٹے نہیں معلوم ہونے یعنی نضران کے ہو۔“^۳

سودا کا انتقال رجب ۱۱۹۵ھ میں ہوا۔ اس پر اعتبار کیا جائے تو مثنوی ۱۱۹۵ھ تک مکمل ہو چکی تھی۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ ناصر غیر محتاط تذکرہ نگار ہے۔ اس لیے کسی دوسرے بیان کی غیر موجودگی میں اس پر اعتدال مشکل ہے۔ تاہم اس میں کلام نہیں کہ ”سحرالبیان“ کئی برس کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے اس کی تکمیل ۱۱۹۹ھ میں ہوئی اور

۱۔ ”مثنویات حسن“ (مرتبہ آسی) صفحہ ۱۳۲۔

۲۔ بالذیل کٹالاک کالم ۱۲۹۵ نمبر ۲۴۲۶ (۱۹)۔

۳۔ رسالہ ”سب رس“ نومبر، دسمبر ۱۹۵۷ء صفحہ ۱۰۔

اس وقت آصف الدولہ کے حضور میں پیش کی گئی۔ یہ مثنوی حسن کی تخلیقات میں سب سے زیادہ مقبول اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے کمال فن کا قابل قدر نمونہ ہے۔ اس کے ۷۰ شار قلمی نسخے مختلف لائبریریوں میں پائے جاتے ہیں اور کلیات کے اکثر نسخوں میں بھی اس کا متن شامل ہے لیکن اس سے صرف نظر کر کے دیکھا جائے تو راقم الحروف کو اس کے ۵۳ قلمی نسخوں کا علم ہے۔

(۱) کتب خانہ لکھنؤ یونیورسٹی^۱

(۲) ، (۳) ، (۴) ، (۵) ، (۶) باج قلمی نسخے کتب خانہ رضائیہ
دہلی^۲

(۷) سبحان اللہ کلیکشن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ - نسخہ مکتوبہ ۵۱۲۰۶ (بیاض خالق) ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں ”میرے پاس سحر البیان کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۵۱۲۰۶ ہے“^۳ میں یہ بتاتے ہیں قاصر ہوں کہ وہ سبحان اللہ کلیکشن کے نسخے کا حوالہ دے رہے ہیں یا ان کا ذاتی نسخہ ہے جو اسی منہ کا مکتوبہ ہے۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو علی گڑھ کے اس نسخے کے بارے میں لکھتے ہیں :

مثنوی میر حسن دہلوی : یونیورسٹی اردو ادب : ۶۲ ابتدائی اوراق
غائب ، تعداد معلوم نہیں - سطر ۱۵ -

ابتدا :

جہاں فیض سے ان کے ہے کامیاب لبی آفتاب و علی سہاب

ترجمہ :

نسخہ کتاب مثنوی تصنیف میر حسن یہ تاریخ ۱۶ شعبان المعظم ۵۱۲۹۶ مکتوبہ شیو راج سنگھ برائے حاضر داشت لالا مان سنگھ -

۱ - بحوالہ مکتوبہ سید مسعود حسن رشیدی ۱۱ اگست ۱۹۵۳ء -

۲ - عرشی ، ”دستورالقصاحت“ ترجمہ میر حسن -

۳ - ”لکھنؤ کا دبستان شاعری“ صفحہ ۳۵۶ -

(۸) "مثنوی قصہ" لظیر و شہزادی بدر منیر" من تصنیف میر حسن علی (کذا) بہ دستخط ہندہ تارا چند تحریر بہ تاریخ ۲۸ بساکھ ۱۹۱۶ء (ترقیمہ) - یہ مثنوی داستان "سی پتوں" (فارسی) مصنفہ انور میں (جد شاہ) کے ساتھ ایک ہی جلد میں اور اسی قلم سے لکھی ہوئی ہے۔ مملوکہ محمد حسن صاحب صدیقی صاحب ہیڈ ماسٹر ڈی۔ سی۔ ہائی سکول کیکڑ۔ سطحی میں اسلا کے اغلاط بہت زیادہ ہیں۔

(۹) ورق ۶۶ آخری قطعہ ہائے تاریخ درج نہیں ہیں بلکہ تین ورق خالی۔ کاغذ اور رسم الخط سے تیرھویں صدی کے آخر کا نسخہ معلوم ہوتا ہے۔ مملوکہ عبدالمجید گوہر، گوجرانوالہ۔

(۱۰) پنجاب یونیورسٹی لائبریری ui VI 5B میں حسن کی وفات کے ۳۵ سال بعد لکھا گیا۔

(۱۱) پنجاب یونیورسٹی لائبریری ui VI 5 C - ۱۲۷۳ء۔

(۱۲) مکتوبہ ۱۷ رجب ۱۲۳۶ھ علاقہ مالوہ میں لکھی گئی (اللہ آفس کٹالاگ بلوم، پارٹ صفحہ ۷۳)۔

(۱۳) مصور نسخہ سو عدد تصاویر، کاتب دیوبند چند کھنری مکتوبہ ۲۰ اپریل ۱۸۴۱ء (اللہ آفس کٹالاگ بلوم، پارٹ ۷۲)۔

(۱۴) نمبر ۱۳۲۔ کاتب سید رضا حسن، مکتوبہ ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۵۲ھ (ایضاً صفحہ ۷۳)۔

(۱۵) نمبر ۲۲۵ ایک مجموعہ مثنویات جس میں ابتدا سے ورق ۳۰ ب تک "سحر البیان" ہے مکتوبہ دہم ذوالحجہ ۱۲۳۸ھ مطابق ۱۷ جلوس (ایضاً صفحہ ۱۲۳، ۱۲۴)۔

(۱۶) نمبر ۷۰ (ترقیمے میں حسن کو مرحوم لکھا ہے) (برٹش میوزیم کٹالاگ صفحہ ۳۳)۔

(۱۷) ۷۱ اس پر ڈاکٹر Pouhget کی ۱۲۱۲ء کی سہر ہے (ایضاً)۔

(۱۸) یہ خط نستعلیق (ہاڈلین لائبریری کٹالاگ کالم ۲۹۵ نمبر ۲۳۲۶) (۱۹)۔

(۱۹) - سنہ کتابت ۱۲۰۹ھ (کتاب خاتمہ الجہن ترقی اردو کراچی بہ حوالہ مکتوب مولوی عبدالحق صاحب ۲۲ اکتوبر ۱۹۵۶ء) -

(۲۰) ۱۱۹۹ھ (ایضاً) -

(۲۱) - سنہ کتابت درج نہیں - (ایضاً) -

(۲۲) - سنہ کتابت درج نہیں - (ایضاً) -

(۲۳) - مصور نسخہ "بہ دستخط محمد منور شاہ - کتابت ہفتم جادی الثانی ۱۲۳۹ھ در خطہ کشمیر (بہ نسخہ لیٹنل میوزیم کراچی کی ملک ہے) -

(۲۴) - مصور نسخہ عجائب گھر لاہور -

(۲۵) "سحر البیان" مع دیباچہ افسوس - مملوکہ مولوی محمد شفیع صاحب (اور لیٹنل کالج میگزین مئی ۱۹۱۶ء) - اس مصور نسخے کی تصاویر عجائب گھر کے نسخے سے ملتی جلتی ہیں - مفیدہ مصوری کے اصطلاحی دور کی یادگار ہے - رنگوں کی ترتیب میں بے پروائی سے کام لیا ہے شیوہ سکھوں سے مشابہہ ہیں - کل چھ رنگیں تصویریں اور چند خاکے ہیں - ایک دو چمکے خاکے بھی نہیں ہیں صرف خالی جگہوں چھوڑ دی گئی ہیں - تعداد صفحات ۲۳۸ - ترقیہ نامہ تمام ہے - نسخہ لاہور میں لکھا گیا متن بہت حد تک صحیح اور قدیم معلوم ہوتا ہے -

(۲۶) - ناقص الطرغین نمبر ۱۰ آذر کلیکشن پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور -

(۲۷) - نمبر ۱۱ کتاب فتح علی سنہ کتابت ۱۲۶۰ھ آذر کلیکشن - (ایضاً)

(۲۸) - نمبر ۲۱ مجدول سرخ - جدید الخط (ایضاً) -

(۲۹) - نمبر ۲۶ مجدول سرخ - ۵۰ سمت کتاب نا معلوم (ایضاً) -

(۳۰) - نمبر ۷۱ اوراق "بدر منیر" - اے آذر صاحب نے اپنی فہرست میں دیوان میر تقی میر بہ خط مصنف لکھا ہے لیکن یہ "بدر منیر" کے اوراق ہیں - (ایضاً)

(۳۱) - نمبر ۵۱۲ کتاب اقبال علی ۷ صفر ۱۲۸۰ھ شیرانی کلیکشن

پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور (حوالہ فہرست ابوالخیر عبداللہ) -

(۳۱) نمبر ۶۶۳ - تاریخ نداد (ایضاً) -

(۳۲) نمبر ۱۳۰۲ فروری ۱۸۱۷ء - خط بالکشن بہ مقام بنارس (ایضاً) -

(۳۳) ناقص الطرفین باعرب - نمبر ۱۸۶۲ - (ایضاً) -

(۳۴) مکمل نسخہ - اوراق ۹۲ شمارہ ۱۹۸۳ء -

(۳۵) نمبر ۵۱۶۰۲۸ - ۵۱۲۷۷ سے قبل کا نسخہ ”لوہار عشق“ کے ساتھ ایک ہی جلد میں بندھا ہے ۔

(۳۷) نمبر ۶۶ + ۱۳۷ - کاتب میر حسن علی ۱۳ جادی الاول ۱۲۳۳ء بہ مقام حیدر آباد دکن (ایضاً) -

(۳۸) نمبر ۵۱۸۰۷۰ - کاتب غلام حسین ۱۲۲۳ء بہ مقام حیدر (ایضاً)

(۳۹) نمبر ۳۷۳۰۲۲۷ - سنہ کتابت ۱۲۳۹ء (ایضاً) -

(۴۰) (۴۱) (۴۲) کتب خانہ ”آصفیہ حیدر آباد“ میں ”سحرالبیان“ کے دو قلمی نسخے ہیں - ان میں ایک زیادہ قدیم خوش خط مطلا ہے جو ۱۲۰۸ء یعنی مصنف کی وفات کے سات سال بعد لکھا گیا - دوسرا بھی قدیم ہے جو مصنف کی وفات کے اکیس سال بعد ۱۲۲۲ء/۱۸۰۷ء میں بہ مقام برہان پور منکوب ہوا^۲ - (برہان پوری نسخے کے) آخر میں حسب ذیل تاریخی قطعہ ہے - جو مطبوعہ نسخوں میں نہیں پایا جاتا :

۱ - ”تذکرۃ اردو مخطوطات“ جلد اول مرتبہ محی الدین قادری زور - ادارۃ ادبیات حیدر آباد دکن کے کتاب خانے کی فہرست (دکن ۱۳۶۲ء/ ۱۹۴۴ء) -

۲ - اس کے علاوہ ایک نسخہ اور بھی ہے - اس پر سنہ کتابت تحریر نہیں ، لیکن منشی شہر علی الفسوس کا دیباچہ ہے - دیباچہ شروع سے مکمل ہے - لیکن کاتب نے آخر کا کچھ حصہ حذف کر دیا ہے - دیباچے کے خاتمے پر شعر درج ہے :

”بہ بہت غنیمت ہے کرلے وہ کام“

”کہ جس سے رہے نا اہد نیک نام“

مگر صاحب سہر کا نام پڑھا نہیں جاتا البتہ سہر پر ۱۲۳۷ء لکھا ہوا ہے -

ہی مرزا بادل میرے اک آشنا
 یہ قصہ بھلا میرے پاس لا
 کہا اس کو ٹک تم مطالعہ کرو
 کہ اس کے معانی یہ تم دل دھرو
 یہ کہہ کر حسن نے کہانی کہی
 یہی سچ کہ ہے طور اس کی نئی
 کہی اس کی تاریخ یاروں نے مل
 کہ جو تھے وہاں سب کے سب اہل دل
 میان مصحفی و رفیق و شفیق
 کہہ سید حسن کے ہیں دونوں رفیق
 کہا تم کو ہے ذوق تاریخ کا
 کہو خوش ہو تاریخ سے دل مرا
 اس عاصی کو بھی ان کی خاطر عزیز
 ہے خاطر ہے بہتر نہیں کوئی چیز
 جسو یارو اب مجھ سے تاریخ کو
 برائے خدا اس کی ٹک داد دو
 کہ تاریخ تعمیر میں ہے یہ کمال
 وہ غافل جو رکھتا ہے اس کا خیال
 بنائے زکا حسن بدو منیر
 کہ تاریخ قصہ کی ہے بے نظیر
 ہزار آفریں اس کے ناظم کو ہو
 الشہی حسن کو دکھو سرخروا

(کذا)

ان میں سے نسخہ نمبر ۲ اور نمبر ۳ کا ذکر مرثب فہرست
 کتاب خاتمہ آصفیہ نے بھی کیا ہے "علمی نمبر ۱۹۱ - سنہ کتابت ۱۲۲۲ھ

۱ - بنائے زکا کہ الف است آن را دو کند و باقی عدد آن را گرفتہ یعنی
 عدد ز - ک با عدد بے نظیر مخلوط سازد مدعا حاصل شود - یعنی تاریخ
 بر سی آید : ز کا بے نظیر ۱۱۹۹ - (دیباچہ "رسوز العارفین" - طبع
 حیدر آباد صفحہ ۱۸۱۷) -

وقلمنی نمبر ۳۸ ۱۲۷۶ کا قلمی نسخہ ”گلزار نسیم“، ”اندرسبھا“ وغیرہ کے ساتھ ایک جلد میں بندھا ہوا ہے۔^۱

(۳۴) ایک نسخہ ”سحر البیان“۔

(۳۵) کتاب خالدؒ نسید وزیر الحسن عابدی میں ”دیوان سودا“ اور ”مثنوی کلی صنوبر“ کے ساتھ ”سحر البیان“ کا ایک نالغی الآخر نسخہ ایک جلد میں بندھا ہے۔

(۳۶) نمبر ۵ ”سحر البیان“ (قلمی) کتابت ۱۲۱۷ء مصور نسخہ تعداد تصاویر ۳۹۔ دکن سکول فی تصاویر۔ (فہرست حیدر آباد کے عجائب خالدؒ کی اردو قلمی کتابیں از نصیر الدین ہاشمی ”نوائے ادب“ اپریل ۱۹۵۵ء صفحہ ۳۲، ۳۳)۔

(۳۷) نمبر ۶ یہ خط مستطیل دکھنی سکول کی ۵ تصاویر (فہرست حیدر آباد کے عجائب خالدؒ کی اردو قلمی کتابیں از نصیر الدین ہاشمی ”نوائے ادب“ اپریل صفحہ ۳۳)۔

(۳۸) نمبر ۶ یہ خط مستطیل دکھنی سکول کی ۱۰ تصاویر (فہرست حیدر آباد کے عجائب خالدؒ کی اردو قلمی کتابیں از نصیر الدین ہاشمی ”نوائے ادب“ اپریل صفحہ ۳۳)۔

(۳۹) گارمین دتاسی کے کتاب خانے میں ”سحر البیان“ کا ۱۸۹۵ء کا مکتوبہ نسخہ موجود تھا۔

(۴۰) کتاب خالدؒ انجمن ترقی اردو (علی گڑھ) میں ”سحر البیان“ کا ایک نسخہ ہے۔ [نمبر ۳۸/۱۶۵۵۱۳] کاتب غلام محمد خاں بہادر فرزند امام الملک مرحوم و مغفور سال کتابت ۱۲۳۹ء اوراق ۸۰ ابتدا میں نثر اردو کا وہ مقدمہ بھی ہے جو شیر علی انسوس نے لکھا ہے۔ اس کا ابتدائی

۱۔ فہرست کتاب خانہ آصفیہ سرکار عالیہ ۱۳۴۳ء جلد دوم صفحہ ۱۳۹۶

۲۔ اسپر لگر صفحہ ۶۰۹ نمبر ۶۲۵—H۔

۳۔ کتاب خانہ نواب سالار جنگ میں کئی یا تصویر لکھے ہیں۔ (ہاشمی صفحہ ۳۳)۔

۴۔ ”نوائے ادب“ (بمبئی) جنوری ۱۹۵۸ء صفحہ ۳۳۔

ورق موجود نہیں۔ الفاظ مشکول و مضبوط یعنی زیر زیر وغیرہ کا التزام ہے۔ حاشیے پر کاتب نے مندرجہ ذیل مثنوی نقل کی ہے۔ پہلے اور آخری شعر یہ ہیں :

دل سوزاں دے اور دے چشم ہر خم
رکھ ایسی آب و آتش میں سرا دم
الہی عاشقوں کی آہرو رکھ
انہوں کو دو جہاں میں سرخرو رکھ^۱

(۵۰) پنجاب پبلک لائبریری میں نمبر ۱ ط ۱۳۹ (۲) ۸۵۱۰۳۳
مث ، مثنوی میر حسن کرم خوردہ لوح زود اور سرخ رنگوں سے معمول
نستعلیق میں۔ آخر میں ترقیمہ درج ہے۔ کاتب کا نام الہی بخش جو عطر
سنگھ کا متوسل تھا۔ سنہ ہجری ۸۱۲۳۰ درج ہے۔

(۵۱) مثنوی میر حسن دہلوی (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا نسخہ)
ضمیمہ یونیورسٹی اردو ادب : ۲ اوراق ۱۳۷ سطور : ۱۵ - مکتوبہ عبدالستار
حسن دین در ۸۱۲۶۱ - یہ نسخہ مصور ہے ، تصویری معمول۔

(۵۲) مثنوی میر حسن دہلوی (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا نسخہ)
ضمیمہ یونیورسٹی ادب اردو : تعداد اوراق مندرج نہیں سطور : ۹ خوش خط -
پہلا صفحہ ناقص۔ آخری شعر :

معلم اتالیق و منشی ادیب ہر اک فن کے استاد بیٹھے قریب

بہر تصویر بنانے کے لیے جگہ چھوڑ دی گئی ہے۔ نام کاتب وغیرہ
درج نہیں۔

(۵۳) متفرق اوراق (ملوکہ خلیل الرحمان داؤدی) قرائن سے معاصر
نسخہ معلوم ہوتا ہے۔

سحر البیان "مثنویات حسن" کی دوسری جلد میں شامل ہے یہ اشاعت
"سحر البیان" کا اولین مطبوعہ نسخہ تو نہیں لیکن ہمارے متنی کی اہم
خصوصیت یہ ہوگی کہ یہ میر حسن کے اپنے مسودے پر مبنی ہوگا۔ مثنوی

کی لاتعداد اشاعتیں موجود ہیں ان میں ۳۸ اشاعتوں کا حال معلوم ہے
وہو پڑا :

نمبر	سنہ ہجری	سنہ عیسوی	
۱	مشور ترجمہ جہاد	۱۸۰۳ء	اوراق ۵۸ - دتاسی جلد اول صفحہ ۶۰۸ - علی حسینی
۲		۱۸۰۳ء	طبع ثانی ، سائز حروف ٹائپ 4" [ایضاً]
۳	سحرالبیان	۱۸۰۵ء	فورٹ ولیم کالج ایڈیشن - تعداد اوراق ۱۶۶ دتاسی جلد اول صفحہ ۵۲۸ بعد -
۴	"	۱۸۳۳/۱۲۶۰ء	مطبع طبئی ناشر، عبدالہاجد ، "سحرالبیان" مع دیباچہ "افسوس سرناسے پر لکھا ہے کہ یہ مثنوی پانچ دفعہ پہلے ابھی چھپ چکی ہے [دیباچہ "رموزالمعارفین" - سید احمد اللہ قادری صفحہ ۱۶] -
۵	سحرالبیان	۱۸۴۵/۱۲۶۱ء	لکھنؤ - معطفانی پریس - ۱۰۸ صفحات پر صفحہ پر ۲۱ شعر - لیتھو - باڈلین لائبریری کتالاک
۶	"	۱۸۴۶/۱۲۶۲ء	لکھنؤ مسیحائی پریس - لیتھو [ایضاً]
۷	"	۱۸۵۰ء	بمبئی
۸	"	۱۸۵۰ء	دہلی بعنوان بدر منیر [باڈلین کتالاک و دتاسی]
۹	"	۱۸۵۰ء	پیرٹ بعنوان مثنوی میر حسن [ایضاً]

۱۰	"	۱۸۵۳ء/۱۲۶۹ء	کابلور - مطبع جعفری -
۱۱	منثور ترجمہ حسینی	۱۸۹۲ء	طبع ثالث -
			مراتبہ - Lees سائلز حروف 8" [دقاسی جلد اول صفحہ ۶۰۸]
۱۲	سحر البیان	۱۸۹۲ء	کابلور -
۱۳	"	۱۸۹۳ء	آگرہ - دیوناگری حروف میں - سائلز حروف ۸" - [دقاسی جلد اول صفحہ ۵۲۸ بعد] -
۱۴	"	۱۸۹۴ء	لکھنؤ -
۱۵	انگریزی ترجمہ از سی ڈبلیو ہاؤڈلر بیل (C. W. Bowdler Bell)	۱۸۷۱ء	کلکتہ
۱۶	سحر البیان	۱۸۷۳ء	کابلور
۱۷	"	۱۸۷۶ء	میرٹھ
۱۸	"	۱۸۷۸ء	کابلور
۱۹	"	۱۸۷۹ء	میتا پور
۲۰	ڈرائیو سحر البیان (رواق)	۱۸۷۹ء	گجراتی زبان میں - (بالین کٹالاگ)
۲۱	سحر البیان	۱۸۸۲ء	لکھنؤ (نول کشور پریس)
۲۲	انگریزی ترجمہ کورٹ	۱۸۸۹ء	کلکتہ مطبع ثانی - دی ٹرے لطیفہ - ایم - ایچ - کورٹ پبلیشر علی حسینی کی ٹر کا ترجمہ (ضمیمہ کٹالاگ پرنٹس میوزیم صفحہ ۱۲۱)
۲۳	خمسہ باطن	۱۸۹۲ء	
۲۴	انگریزی ترجمہ (کورٹ)	۱۸۹۵ء	
۲۵	" "	۱۹۰۱ء	کلکتہ

۲۶	سحر البیان	۱۹۰۸ء	غزن پریس دہلی
۲۷	"	۱۹۱۸ء	لکھنؤ - فول کشور پریس
۲۸	"	۱۹۲۵ء	"
۲۹	"	۱۹۳۱ء	لکھنؤ - مرتبہ آسی (ترقیمہ) - مطبع ہذا میں بارہویں بار سحر البیان کا نسخہ چھپا
۳۰	"	۱۹۳۳ء	"
۳۱	"	۱۹۲۹ء	مرتبہ حامد اللہ مصر -
۳۲	سحر البیان	۱۹۳۷ء	لکھنؤ - مرتبہ شمس بریلوی
۳۳	"	---	اردو مرکز لاہور
۳۴	"	؟	مطبع مسیحائی شاہدہ دہلی - یہی پر نسخہ مطبع نظامی، واقع کابلور۔ قرآن سے انیسویں صدی کا نسخہ معلوم ہوتا ہے - مستم محمد عبدالرحمان عرف رحمان بخٹی یہ عنوان "سحر البیان" طبع ہوا۔ مطبوعہ نسخہ کے آخری اوراق غائب، تعداد اوراق ۳۶
۳۵	سحر البیان	؟	نسخہ مملوکہ خلیل الرحمان داؤدی ناقص الاول تعداد صفحات ۵۶ مصور نسخہ، مطبع کا نام ندارد آخر میں آغاز حال مصنف کے تحت شیر علی افسوس کے دیا جیسے سے حالات کا خلاصہ دیا ہے صفحہ ۵ پر شاہ عالم کی شہید اور صفحہ ۶ پر آصف الدولہ کی شہید دی ہے۔ جو میر محمد زائر کی "تبصر التورج"

کی طبع ثانی میں درج ہے - عجب
نہیں نول کشور ہریس کی کوئی
اشاعت ہو - (نسخہ مملوکہ
خلیل الرحمان داؤدی) -

۳۶ مثنوی میر حسن ہاتھ تصویر ؟ نول کشور ہریس - سر ورق پر
میر حسن کی تصویر صفحات ۵۲
آخری ورق غائب - پنجاب پبلک
لائبریری نمبر ۸۵۱۶۳۳ مٹ
(تصاویر خلیل الرحمان داؤدی صاحب
کے نسخے سے مختلف ہیں) -

۳۷ " ؟ ؟ در طبع میرٹھ ہریس بہ طبع مزین
مطبوع اطباع اہل جہاں شد -
سر ورق پر میر حسن کی لکھی
تصویر صفحات ۹۶ آغاز میں حال
مصنف مشتمل چار سطروں پر (سینی
پر دیباچہ "شیر علی افسوس" پبلک
لائبریری نمبر پ ۲۳۳۳ - ۳۳ و
۸۵۱ مٹ -

۳۸ مثنوی سحرالبیان ۱۹۵۲ خواجہ بک ڈپو اردو بازار لاہور -
صفحات ۱۳۳ پبلک لائبریری
نمبر ۲۳۳۳ پ ۳۳ و ۸۵۱ سحر -

ان میں سے نسخہ "مثنویات حسن" مرتبہ آس (ناشر : نول کشور
۱۹۳۳ء) "مثنویات میر حسن" (غزون ہریس دہلی ، ۱۹۰۸ء) اور "سحرالبیان"
مرتبہ شمس بریلوی (۱۹۳۷ء) قابل ذکر ہیں -

(م)

پہلی جلد کی گیارہ مثنویوں میں صرف "گلزار ارم" اور "روزالمعارفین"
کے آخر میں سنہ تکمیل درج ہے باقی مثنویوں کی زمانی ترتیب بعض قرائن
اور چند ایک داخلی شہادتوں پر منحصر ہے - "نقل کلاوات" ، "نقل زن فاحشہ"

کا متن لسطہ الف سے تیار کیا گیا ہے اور اس سے قبل یہ مثنویاں کہیں شائع نہیں ہوئیں۔ ان میں بعض ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جنہیں فحش سمجھا جائے گا ایسے الفاظ کے شروع اور آخر کے حروف درج کیے گئے ہیں اور جتنے حرف نظری کیے ہیں اتنے قطعی درمیان میں لگا دیے ہیں۔ یہیں صورت ”نقل قصاب برائے تصدیق مزاج (ہجو قصائی)“ اور ”نقل قصائی“ کی ہے۔ ان دو آخر الذکر مثنویوں کا متن لسطہ الف کے علاوہ شاہ کمال کے تذکرے ”مجمع الانتخاب“ پر منحصر ہے اور یہ چاروں مثنویاں سنہ تکمیل کے اندراج کے بغیر ہیں۔ ہندشوں کی سنی اور دیگر شعری اسقام کی بنا پر انہیں حسن کی ابتدائی کوششیں قرار دینا موزوں معلوم ہوتا ہے۔

حسن کی تصانیف میں ”مثنوی شادی آصف الدولہ“ پہلی قابل ذکر شعری تخلیق ہے جس میں اس کی صلاحیتیں بروئے کار آتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس میں بعض images بلاشبہ ”سحرالبیان“ کا پیش خیمہ نظر آتی ہیں۔ داخلی شواہد سے حسن کی اہم تصانیف میں یہ قدیم ترین شاعر کی جا سکتی ہے۔ اس میں شجاع الدولہ کا ذکر بہ طور زائدہ شخص کے کیا گیا ہے۔ مثنوی کی تقریب شجاع الدولہ کے حین حیات میں آصف الدولہ کی شادی ہے۔ تاریخوں سے رجوع کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ۱۱۸۳ھ میں پیش آیا۔

اس لیے مثنوی کی تحریر کا زمانہ ۱۱۸۳ھ قرار دینا چاہیے۔ مثنوی اس سے قبل مکمل طور پر دو بار شائع ہوئی ہے۔ رسالہ ”معارف“ ہفتہ مارچ ۱۹۳۶ء میں قاضی عبدالودود صاحب نے اسے شائع کیا بعد میں رسالہ ”معارف“ ہفتہ کے حصہ اول میں ”ایک انگریز مستشرق کا سرمد“ کے عنوان سے دوبارہ چھپی۔ اب تیسری بار ژنور طبع سے آراستہ ہو رہی ہے۔

مثنوی شادی آصف الدولہ کے بعد زمانی ترتیب سے مثنوی ”رموز العارفین“ آتی ہے جس میں تکمیل ۱۱۸۸ھ درج ہے :

جب بھرا در معانی سے یہ طشت

تھے ہزار و یکہ صد و ہشتاد و ہشت

ڈاکٹر ابواللہ صدیقی کا خیال ہے کہ مثنوی مکمل طور پر کبھی شائع نہیں ہوئی اس خیال کا اظہار انہوں نے ”معارف“ اکتوبر ۱۹۵۳ء

میں بھی کیا تھا چنانچہ اس کے جواب میں کلب علی خان فائق رام پوری نے رسالہ ”تصویر“ رام پور (جلد نمبر - ۲ فروری ۱۹۴۴ء مقالہ یہ عنوان ”میر حسن کی مثنوی“) میں مندرجہ ذیل اشاعتوں کی اطلاع دی -

(۱) مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۴۶ء -

(۲) مطبع کانپور کا نسخہ جس میں ”مثنوی تصدیق غوثیہ“ ، ”نصہ“ محمود شاہ“ ، ”ہند طاہر“ ، ”اعزاز نامہ“ اور ”نصہ“ شاہ روم“ بھی شامل تھے -

(۳) مطبع کرمی بمبئی ۱۹۳۶ء - ”عبرت نامہ“ - ”تصدیق غوثیہ“ - ”نصہ“ محمود شاہ“ - ”ہند طاہر“ - ”اعزاز نامہ“ اور ”اللہ بس باقی ہوس“ کے ساتھ طبع ہوا - یہ نسخہ دوسرے نسخے کی نقل معلوم ہوتا ہے - چونکہ اشعار دونوں کے مطابق ہیں - ”شعرالہند“ میں جو اشعار مثنوی کے درج ہیں مطبوعہ نسخے میں اس کے خلاف درج ہیں اور اس اختلاف میں دونوں نسخے متفق ہیں -

اس مثنوی کے اور مطبوعہ نسخے بھی ہیں :

(۴) نول کشور پریس سے مولانا عبدالباری آسی نے ”مثنویات میر حسن“ کے زیر عنوان ”محرر البیان“ کے ساتھ اسے بھی شائع کیا -

(۵) حیدر آباد دکن ۱۹۳۵ء میں سید احمد اللہ قادری صاحب نے شائع کی اس ایڈیشن کی کیفیت یہ ہے :

”ذبیحہ“ صفحہ ۱ تا ۲۴ ”ذبیحہ“ اسوس“ صفحہ ۲۴ تا ۲۸ ”تعلیقات“ صفحہ ۲۸ ”باغذ“ صفحہ ۲۹ تا ۳۰ ”رموز العارین“ صفحہ ۱ تا ۱۱ -

(۶) مطبع مجتبیٰ واقع دہلی میں مولوی عبدالواحد کے اہتمام سے

۱ - رسالہ ”تصویر“ صفحہ ۲۴ - ۳۰ -

۲ - بار اول کا ٹوٹ ٹائپل پر ہے -

۳ - ”مثنویات حسن“ ایڈیشن ۱۹۴۴ء صفحہ ۱۹۳ تا ۲۰۳ -

۵۱۳۰۸ میں شائع ہوئی۔ صفحات ۲۴ - سر ورق پر لکھا ہے کہ مع اضافہ حکایات صالحین مناجات ۱ -

(۷) مطبع داسی واقع لکھنؤ میں قطب الدین احمد کے اہتمام سے ماہ جون ۱۸۹۲ء (۵۱۳۰۹) شائع ہوئی۔ نسخہ مطبوعہ جو پیش نظر ہے ناقص الآخر ہے۔ کل ۲۰ صفحے موجود ہیں جن میں مطبع مجبائی کے عین مطابق ہے۔ ہر صفحے پر تعداد اشعار بھی وہی ہے۔ مکمل صورت میں ۲۴ صفحات پر مشتمل ہوگا ۲ -

کلیات میں شامل متون سے قطع نظر ”مثنوی رموز العارفین“ کے دو جداگالہ قلمی نسخوں کا بھی پتا چلتا ہے :

(۱) جدید الخط نسخہ مملوکہ سید احمد اللہ -

(۲) خوش خط مخطوطہ مملوکہ سید محمد حسین ہلکراسی سابق صدر محاسب سرکار عالی - مکتوبہ ۲۱ محرم ۱۲۰۳ھ -

گارسین دتاسی نے قصہ کام روپ کے ساتھ حسن کی ایک اخلاقی نظم کو شائع کیا جس میں اخلاقی خیالات تھے * معلوم نہیں یہ رموز کا کوئی شکڑا تھا یا کسی اور مثنوی کی ابتدائی مناجات -

”مثنوی ہجو در حویلی کہ بر کرایہ گرفتہ بود“ قرآن سے ۱۱۸۹ھ

اور ۱۱۹۰ھ کے قریب قرار دی جا سکتی ہے جب حسن نے سالار جنگ کی معیت میں فیض آباد سے لکھنؤ آکر رہائی اختیار کی - مؤخر خیالات سے معلوم ہوتا ہے کہ فیض آباد میں حسن کا ذاتی مکان محلہ گلاب باڑی میں

۱ - نسخہ مملوکہ خلیل الرحمن داؤدی -

۲ - ایضاً -

۳ - دیباچہ ”رموز العارفین“ (مرتبہ سید احمد اللہ) صفحہ ۲۱ -

۴ - ایضاً -

۵ - ”تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی“ از گارسین دتاسی (بڑبان فرانسیسی)

جلد اول صفحہ ۵۳۸ بعد و ”تہذیبی مقالات“ از گارسین دتاسی

(اردو ترجمہ) صفحہ ۷۶، ۷۷ -

واقعہ تھا۔ اس لیے یہ کرائے کی حویلی جس کی مذمت کی گئی ہے لکھنؤ میں میں ہوگی۔ اسلوب بیان کی پختگی اور محاکات پر قدرت بھی ظاہر کرتی ہے کہ یہ نظم حسن کی ابتدائی مشق کا نتیجہ نہیں بلکہ اس زمانے کی یادگار ہے جب وہ اومشتی کی منزل سے گزر کر کہنہ مشقی کے زمانے میں آچکا تھا۔ اس لیے ”ہجو حویلی“ کو ۱۱۸۹/۱۱۹۰ء کی مثنوی جالنا چاہیے۔ رسالہ ”انکار“ کراچی شماره ۱۵۵ جولائی ۱۹۶۳ء میں پہلی بار مکمل طور پر شائع ہوئی۔ اب اسے دوسری بار پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں میر حسن نے اپنا دہلی سے سفر، ڈہگ اور مکن پور میں قیام، لکھنؤ میں ورود اور پھر فیض آباد میں رہائش کا حال لکھا ہے اور آخر میں اپنے لکھنؤ آکر بس جانے کا ذکر کر کے ۱۱۹۲ء میں اسے ختم کیا ہے۔ یہاں حسن کا بیابانہ انداز لکھ کر گیا ہے اور ”سحرالبیان“ کے فنی خصائص کی اولین جھلک اس میں پورے طور پر نظر آتی ہے۔ مثنوی کی تالیف کا سنہ ”گزار ارم“ کے اعداد سے لگتا ہے اور اس میں شاعر نے اپنے زمانے کے عام رواج کے مطابق گزار کو ”ز“ کی بجائے ”ذ“ سے لکھا ہے اور ”ذ“ کے اعداد ہی سے تاریخ برآمد کی ہے۔ متعلقہ شعر یہ ہے :

ز بس وصف گل و گلشن ہم ہے
سو اس کا نام ”گزار ارم“ ہے

۱۱۹۰ء

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا خیال ہے کہ یہ مثنوی ایک بار شائع ہوئی، یہ درست نہیں۔ کم از کم دو بار یہ مثنوی شائع ہو چکی ہے :

- ۱۔ مخزنِ برہس دہلی (۱۹۰۸ء) ”مثنویات حسن“ کے زیر عنوان ”سحرالبیان“ کے ساتھ شائع ہوئی صفحات ۹-۱۰ تا ۱۶ء۔
- ۲۔ نول کشور برہس سے ۱۹۳۳ء/۱۹۳۵ء میں ”سحرالبیان“ اور ”رموز العارفین“ کے ساتھ شائع ہوئی صفحات ۱۳ تا ۱۶ء۔

”مثنوی در تہیت عید“، ”مثنوی در وصف قصر جواہر“ اور ”خوان نعمت“ تینوں ۱۱۹۹ء کی تخلیقات معلوم ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر ابواللہ صدفی "مثنوی تہیت عید" کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں :

"غالباً ۱۱۹۲ھ کے بعد کی تصانیف ہے ... اس میں جواہر علی (کذا) کی تعریف ہے جو آصف الدولہ کی والدہ ہونیکم کے ناظر اور میر حسن کے خاص محسنوں میں تھی - ۱۱۹۲ھ کے بعد کی قید یوں لگائی گئی ہے کہ "ذکرہ میر حسن" - مذکور میں مکمل ہوا - اس میں میر حسن اپنے صرف دو محسوسوں کا ذکر کرتے ہیں ... بعد کی مثنویوں میں جواہر علی (کذا) کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے اب انہیں کے دامن سے وابستہ ہوں ... مثنوی (مقرر جواہر) ۱۱۹۲ھ اور ۱۱۹۷ھ کے درمیان لکھی گئی"۔

آصف الدولہ اور اس کی والدہ کے تعلقات ۱۱۸۸ھ کے اواخر میں سے کشیدہ ہونے شروع ہو گئے تھے اور انتہائے عروج چٹلش ۱۱۹۶ھ ہے ۔ جب جواہر علی خان اور بہار علی خان گرفتار کر لیے گئے ۔ ۲۰ محرم ۱۱۹۶ھ میں انہیں گرفتار کر کے آصف باغ میں رکھا گیا ۔ ۸ رجب کو دونوں لکھنؤ لے جائے گئے ۔ رمضان ۱۱۹۷ھ میں دونوں امیر ہیں رہے ۔ جب وارن ہسٹنگز بنارس کی طرف آیا تو آصف الدولہ اس سے ملنے کے لیے گیا اور خواجہ سراؤں کو ساتھ لیتا گیا ۔ اس کے بعد آصف کا انداز بدل گیا ۔ وہ خواجہ سراؤں کو واپس بھیجنا ہے اور اب چاہلوسی کا رستہ اختیار کیا جاتا ہے تاکہ ہنگامت اودھ سے جو ہنگام ہوا تھا ٹھیک ہو جائے ۔ اس طرح جواہر علی خان کی مدح کا موع ۱۱۹۸ھ اور ۱۲۰۱ھ کے درمیان نکل سکتا ہے ، اس سے پہلے نہیں ۔ مثنوی تہیت عید کا پہلا شعر ہے :

فلک کی یہ تھا کیج روی سے بعد
کہ دو سال ہو مجھ کو ہنگامے میں عید

۱ - "لکھنؤ کا دبستان شاعری" صفحہ ۱۰۳، ۱۰۴ -

۲ - یہ حوالہ "ذاریج فرح ہنسی" -

۳ - مثنوی ہذا - معیار مئی ۱۹۳۶ء صفحہ ۱۳۳ -

شعر کا مطلب یہ ہے کہ فلک کج رفتار کے ظلم کی وجہ سے (خاصے عرصے سے ؟) فیض آباد میں (مسلل) دو سال عیدیں کرنا (یا پھلے دو سال سے عیدیں کرنا) نصیب نہیں ہوا۔ اس مثنوی میں عبدالغفر کا ذکر ہے جو قمری حساب سے یکم شوال کو ہوا کرتی ہے۔ میر حسن نے فیض آباد میں آکر عید گزاری اور سات دن یہاں قیام کیا۔ آگے چل کر ایک شعر ہے :

ز بس اب کے ساون میں آئی ہے عید
سو ہے یہ گھر بار سال سعید

”اب کے“ اور ”ساون“ قابل غور ہیں۔ یہ ایسی عیدالغفر ہے جو پہلی دفعہ ساون کے مہینے میں آتی ہے۔ تقویم سے رجوع کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن کی زندگی میں ساون کے مہینے میں عیدالغفر پہلی دفعہ یکم شوال ۱۱۹۸ء پنجشنبہ کے دن (۱۲ اگست ۱۷۵۱ء) ہوئی اور پھر ساون کے مہینے میں ۱۱۹۵ء اور ۱۱۹۶ء کو بھی عیدیں ہوتی رہیں ! جب کہ میر حسن ابھی دلی ہی میں تھے۔ ساون کی عیدوں کا دوسرا چکر یکم شوال ۱۱۹۹ء [یک شنبہ] مطابق ۲ اگست ۱۷۸۵ء سے شروع ہوتا ہے۔ دوسری ساون کی عید یکم شوال ۱۲۰۰ء [سہشنبہ] (۱۷ جولائی ۱۷۸۷ء) کو اور تیسری عید ۱۲۰۱ء میں ہوئی ہے۔ ۱۲۰۱ء خارج از بحث ہے کیونکہ میر حسن اس سے پہلے فوت ہو جاتے ہیں۔ ۱۲۰۰ء کی عید اگر لی جائے تو ”اب کے“ کا ٹکڑا بے کار ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہمارے خیال میں یہ مثنوی ”تہنیت عید“ ۱۱۹۹ء میں لکھی گئی۔ اب ایک اور لحاظ سے اسے دیکھنا چاہیے۔ مثنوی ”تہنیت عید“ میں ایک شعر ہے :

بڑا مہر سے سایہ بوترا بہ
کہ برج لند میں گیا آفتاب

جب برج لند میں آفتاب ہو تو ساون کے مہینے میں یہ عید آتی ہے۔ ایسا ممکن ہے کیونکہ ذوق کہتے ہیں (اشعار قصیدہ ہفدہ زبان) :

جب کہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن
آب و ایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

جوش روئیدی' سبزہ بہ یاد آتی ہے
آہستہ آہستہ اللہ نسبتاً حسناً

جس طرح شعلہ کا عالم ہو بہ فالوس خیال
خوف سے یوں ترسے لرزاں ہے عدو وزیر کفن'

"مثنوی در تہیت عید" کو پہلی بار قاضی عبدالودود صاحب نے مرتب کر کے مئی ۱۹۳۶ء میں "معیار" (پشہ) میں شائع کیا۔ "مثنوی در وصف قصر جواہر" بھی اس سے قبل دو قسطوں میں "معیار" (پشہ) میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اسے "ادب لطیف" میں غیر مطبوعہ مثنوی کے طور پر حال ہی میں شائع کیا ہے : لیکن ان کا یہ دعویٰ صحیح نہیں۔

میں حسن آخری زمانے میں مالی لحاظ سے پریشان تھے۔ ان کے آٹا سالار جنگ ان دنوں زیر عتاب اور مالی لحاظ سے پریشان حال تھے۔ اس لیے "سحرالبیان" کا انتساب بھی آصف الدولہ کے نام پر ہوا۔ ان کی شان میں لکھے گئے قصائد بھی ۱۱۱۹ھ ہی کی تخلیقات معلوم ہوتے ہیں۔ مثنوی "خوان نعمت" کو بھی اسی دور کی چیز تسلیم کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اس کا متن ماہ نو اکتوبر ۱۹۶۷ء میں شائع کیا۔

۱۔ "دیوان ذوق" مرتبہ آزاد صفحہ ۳۵۲۔

۲۔ معیار (پشہ) (مئی ۱۹۳۶ء) صفحہ ۱۴۴، ۱۴۵۔

۳۔ معیار (پشہ) (جون جولائی ۱۹۳۶ء) صفحات علی الترتیب ۲۵۱ تا ۲۵۴

اور ۳۰۵ تا ۳۱۰۔

جہاندار شاہ

(۱)

شہزادہ جوان بہت جہان دار شاہ خاندانہ تیموری سے تھے۔ یہ پاک و ہند کے ان معدودے چند خاندانوں سے ہے جس نے رزم و بزم دونوں میدانوں میں داد شجاعت دی۔ کشور کشائی اور انتظامی صلاحیت کے علاوہ علم و فضل کی سرپرستی اور شعر و ادب کا بلند ذوق رکھنے کی وجہ سے تاریخ ادب میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ دودمان تیموری کے فرزندوں نے صرف علم و ادب کی حوصلہ افزائی ہی نہیں کی بلکہ ان میں کئی ایسے جلیل القدر صاحب سیف و قلم ہو گزرے ہیں جن کے کرائے ترکی، فارسی اور اردو میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہابر کی لوزک اور ترکی دیوان اس کی اعلیٰ علمی صلاحیتوں کا ثبوت ہے، ہابوں کی رباعی و نجوم سے واقفیت اور فارسی زبان و ادب میں دسترس کا حالہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ شہزادہ کامران کا فارسی دیوان ادب کے قدردانوں سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ گل بدن یکم کا 'ہابوں نامہ' اپنے دلکش اسلوب اور گراں قدر معلومات کی وجہ سے آج بھی خاصے کی چیز ہے۔ جہاں گیر کی لوزک پاک و ہند کے فارسی سرمائے میں وقیع مقام کی حامل ہے۔ شاہ جہاں کے مکتوبات بھی بیاضوں اور مجموعوں میں ہائے جاتے ہیں۔ دارا شکوہ کی "سراکبر" "سفینہ الاولیاء" اور "سکینہ الاولیاء" کے علاوہ منظوم فارسی کلام کی بھی خاصی مقدار موجود ہے۔ رسالہ "حق نما"، "جمع البحرین" مشنویان بھی اہمیت رکھتی ہیں۔ جہاں آرا یکم کی "سواس ارواح" بھی اس کے اعلیٰ نثری ذوق کی آئینہ دار ہے۔ اورنگ زیب کے خطوط فارسی نثر کے اعلیٰ نمونے شمار کیے جاتے ہیں۔ اس کی صاحب زادی زیب النساء کی منشیات کا ذکر بھی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ سلسلہ تصنیف و تالیف صرف دور عروج تک محدود نہیں بلکہ اورنگ زیب کے بعد بھی مغل فرمان رواؤں نے فارسی اور ترکی ادب کی آبیاری جاری رکھی۔ ان ادیب فرمان رواؤں میں شاہ عالم ثانی کا نام فارسی، ہندی اور اردو شعر و ادب میں اونچا مقام رکھتا ہے۔

ان کا ہندی دیوان "نادرات شاہی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اردو دیوان ناہید ہے لیکن لذکروں میں اشعار ہائے جاتے ہیں۔ فارسی دیوان کے قلمی نسخے بھی بعض کتاب خانوں میں ملتے ہیں۔ "عجائب القصص" (اردو نثر) بھی زیور طبع سے آراستہ ہو گئی ہے اور اس نادرۃ روزگار شاعر اور نثر نگار کے مرتبے کی شاہد ہے۔ یہ سلسلہ تصنیف و تالیف اس کے فرزندوں جہاں دار شاہ اور سلیمان شکوہ پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اختری گورکائی "واقعات اختری" (نثر) اور دیوان ریختہ، مرزا حسن بخت، مرزا فرخندہ بخت جہاں شاہ قمر تخلص، شہزادہ قادر بخش صابر (صاحب "گلستان سخن") — لذکرۃ شعرا) اور ریاضی قادر (دیوان اردو) اور ابو ظفر بہادر شاہ ("کلیات ظفر" چار جلدوں میں) بھی اسی خالوادے کے چشم و چراغ اور شعر و ادب کے متوالے تھے۔ فارسی کا ذوق اس خاندان میں آخر تک قائم رہا۔ ترکی میں سہارت کی داستان ہد شاہ پر آکر ختم ہو گئی۔ اردو شعر و ادب کا زور آخر زمانے میں آکر البتہ بڑھ گیا۔ شاہ عالم اور اس کے فرزندوں نے اردو زبان و ادب کی جو خدمت کی ہے وہ اہل علم سے غنی نہیں۔ جہاں دار شاہ نے بے انتہا مصروف سیاسی زندگی بسر کی، اس کے باوجود اسے اردو شاعری سے لگاؤ تھا اور فارسی میں بھی بندہ نہ تھا۔ اس کا اردو دیوان اگرچہ مختصر ہے لیکن اس سے اس کی شعری صلاحیتوں کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔

(۲)

جہاں دار شاہ کی تاریخ پیدائش کا صحیح طور پر علم نہیں۔ فرینکلن نے ۱۷۷۰ء (۱۱۵۳ھ) کے لک بھگ قرار دی ہے^۱ لیکن اختری نے "واقعات اختری" میں لکھا ہے :

"حاکم بن وقت محمد علی الملت ولد علی السنتہ ابن محمد کام بخش
خلف محمود ترین حضرت غلام مکن را از قید نو محلہ "قلعہ" مبارک
بر آوردہ بادشاہ کردند... چون فوج جنوب یعنی ہماؤ و وسواس راؤ
رسیدند از لوشٹ و خواند و قہائدن جناب ایشان (مرزا بابا)

1. History of Shah Aulum (Franklin) ed. 1798 Page 12.

جہاں جہاندار کی وفات کے وقت اسے ۸۸ ویں سال میں بتایا گیا ہے۔

جنوبیان مسطور شاہ جہان ثانی (عی الملت) را دستگیر نموده باز بہ قلعہ مبارک در لو محلہ دستور قید نموده و پیرزا جوان بخت جہان دار شاہ موصوف و مغفور کلان پسر بادشاہ جمجاء را کہ ہفت ہشت سالہ عمر داشتند معہ جناب ایشان باز از لو محلہ مسطور پر آورده از طرف شاہ عالم بادشاہ کہ در آن زمان در بلدۃ الہ آباد محیم سرادقات دولت علیا بود، ولی عہد نموده و نواب زینت محل مادر علاقہ بادشاہ را در محل معلول سردار و بختاور خان... را ناظر کل گردانیدہ بر ڈیوڑھی بادشاہی و سلاطین و بیگات مختار ذی اقتدار و بہ جناب ایشان ولی عہد بہادر را سپردہ نموده^۱۔

۱۱۵۳ھ/۱۷۶۱ء میں اگر جہان دار شاہ سات آٹھ برس کے تھے تو ان کی پیدائش ۱۱۶۶ھ کے گرد و بیش شار ہونی چاہیے۔ امتیاز علی خاں عرشی تقریباً ۱۱۶۲ھ/۱۷۵۹ء قرار دیتے ہیں^۲ جہاں دار کے والد عالی گویر (شاہ عالم) ۱۷ ذی قعدہ ۱۱۶۰ھ میں اس وقت پیدا ہوئے تھے جب ان کے والد عزیزالدین (عالم گیر ثانی) فرخ میر کی قید میں تھے اور ۱۰ شعبان ۱۱۶۷ھ - ۲ - جون ۱۷۵۳ء کو جب عہد الملک نے عزیزالدین کو عالم گیر ثانی کے لقب سے تخت نشین کیا تو انہیں بھی رہائی حاصل ہوئی۔ اس طرح گویا جہاں دار کی پیدائش کا زمانہ نظر بندی کا دور ہی ہے۔ ان بیانات میں فرینکلن کا دہا ہوا سنہ مشکوک نظر آتا ہے۔ جہاں دار کی پیدائش کے سلسلے میں تین دلائل کو سامنے رکھنا ضروری ہے^۳:

۱۔ "واقعات افطری"، افطری، قلمی، پنجاب پبلک لائبریری، لاہور۔ ورق ۹۶ الف۔

۲۔ "تادرات شاہی" (شاہ عالم) مرتبہ عرشی، دیباچہ صفحہ ۵۰۔

۳۔ ایک فریتہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ۱۱۷۰ھ میں جہاں دار اتنی عمر کے تھے کہ باپ سے الگ سوتیل دادی کے پاس رہ سکیں لیکن یہ دلیل اس لیے باطل ہے کہ نواب زینت محل کی کوئی اولاد فریتہ نہ تھی اور الہوں نے جہاں دار شاہ کو اس کی پیدائش پر ہی گود لے لیا تھا، دیکھیے "واقعات افطری" ورق ۹۶ الف۔

۱۔ ۱۷۱۳ء میں جب الہیہ احمد شاہ ابدال نے ولی عہد سلطنت مقرر کیا تو لیجوری شہزادے مرزا بابا (محمد علاء الدولہ بہادر) ان کے معین و مددگار تھے۔ جہاں دار کی کم عمری کے سبب مرزا بابا کو لوگوں نے مشورہ دیا تھا کہ آپ خود حکومت پر قابض ہو جائیں۔ اس لیے اس وقت شہزادے کی عمر شعور کی حد میں نہ ہونی چاہیے۔

۲۔ جہاں دار شاہ اپنے باپ شاہ عالم کی اودھ سے واپسی (۱۱۸۵ھ) پر مرزا بابا کی لڑکی سے بیاہے گئے۔ اس وقت وہ اس عمر کو پہنچے تھے کہ ان کی شادی کر دی جائے۔

۳۔ جہاں دار نے ۱۲۰۱ھ میں انتقال کیا۔ ”طبقات الشعراء“ (شوق) میں ان کا ذکر بصیغہ ماضی درج ہے لیکن انہیں جوانا مرگ بتایا گیا ہے۔ ”عمدۃ المتغلبہ“ کے مؤلف نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ عشق نے یہ صراحت لکھا ہے کہ آغاز جوانی میں انتقال کیا۔ اس لحاظ سے انتقال کے وقت ان کی عمر بھر حال چالیس برس سے کم شمار ہونی چاہیے۔

اس استدلال کی روشنی میں فرینکلن کی بیان کردہ تاریخ قابل قبول نہیں۔ عجیب بات ہے کہ عبدالعلی نے ایک طرف تو فرینکلن کا بیان کردہ سنہ پیدائش اختیار کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ جہاں دار کی ابتدائی تعلیم و تربیت اعلیٰ درجے کی ہوئی تھی۔ حالانکہ قید و بند میں اعلیٰ تعلیم یا تربیت کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا اور جہاں دار کی خاطرخواہ تعلیم و تعلم کی نوبت حراست کے مصائب سے نکل کر ہی آئی ہوگی۔

انتقال کے وقت جہاں دار کی عمر ۳ برس ہی فرض کی جائے تو پیدائش ۱۱۹۱ھ کے گرد و پیش ہونی چاہیے۔ ۱۱۷۰ھ میں (عمر ۱۱ برس) ۱۱۷۵ھ

۱۔ ”لادرات شاہی“ ’عربی‘ دیباچہ۔

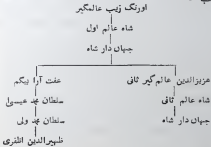
۲۔ ”طبقات الشعراء“، ترجمہ ۱۵۲۔

۳۔ اقتباسات آگے مناسب مقام پر درج ہے۔

میں ۱۵ برس اور ۵۱۸۵ میں ۲۶ برس ہو جاتی ہے ۔ یہ ظاہر جناب امتیاز علی خان عرشی کا ۵۱۹۶ء کا قیاس قابل قبول نظر آتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ جہان دار کے باپ کی واپسی کے انتظار میں ان کی شادی اپنے زمانے کے عام دستور کے خلاف بڑی عمر میں جا کر ہوئی ۔

انفیری کے بیان کی روشنی میں جہان دار ۵۱۹۶ء کے قریب پیدا ہوئے ہوں تو اس لحاظ سے وہ ۵۱۷۰ء میں چار یا پنج برس کے ، ۵۱۷۳ء میں سات آٹھ کے اور ۵۱۸۵ء میں انیس بیس برس کے قرار دیے جا سکتے ہیں ۔ انیس بیس برس کی عمر شادی کے لیے زیادہ موزوں دکھائی دیتی ہے اس لیے قرائن کی رو سے انفیری کی بیان کردہ عمر کا اندازہ صحیح نظر آتا ہے اور ہمارے دلائل سے ہم آہنگ ۔ انفیری کا بیان یوں بھی معاصر ہونے کی وجہ سے اہمیت رکھتا ہے ، دوسرے اس کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہو جاتی ہے کہ انفیری تیموری خانوادے ہی سے تھا ۔

وہ خود جہان دار شاہ سے قریبی تعلق رکھتا تھا ۔ اس کے خالداں کا شجرہ یہ ہے ^۱ ۔



۱ ۔ "انفیری گورکائی اور ان کا ریختہ کلام" (سید علی عباس) صفحہ ۱۵
 "صبح وطن اعظم" (اعظم) کے تذکرے میں غلطی سے دلی سے ان کا
 سال ۵۱۲۱۲ لکھا ہے (صفحہ ۳۵) لیکن وہ صحیح نہیں ۔

اس طرح جہاں دار شاہ پسر شاہ عالم ثانی سے انظری کا خاندانی سلسلہ جہاں دار شاہ پسر شاہ عالم اول پر جا کر مل جاتا ہے۔ انظری کے والد ان تیموری شہزادوں میں سے تھے جنہوں نے نظر بندی میں زندگی کاٹی۔ انظری بھی پیدائش (۱۱۷۷ھ) سے ۱۲۰۲ھ تک قلعے کے اندر نظر بند رہے تاہم ان کی وہ اطلاعات بھی جو اس کی پیدائش سے قبل کے واقعات سے متعلق ہیں، یقیناً معتبر خاندانی روایات پر مبنی ہوں گی۔ اس لیے انظری کا تھیمہ "عمر قابل تسلیم ہے اور جہاں دار کی پیدائش ۱۱۶۶ھ کے لگ بھگ قرار دینی چاہیے۔ شاہ عالم نے ایک دوڑے میں جہاں دار کی سال گرہ کا ذکر کیا ہے جو یہ ہے :

آج بھئی اے بھلی برس کاٹھ جہاں دار شاہ پیارے کی
ساتھ سکھی مل بن بن آؤ، دیو مبارک باد اللہ نستارے کی^۱

(۳)

جہاں دار کی ابتدائی تعلیم محصور "سلاطین" کے طور پر ہوتی تھی جس میں عربی فارسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم شامل ہوگی۔ اس کے علمی اوصاف و کمالات فن کے بارے میں تذکرہ نگاروں کے بیانات یہ ہیں :

جوانے بود مجمع قابلیت و اہلیت ، منبع سخاوت و شجاعت ،
مخزن مروت ، معدن فنوت ، جامع جمیع اوصاف سلطانی ،
فردان کمالات انسانی ، خصوصاً دریائے حلم و شجاعت ، کوہے
بود مستحکم ، چنانچہ بعضے اعزاء کہ از مصاحبان آن والا
جاء بودند ، نقل می کردند کہ از قلعہ شاہ جہاں آباد بہ سبب
خشکی از پدر بزرگوار کھند انداختہ بیرون آمدہ ، و بہ کوچ
متواتر دو لکھنؤ رسید ، روزے با جمعیت بسیار برائے شکار رفتہ

۱۔ ایضاً ص ۱۶ ، ۲۶۔

۲۔ "تذارات شاہی" ص ۹۲۔

۳۔ اصطلاح میں سلاطین آس شہزادے کو کہتے تھے جو قلعہ معلول میں نظر بند ہوتا تھا (اس کی جمع "سلاطینوں" ہے)۔

بود که ناگاه در محرا لیل صحرایی بر آن شهزاده جوان بخت
حمله کرده خواست که در خرطوم گرفته از جا برد که ناگاه
آن رستم دستان حمله دلاوران نموده شمشیر بر مستک لیل
زد ، و از زخم تنگ آن را پلاک ساخت که باعث تعجب وزیر
و غیره [و دیگر ؟] افکار گیان شد - بسیار عالی حوصله و اولوالعزم
بود . جنت ذهن و جودت طبع و فهم رما و فکر بیبا دانت و
اشعار فارسی و هندی بر دو را موزون است ^۱ -

مرشد زاده آفاق جهان دار شاه که جهان دار تخلص می فرمایند ،
در جمیع فنون بگانه روزگار و وحید زمانه است - بمقتضای
موزونی طبع فکر شعر هندی و فارسی چنانچه باید می کند ^۲ -

جهان دار تخلص شاه زاده ولی عهد خورشید رکاب صاحب عالم
خطاب که از بی غلو همت و سمو منزلت مرثیه عالی جای
خود را باوج افلاک رسانیده و دست و دربارش هنگامه ابر
لیسان را سرد ساخته و وصف ایلغنائی مزاج که خاصه پادشاهان
است خود را به کسب علم و هنر معروف داشته و کالات بسیار
در ذات با یرکاتش جمع آورده ، مع هذا بمقتضای موزونی طبع
گاه گاهی شعر هندی و فارسی نیز می فرماید ^۳ -

جهان دار تخلص ، نام گرمی جهان دار شاه ، زینت دولت مستند
جهان بانی خلف شاه عالم پادشاه جنت آرام گاه این عالم گیر
ثانی ^۴ -

جهان دار تخلص ، پادشاه زاده ولی عهد مرزا جوان بخت مرحوم ،
فخر دودمان آیهت و حشمت ، کارکشای اسور سلطنت ، کیوان
مکون ، شتری منزلت ، مرشد زاده بلند همت ، تاج به تارک

۱ - "طبقات الشعراء" ترجمه ، ۱۵۶ -

۲ - "نقد ثریا" (مصحفی) صفحه ۲۰ -

۳ - "تذکره هندی" (مصحفی) صفحه ۶۱ -

۴ - "دیوان جهان" (بینی قرائن جهان) صفحه ۶۱ -

شوکت ، صاحب عالم و عالمیان ، سخن ور لکھ پرور کہ شرح
حشمی بیرون از تحریر منشیان عطارہ رقم است ، باوجود ولور
شان جهان داری ، بہ کمال علم و ہنر آراستہ بود و اکثر
اوقات شعر ریختہ موزون می فرمود ۔ تعریف اشعار گہر نثارش
خارج از بیان ۔ حد افسوس کہ آن ذوق التاج تیموریہ در عین
شباب این جهان فانی را وداع نمودہ ، ساکن اعلیٰ علین گردید^۱۔

جہان دار تخلص ، میرزا جوان بخت جہان دار شاہ نام ، خورشید
آبیان بلند اختری اور سرفرازی کا ، ولی عہد شاہ عالم بادشاہ
غازی کا ، رواقی دینے والا بارگاہ جہان داری و جہان بانی کو ،
زینت بخشنے والا مسند ملک گیری اور کشور ستانی کو ، ہر خط
چین جہان افروز کا اس کے واسطے روشن کرنے عالم کے ،
مانند خطوط شعاعی آفتاب کے ، دور کرنے والا تاریکیِ فلاکت
کا تھا اور دست دریا نوال اس کا افراطِ جود و کرم سے مانند
ید بیضا کے ، روشن کرنے والا خوش ناموسی اسارت و ایالت
کا ، بخشش نے اس کی دشمنی آبیان کے دل سے قلع زدوں کے
لنگالی اور ہمت نے اس کی گرہ بدطالعی کی پیشانی سے بدبختوں
کی کھول ڈالی^۲۔

جہان دار تخلص مرزا جہان دار شاہ عرف مرزا جوان بخت بہادر
فی عہد شاہ عالم بادشاہ^۳۔

مرشد زادۃ عالی تبار ، مرزا جوان بخت المتخلص بلقب جہان دار ،
ولی عہد شاہ عالم بادشاہ غازی ، جوانیِ خجستہ منظر ، فلک
افسر ، عیاش مزاج بود ۔ در شہر مجد آباد عرف بنامس بہ کمال
عیش و عشرت اوقات بہایوں صرف می نمود ۔ گاہ گاہ مطلقے و
غزلے بہ حسب اتفاق از طبع وقادش جلوہ افروز می گردید ۔

۱ - "عمدۃ منتخبہ" (سرور) صفحہ ۱۷۷ ، ۱۷۸ -

۲ - "گلشن ہند" (الطیب) صفحہ ۸۸ ، ۸۹ -

۳ - "سخن شعرا" (نساخ) صفحہ ۱۱۸ -

لاکھ در عین آغاز جوانی سریر جنت را زیب و زینت بخشید^۱ -
 جهان دار - مرزا (شاہزادہ) جوان بخت جهان دار شاہ ، ولد
 شہنشاہ شاہ عالم^۲ -

جہان دار - تخلص حسین یور خلاف شاہزادہ ولی عہد مرزا
 جہان دار شاہ مرحوم المعروف مرزا جوان بخت است - از آنجا
 کہ تعریف اخلاق حمیدہ آن بر گزیدہ انفس و آفاق و توصیف
 اوصاف پسندیدہ آن منظور نظر خلاق علی الاطلاق محیطہ^۳ تقریر
 و لحاظہ^۴ تحریر نمی گنجد ، عنان کعبت قلم حنائی رقم را ازانی
 جولانگاہ منقطع ساختہ بمیدان حرر تہذیب از اشعار آب دار
 کد از طبع وفاد آن خلاصہ دودمان گورگانی و زبدہ خاندان
 صاحب قرانی سر زدہ جولان می دہم - از شیرین گفتاری^۵ ہائے
 جناب ایشان این نہ شعر کہ بہ من رسیدہ بملک ترویم
 کشیدہ^۶ -

مرزا جہان دار شاہ عرف مرزا جوان بخت بہادر ولی عہد حضرت
 شاہ عالم بادشاہ مرشد زادہ فہم و فراست اور عقل و دانائی میں
 یکتائے روزگار تھے^۷ -

جہان دار ، میرزا جوان بخت قرۃ العین عالی گوہر شاہ عالم
 بادشاہ دہلی مستجمع بھامد و مناقب بہار بود^۸ -

-
- ۱ - " تذکرۂ عشق " (عشق عظیم آبادی) در " دو تذکرے " مرتبہ
 کلیم الدین احمد صفحہ ۱۷۹ -
 - ۲ - " یادگار شعرا " (اردو ترجمہ انپرنلگر اودہ کٹالاگ ؛ مطبعہ احمد)
 صفحہ ۶۶ -
 - ۳ - " مجموعہ " لغز " صفحہ ۱۷۶ -
 - ۴ - " گلشن بے خار " (شیفہ) ، اردو ترجمہ از احسان الحق فاروقی
 صفحہ ۱۶۲ -
 - ۵ - " روز روشن " (نواب صدیق حسن) صفحہ ۱۵۸ -

فرینکلن نے جہاں دار شاہ کے کردار کا جائزہ ان الفاظ میں لیا ہے :

Mirza Jawaun Bukht Jehaundar Shah, though from capacity not fitted for the busy scenes of active life, nor possessing any talents for government, was nevertheless irreproachable in his private character, and deemed by all an accomplished gentleman. To his friends he was constant and to his dependants humane and benevolent. His domestic qualities and filial piety have been already exhibited to the world by testimony the most respectable : and in his disposition he possessed, in an eminent degree, that characteristic amiability, which successive historians have unanimously attributed to the princes of the house of Timoor.¹

(جہاں دار) کو موسیقی سے دل چسپی تھی، اس کے علاوہ ریاضی کا ماہر تھا۔^۲

شاہزادہ جہاں دار شاہ بہت بذلہ صبح، ظریف اور شوخ طبع تھا۔ اس کے اردو اشعار میں بڑی شوخی تھی، موسیقی سے بھی ذوق رکھتا تھا۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں جہاں دار تخلص کرتا تھا۔^۳

ان بیانات سے جہاں دار کی شخصیت پر کچھ روشنی بڑی ہے لیکن اس کی تعلیم و تربیت کا حال نہیں کہلنا۔ آخری دونوں اقتباس ”واقعات اظہری“ سے ماخوذ ہیں۔ واقعات میں جہاں دار کے بارے میں لکھا ہے :

”ابن بادشاہ زادہ بسیار حریف و ظریف و شوخ طبع و رنگین

1. The History of the reign of Shah Aulum (Franklin) p. 162.

۲۔ ”اظہری گورکھی اور ان کا رشتہ کلام“ (مید علی عباس) صفحہ ۴۵۔

۳۔ ”ہزم تیموریہ“ (مباح الدین عبدالرحمان) صفحہ ۲۲۹۔

مزاج بود و ریشہ شوخ گفتی و در لن موسیقی نیز ذائقہ داشت
و در ریشہ و محزل فارسی جہاں دار تخلص می نمودند“

جہاں دار کی تعلیم میں اردو فارسی شاعری ، موسیقی اور ریاضی کا خصوصی ذکر ہوا ہے ۔ موسیقی سے قطع نظر فارسی اردو کی تعلیم مولوی نظام الدین دہلوی سے حاصل کی ۔ مولوی نظام الدین اس زمانے کے علما میں شمار ہوتے تھے لیکن اپنے زمانے کی کوئی جید ہستی معلوم نہیں ہوئے ، کیونکہ علما کے تذکرے ان کے ذکر سے خالی ہیں ۔ تاہم یہ کیا کم اہم بات ہے کہ وہ خالوائۃ شیخ عبدالحق محدث کے فرد تھے ۔ ”حیات عبدالحق محدث دہلوی“ میں پروفیسر خلیق احمد نظامی نے پورا شجرۂ نسب دیا ہے ”شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے خاندان کا شجرۂ نسب معاصر موصوف کی کتاب سے لے کر اگلے صفحے پر درج کیا جاتا ہے تا کہ مولوی نظام الدین دہلوی کے حسب نسب کے بارے میں معلوم ہو سکے ۔

نظام الدین بن محب اللہ بن نور الحق ثانی بن محب اللہ بن شیخ نور اللہ بن شیخ نور الحق بن شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی کسی تالیف یا تصنیف کا ہمیں علم نہیں لیکن ان کے براہ راست سلسلے میں کئی بزرگ صاحب تصنیف ہوئے ہیں ۔ شاہ عبدالحق محدث کے فرزند شیخ نور الحق مشرق کی بارہ کتابیں ہیں ۔ ان کے فرزند شیخ محب اللہ (اول) ”منہج العلم“ (ترجمہ ”صحیح مسلم“) کے مصنف ہیں ۔ ان کے فرزند نور الحق ثانی ”شرح مائت بالسنتہ“ کے مصنف ہیں ۔ ان کی یہ کتاب شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی عربی تصنیف ”مائت بالسنتہ“ کی فارسی شرح ہے ”نظام الدین اتہی نور الحق ثانی کے ہوتے تھے ۔ یہ اول جہاں دار کے اتالیق ، استاد اور بعدہ کار خالوں کے منتظم رہے ۔ جب جہاں دار دہلی سے اودھ اور پھر

۱ ۔ واقعات اطہری (اطہری) : قلمی ، پنجاب پبلک لائبریری ، ورق ۵۱ الف ۔

۲ ۔ ”قادات شاہی“ ، دیباچہ صفحہ ۵۰ ۔

۳ ۔ ”حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی“ (خلیق احمد نظامی) صفحہ ۲۵۵ ۔

۴ ۔ ایضاً صفحہ ۲۹۵ ۔

۵ ۔ ایضاً صفحہ ۲۹۱ ۔

بنارس گئے تو یہ بھی بھرا نہ تھی۔ وہاں یہ میر منشی کی خدمت اور مستعد خان کے خطاب سے بھی نوازے گئے۔ جن دنوں شہزادہ دہلی آیا یہ ہلول کے حاکم ہوئے تھے۔ وہاں سے دلی میں واپس۔ پھر جہاں دار کے انتقال پر بنارس جا کر قتل سلطان یکم کی سرکار میں لوکر ہوئے اور وہیں ۶۔ جمادی الاول ۱۱۲۳ھ/۲۴ مارچ ۱۸۱۰ء کو انتقال کیا۔ جہاں دار نے غالباً فارسی اردو کی تعلیم ان سے پائی تھی۔

(۴)

عزیزالدین عالم گیر ثانی کی تخت نشینی ۱۰۔ شعبان ۱۱۱۶ھ (۲۔ جون ۱۷۵۴ء) کو عبادالملک کے ہاتھوں ہوئی اور وہ قید اور نظر بندی کی صعوبت سے آزاد ہو کر تخت حکومت پر جلوہ افروز ہوئے شہزادہ عالی گوہر (شاہ عالم) ولی عہد قرار پایا اور اس طرح جہاں دار بھی محل کی کھلی قضا میں پرورش پائے لہذا لیکن حقیقت میں سیاہ و سلب کا مالک عبادالملک تھا۔ ان کی اذیت سے تنگ آکر ولی عہد عالی گوہر نے رہائی کی ٹھانی اور رمضان ۱۱۲۰ھ میں عہد سے جان بچا کر اس کے مد مقابل لجنہ الدولہ کے پاس آیا۔ اس کے مشورے سے بنگال کی فوج کی تدبیر سوچی اور اس مقصد سے لکھنؤ کا رخ کیا، تاکہ شجاع الدولہ کی امداد و اعانت سے منصوبہ تکمیل کو پہنچے۔ اس کی آمد سے مشرقی علاقوں میں سیاسی سرگرمی اپنے شباب پر آ گئی۔ اس زمانے میں جب کہ عالی گوہر کھٹولی کے مقام پر فروکش تھا، اسے اپنے والد کے قتل کی اطلاع ملی۔ عالم گیر ثانی ۸۔ ربیع الآخر ۱۱۲۳ھ/۲۹۔ نومبر ۱۷۵۹ء کو قتل ہوا۔ اس کی اطلاع یکم جمادی الاول ۱۱۲۳ھ کو وصول ہوئی اور ۳۔ جمادی الاول ۱۱۲۳ھ کو عالی گوہر شاہ عالم کے لقب سے تخت نشین ہو گیا۔

اس وقت دلی کا یہ عالم تھا کہ احمد شاہ ابدالی کی آمد آمد تھی

۱۔ ”تذرات شاہی“، دیباچہ صفحہ ۵۰، ۵۱، فٹ نوٹ یہ حوالہ ”لشتر عشق“۔

جسے نجیب الدولہ نے آسائے سفر کیا تھا۔ عہدالملک نے عالم گیر ثانی کے قتل کے بعد بھی اہلالت کی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور وہ شاہ جہاں ثانی کے لقب سے پہنکوا گیا۔ ان حالات میں اہدالی ہندوستان میں وارد ہوا۔ ہانی پت کی تیسری لڑائی میں احمد شاہ اہدالی کی جیت ہو گئی۔ ۱۶۔ جنوری ۱۷۶۱ء کو یہ معرکہ سر ہوا اور اہدالی نے دلی کا رخ کیا۔ ”فریلہ کے مقام پر سابق ملکہ زینت محل اور اس کے ہوتے مرزا جواں بخت نے فلاح کا استقبال کیا۔ ۲۹۔ جنوری ۱۷۶۱ء کو اہدالی نے شاہ عالم کی بادشاہت کی توثیق کر کے اس کی غیر حاضری میں جہاں دار کو نائب بنا دیا۔ انتظام پورا کر کے اہدالی نے آخر ۲۵۔ مارچ ۱۷۶۱ء کو دلی سے کوچ کیا“۔

اہدالی نے وزارت کا منصب ہندوستان کے لیے مخصوص کیا اور نجیب الدولہ کو میر بخشی بنایا۔ عہدالملک اس وقت ستھرا میں پڑا تھا۔ اس نے آئے میں دیر کر دی۔ اس دوران میں نجیب الدولہ نے جہاں دار اور زینت محل کا زیادہ قرب حاصل کر لیا اور اپنی پوزیشن زیادہ مضبوط کر لی۔ اگلے برس جب اہدالی دوبارہ ہندوستان میں وارد ہوا تو عہدالملک کی بجائے شجاع الدولہ وزیر قرار دیا گیا اور اس طرح عہدالملک کا اب دلی کی حکومت میں براہ راست کوئی دخل نہ رہا اور نجیب الدولہ کا دور دورہ ہوا۔

اس زمانے میں مریخے اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ چند سال دلی میں امن و امان رہا اور دارالحکومت کی حالت بہتر ہو گئی۔ بعض مورخ دلی کے حسن انتظام کا ذمہ دار نجیب الدولہ کو قرار دیتے ہیں، بعض کے نزدیک یہ سب کچھ جہاں دار کی فراست اور حسن تدبیر کے سبب ممکن ہوا۔ ابتدا میں امور ملکی یا تو نجیب الدولہ کے توسط سے یا بھر باہا مرزا کے مشورے سے انجام پاتے ہوں گے لیکن آہستہ آہستہ جہاں دار نظم و نسق کا تجربہ

1. Ahmad Shah Durrani (Ganda Singh) pp. 260-261, 264.
2. Najibud Daulah, his Life and Times (Sh. Abdur Rashid) pp. LXXXII, LXXXIII.

حاصل کر گیا اور اس کا یہ دس برس کا عہد حکومت اسے اہل دربار میں مقبول بنا گیا :

“It appears that the young prince suddenly called upon to fill such an important office and in such exceptional times gave a good account of himself, maintaining harmonious relations with the minister and making himself popular with the nobles of the court. For a period of ten years he acted in this capacity and won the confidence and esteem of all”.

یورپ میں سیاسی حالات زیادہ تیزی سے بدل رہے تھے - ۲۶ رجب الثانی ۱۱۷۸ھ/۲۳ اکتوبر ۱۷۶۴ء کو یکسر کے مقام پر انگریزوں نے شاہ عالم اور اس کے ساتھیوں کے لشکر کو شکست دے دی تھی - نتیجے کے طور پر بادشاہ نے ۱۲ - اگست ۱۷۶۵ء کو بنگالہ، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کمپنی کو دے دی - ۱۹ - اگست ۱۷۶۵ء کے معاہدے سے شاہ عالم ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیدی ہو کر رہ گیا - الہ آباد اور کوڑا اس کی جاگیر قرار پائے اور وہ الہ آباد میں فروکش ہو گیا - ادھر دلی کے باہر کے علاقے میں امن و امان کی بحالی اور جائوں اور سکھوں کی روک تھام نجیب الدواہ کرتا رہا - لیکن سات برس سے وہ مسلسل تپ میں مبتلا تھا ، صحت نے جواب دیا مگر ۱۱۸۸ھ میں اس نے دلی کو جہاں دار شاہ ، زینت محل اور ضابطہ خان (اپنے بیٹے) کے سپرد کیا - ۱۵ - اکتوبر ۱۷۶۶ء کو شاہدرہ میں ٹھہرا خود محل میں جا کر الوداع کہی اور اپنے وطن نجیب آباد کی طرف روانہ ہوا - اب مرہٹے دس برس کے بعد پھر آدھمکے ، نجیب کو دست تعاون

1. Indian Historical Records Commission Proceedings Vol. XIV Dec. 1937 p. 138.
2. Proceedings of All India History Congress, Allahabad Session 1838 pp 552—502 also Shujaud-Daulah (Sirivastava, Vol. II p. 231.
3. Najibud-Daulah—his Life and times (Sh. Abur Rashid) p. 125. The Fall of the Mughal Empire (Sarkar) Vol. II pp. 295—298.

بڑھانا پڑا۔ ہلکری معرفت تحریری اقرار نامہ ہوا اور مریشوی کا رخ دلی سے بھر گیا۔ یہ ہلا ٹلی ہی تھی کہ باہڑ کے مقام پر نجیب الدولہ کا انتقال ہو گیا۔ یہ قول سرکار نجیب ۳۱ - اکتوبر ۱۷۷۰ء کو فوت ہوا معاصر مورخ نورالدین نے "سرگزشت نجیب الدولہ" میں اس کی وفات کا سنہ ۱۱۸۶ھ دیا ہے جو درست نہیں^۱۔ حقیقت یہ ہے کہ نجیب ۱۰ - رجب ۱۱۸۶ھ / ۳۰ - اکتوبر ۱۷۷۰ء کو فوت ہوا تھا۔

(۵)

شاہ عالم نے الہ آباد میں سات برس عیش و عشرت اور شعر و شاعری میں بسر کر کے شاہی ہند کی طرف کوچ کا ارادہ کر لیا۔ الہ آباد میں انگریز قلعہ دار (سیکٹ) کی مسلسل بدسلوکیوں نے پہلے ہی دل برداشتہ کر دیا تھا، اندھ دل کی حالت فراق کی زبانی سنئے :

دو سنہ ہزار و یک صد و ہشتاد و چہار ہجری رام چندر گنیش
و بیسابی و نکوجی ہلکری و بادھو راؤ سیندھی، سرداران جنوب
با فوج منسکین از دکن آمدہ جنگ لول منگھ جاٹ زدہ
یہ دارالخلافہ رسیدہ شرف آستان بوس مرشد زادہ ولی عہد،
صاحب عالم مرزا جوان بخت جہان دار شاہ بہادر حاصل کردند۔
چون در ایام امیرالامرا نجیب الدولہ وفات یافتہ بود، در تمامی
ہندوستان کسی سد آنها نمی توانست شد، عبور دریای گنگ
کردہ قریب بہ فرخ آباد رسیدند و بادشاہ را طلبیدند۔ حضرت
بدولت باوجودیکہ وزیرالہالک شجاع الدولہ و سرداران فرنگ

1. The Fall of the Mughal Empire (Sarkar) Vol. II pp. 301—304.
2. Najibud-Daula—his life and times (Sh. Abdur Rashid) p. 136. See also Appendix p. 173 and Preface p. XVI کہ یاد رہے کہ Twilight of the Mughals (1951) (صفحہ ۷۱) نے نجیب کا انتقال نجیب آباد میں بیان کیا ہے جو صحیح نہیں۔

راضی نبودند ، از الہ آباد کوچ فرسودہ کرم و گیرا خود را بہ فرخ آباد رساندند و با سران دکن ملحق گشتند اقبال سلطان کارکرد کہ ہم دران ایام احمد خان بنگش ازین جہان فانی بگشت ۔ از پسرش کہ مخاطب بہ مظفر جنگ است چیزی بطریق خطی گرفته ، از فرخ آباد بعد تاغت و تاراج سکرناں و پتھر گلہ کہ مقر و مامن ضابطہ خان پسر نجیب الدولہ بود معمہ سرداران جنوبی کوچا کوچ بنواح دارالخلافت رسید ۔ بہست و ہم رمضان المبارک سنہ الف و ماہہ و ثمانین و خمس ماہہ بلند پایہ بر مکان دارالخلافت افکندند و بہ شاہزادہ ولی عہد و دیگر شاہزادہا و سایر ہیکات کہ بہ تعب ہجران شہنشاہ زمان گرفتار بودند جال جہان آرا بخود لذت حیات بخشیدند و بہ دارالخلافت و جمع مردم از سر نو بہ برکت تشریف شریف شرف حاصل شد ۔ چنانچہ لوسنگ داس خوش دل گفتہ :

بر سر اہل شاہ جہان آباد ظل گسترد ظل سبحانی
روز شریف است و نہ رمضان سال تاراج عید رمضان

شاہ عالم نے مرہٹوں کی فرمائش پر الہ آباد سے ۱۳ اپریل ۱۷۷۱ء کو کوچ کیا تھا^۱ اور جیسا کہ مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہے یہ قافلہ ۲۹ - رمضان ۱۱۸۵ھ/۲۵ دسمبر ۱۷۷۱ء کو دہلی میں داخل ہوا ۔ مرہٹے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے ننانویں تھے اس لیے انہوں نے راہ ہموار کرنی شروع کی ۔ ان کی راہ میں سب سے بڑا کالٹا ضابطہ خان پسر نجیب الدولہ تھا ۔ اسے شاہ عالم نے شکست دے کر مشکل آسان کر دی لیکن اس زمانے میں خود مرہٹوں کو بھی اپنے علاقے کے حالات کے

۱ - ”وقائع عالم شاہی“ صفحہ ۱۶۷ - لیز دیکھیے The Fall of the Mughal Empire (Sarkar) جلد ۳ ، صفحہ ۱۶۷ -

۲ - ”میر حسن اور ان کا زمانہ“ (وحید قریشی) صفحہ ۸۳ بحوالہ

The Fall of the Mughal Empire (Sarkar) Vol. II, pp. 407-408.

جب واپس دکن کی طرف لوٹنا پڑا۔ اب شاہ عالم کو شالی ہند میں حکومت کرنے کا اختیار حاصل ہو گیا۔

جہاں دار شاہ باپ کی آمد پر سیاست سے الگ ہو گیا۔ اسے اپنے ذاتی اخراجات کے لیے جاگیر مل گئی اور اطمینان کی زندگی گزارنے لگا۔ اس زمانے میں شاہ عالم نے جہاں دار کی شادی مرزا بابا کی لڑکی جینا بیگم سے کر دی^۱۔ اب شاہ عالم کے سیاہ و سفید کا مالک اس کا الہ آباد کے زمانے کا معتمد نجف خان ہو گیا۔ ذوالفقار الدولہ نواب نجف خان بہادر غالب جنگ امیرالاسرا اور نائب وزیر امور ملکی انجام دینے لگا اور شاہ عالم عیش و نشاط اور شعر و سخن میں مصروف ہو گیا۔ ۱۱۹۶ھ تک نجف خان دلی کی قسمت کا تابندہ ستارہ تھا۔ اس زمانے میں اسن و اسن بھال اور رعایا خوش حال ہو گئی لیکن ۲۲ ربیع الآخر ۱۱۹۶ھ/ اپریل ۱۷۸۳ء کو نجف خان نے انتقال کیا^۲ اور اسراٹے دربار کی سازشوں کے دروازے کھل گئے۔ نجف خان کا پروردہ افراسیاب خان بادشاہ کا معتمد بنا لیکن جلد ہی مرزا محمد شفیع نے رسوخ حاصل کر کے وزارت کا منصب پا لیا۔ مرزا شفیع کے ظلم و ستم سے رعایا اور درباری سبھی نالاں تھے۔ ایسے میں جہاں دار نے باپ کی مدد کی اور دربار کے برگشتہ خاطر اسرا سے مل کر مرزا محمد شفیع کو بے دخل کرنے کی ٹہانی۔ مرزا محمد شفیع کو پتا چل گیا اور اس نے راہ فرار اختیار کی۔ اب جہاں دار شاہ نے عروج پایا اور امور ملکی کی دوستی کی طرف متوجہ ہوا لیکن ادھر مرزا محمد شفیع اور افراسیاب خان نے باہمی صلح کر کے جہاں دار کے خلاف محاذ بنا لیا۔

۱۔ ”نادرات شاہی“۔ دیباچہ، صفحہ ۵۴۔

۲۔ ”نادرات شاہی“ (شاہ عالم) دیباچہ (عرشی) صفحہ ۲۳۔ ”وقائع عالم شاہی فراقی“ صفحہ ۱۰ :

در مد ربیع آخر اثنای عشرہ ثالث
تیر دعاے اعدا ناگہ بر ہدف رفت
از جسم پاک روشی چون رفت فکر کردم
سالی بگفت پائف ”بیر نجف رفت“

شاہ عالم نے طبی کمزوری دکھائی۔ شہزادے کے ساتھیوں کو زیر کیا گیا اور ایک بار پھر مرزا محمد شفیع اپنے عہدے پر بحال ہو گیا۔ افراسیاب اور مرزا محمد شفیع نے اس اشتراک عمل اور شاہ عالم کی ہست ہستی سے امرائے دہلی کی زندگیوں تلخ کر دیں۔ جہاں دار اور اس کے طرفداروں کو پریشان و ذلیل کیا گیا اور شہزادے کو دوبارہ بے تعلقی کی پالیسی اختیار کر لی پڑی۔ اس دوران میں افراسیاب خان نے مرزا محمد شفیع کو قتل کرا دیا۔ فراق کے قول کے مطابق یہ کام محمد بیگ خان نے انجام دیا۔ محمد شفیع خان (ناصر الدولہ) کے قتل کی تاریخ ۲۵ شعبہ ۱۱۹۷ شوال ۱۱۹۷/۲۳ ستمبر ۱۷۸۳ء ہے۔ اب افراسیاب خان (اشرف الدولہ) امیرالامرا مقرر ہوا اور شاہ عالم کے مزاج پر حاوی ہو کر کاروبار سلطنت پر چھا گیا۔

(۶)

محمد شفیع کے قتل کے بعد شاہی خاندان کے لیے حالات ناقابل برداشت ہو رہے تھے اور افراسیاب خان اس حد تک خود سر ہو گیا تھا کہ اس کے ہاتھوں خاندان کو ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی ایک جھلک ۲۳ - مارچ ۱۷۸۳ء کے بعد کے ایک واقعے سے بہ خوبی ہو سکتی ہے۔ سرکار لکھتے ہیں :

The Coronation anniversary over (23rd March 1784), Afrasiyab urged the Emperor to go with him to Agra and help in collecting the tribute. But the necessary transport could not be got ready for want of money and the depletion of the Imperial stores since Najaf's death. Afrasiyab ascribed this

۱ - "وقائع عالم شاہی" صفحہ ۱۸ لیکن بعض مورخ محمد بیگ خان کی بجائے اس کے بیٹے امیرعلی بیگ خان کے قاتل ہونے کے داعی ہیں۔ "حواشی وقائع عالم شاہی" (عرشی) صفحہ ۱۹۹ - عیسوی سنہ Fall of the Mughal Empire (Sarkar) جلد سوم ۱۸۳ء - ۱۸۵ء سے ماخوذ ہے۔

delay to Abdul Ahand's obstruction, and he created a scene at Court, abusing the Emperor and the princes and stinting them in their allowances. Weary of his gilded chains, the heir to the throne, Prince Jahandar Shah (Jawan Bakht) slipped out of the Delhi palace in the midst of a violent dust storm on a dark night (14th April) and reached Lucknow (6th May), where he was welcomed by the Wazir and Warren Hastings.¹

شہزادے نے دلی سے بڑے ڈرامائی انداز میں فرار اختیار کیا۔ تیموری خاندان کے شہزادوں میں وہی ایک ایسا ذہین دماغ تھا جو شیطانی کھیل کھیلتے والے امرا کو روکنے اور ان کی بنائی ہوئی چالوں کو ختم کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ شاہ عالم ظالم اور جفا بیضہ افراسیاب کے ہاتھوں قالاں تھا، اس سے رہائی پانے کی ایک ہی تدبیر ہو سکتی تھی کہ انگریزوں سے استعداد کی جائے۔ انگریزی مدد کا منصوبہ مرزا نجف خاں کے انتقال کے بعد سے لغضا میں تھا۔ جب دلی کے حالات نجف خاں کی وفات پر ہکڑے تو شاہ عالم قافی نے انگریزوں سے مدد کی درخواست کی تھی۔ چنانچہ ۲۔ اگست ۱۷۰۷ء کو وارن ہیسٹنگز (گورنر جنرل) نے میجر جیمز براؤن کو ایجنٹ مقرر کر کے دلی کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ براؤن کے دلی پہنچنے تک مرزا چد شفیع نے اپنے مخالفین کو کچل کر اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ اس لیے مرزا چد شفیع کی سعی یہ تھی کہ براؤن راستے ہی سے واپس چلا جائے، لیکن براؤن جلد ہی آیا اور حیلے بھانے سے اپنے دم جانے لگا۔ اسی زمانے میں افراسیاب نے چد شفیع کو ختم کر دیا اور خود امیرالامرا ہو گیا۔ چنانچہ براؤن نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ۵۔ فروری ۱۷۰۸ء کو بادشاہ کے حضور میں باریابی حاصل کر لی۔ اس مشن کا اصل مقصد براؤن کے نزدیک یہ تھا کہ کسی تدبیر سے مرہٹوں کے خلاف امرا میں ایک پاؤی بنانے میں کامیاب ہو جائے۔ براؤن اس کام میں مشغول

1. Fall of the Mughal Empire (Sarkar) Vol. 3 pp. 190 – 191.

تھا ، جب جہاں دار دلی سے بھاگ نکلا ۔ اس طرح تدبیر کا راستہ کھلا تھا ۔ شہزادہ اپنے باپ کی خواہشات اور توقعات کا اندازہ کر رہا تھا ۔ جب یہ خبر ملی کہ وارن ہیسٹنگز لکھنؤ میں آیا ہوا ہے تو شہزادے کو اپنی تدبیر کو عملی جامہ پہنانے کا موقع قریب نظر آیا ۔ وہ جان پر کھیل کر دلی سے نکل کھڑا ہوا ۔ دلی سے جہاں دار کا فرار بڑا دلچسپ تھا ۔ اس لذیذ حکایت کو شہزادے نے وارن ہیسٹنگز کی فرمائش پر خود تفصیل سے بیان کیا تھا ۔ روداد کا کوئی نسخہ اب موجود نہیں لیکن جوئے نین سکاٹ (Jonathan Scott) کا کیا ہوا انگریزی ترجمہ موجود ہے ، جو Warren Hastings "Memoirs relative to the State of India" از طبع لندن ۱۷۸۶ء صفحات ۱۶۳ و ۱۶۶ پر درج ہے ۔ سر جادو ناتھ سرکار

1. Historical Records Commission Proceedings of Meetings. Vol XIV Dec. 1937; (The mission of James Browne to the Delhi Court, 1783—1785 (Sir Jadu Nath Sarkar) pp. 12—19.
2. Ibid. Prince Jawan Bakht Jahandar Shah (Abdul Ali) p. 139.
3. Persian Literature—A bio-bibliographical Survey (C.A. Storey) Vol. I Section II Fasciculus III ed. 1939. pp. 624, 625.

”قاموس المشاہیر“ (نظامی بدایونی) میں ہے :

کارمن دی نامی کے سفر نامے (کذا) سے پتا چلتا ہے کہ ولایت میں اس کی تصنیف سے ایک کتاب موسومہ بیاضی عنایت مرشد زائدہ موجود ہے جس کا انگریزی ترجمہ اسکاٹ نے کیا تھا اور جو مسٹر ہیسٹنگز کے ویویو آف دی اسٹیٹ آف بنگال کے تسمے کے طور پر شائع ہوا تھا ۔ (جلد اول صفحہ ۱۰۳) ۔

”طبقات شعرائے ہند“ (کریم الدین) جو کارمین دتاسی کی تاریخ ادب کی تلخیص و اضافہ ہے اس میں صرف اس قدر ہے کہ ایک جلد قلمی بنام بیاضی عنایت مرشد زادہ کعبی کے کتاب خانے کی جو اس نے گورنر جنرل ہیسٹنگز کو لٹری کی تھی موجود ہے (طبقات صفحہ ۸۴ ، ۸۵) ۔

الذہا آفس کی لہریٹ مخطوطات میں ”دیوان جہاں دار“ کے اس نسخے کی تفصیل درج ہے ۔ نظامی بدایونی کی غلط فہمی ظاہر ہے ۔

نے اس ترجمے سے تفصیلات اخذ کر کے اپنی کتاب میں شامل کی ہیں ۔
فراق کی روداد یہ ہے :

”در ایام حکومت اشرف الدولہ (افراسیاب خان) و مجد الدولہ (عبدالاحد خان کشمیری) کاری کہ بنیان خلافت را حرکت داد بظہور آمد ۔ و این با از اتفاقات آن است کہ شہزادہ ولی عہد (جہان دار شاہ) را باستمواب رای جہان نما کہ با ناصر الدولہ (مجد شہنشاہ) موافق بود و بعد کشتہ شدن او مختار سهام سلطنت ، مزاج اقدس را از جناب مرشد زادہ منظمی ساختہ در انتہای بودند کہ شہزادہ را مسلسل کنند ۔ شہزادہ بدریافت این ماجرا در قصد خروج از دولت خانہ بادشاہی شد ، و بہشت ماہ اغفای راز و مدارا با مخالفان کرد ۔ چون مکرم الدولہ علی اکبر خان بہادر برادر تاج محل بیگم والدہ ولی عہد خلافت ، باتفاق عبدالرحمان خواص کہ عامل جاگیرات مرشد زادہ بود ، بعضی از سرداران گوجر را جہت ہمراہی شہزادہ فراہم آورد ۔ شہزادہ قتل سلطان بیگم را کہ حلیہ جلیہ و از یک سال محرم راز بود ، کشف ارادہ کردہ ، از حجرہ خواب گاہ شب ۲۳ بیست و سوم جمادی الاول سنہ ۲۶ بیست و ششم در حالی کہ طوفان باد و باران در طغیان بود ، و از شدت ظلمت ابر ہیچ معاینہ نمی شد ، چہار گھڑی از شب مذکور رفتہ ، بجای زیر جامہ جالگہ پوشیدہ و بر کمر بند لنگ ابریشمی کہ مولوی فخرالدین مرشد آنحضرت دادہ بود ، پیچیدہ و بر بالای کلاہی رومال شال تحت الحنک بستہ و دوشالہ سیاہ بر دوش گرفتہ ، قریب بہ پنج گھڑی شب بر بام خود برآمدہ ، بام بام تا بنیض نہر رسیدہ ، چون از وفا کسی را قیافت ، عود بنام خانہ خود فرسود و از دیک بام خانہ عبدالرحمان را یافتہ ، قریب بنیض نہر ثابت خان را دیدہ ، از منفذ دیواری کہ گذار یک کس داشت ، بیابین آمدہ ، باستعانت نردبان رسیان از قلعہ بزیور آمدہ ، بھر لوح خود را بہ میدان لیلہ ”برج“ آنکندادہ و از آن جا بہ مشورہ مکرم الدولہ

رو بہ مشرق نہادند و از معبر قمرالدین لکر عبور گشتگا کردہ روانہ بیشتر شدند و در اثنای راہ جماعت سنگہ گوجر مادیانی و در رامپور فیض اللہ خان زمیندار رامپور دو ہزار روپیہ و دو زنجیر نیل و چند راس اسب و چند منزل خمیہ یا لوازمہ بار برداری پیش کش کرد^۱۔

جہاں دار شاہ ہندن ندی کو عبور کر کے سرورہ ، اورنگ آباد قمرالدین لکر گھاٹ سے گزر کر پھوٹاؤں ، سروہہ اور رامپور آئے وہاں سے بریلی ، شاہ آباد ، میان گنج ، سوہان اور لکھنؤ میں جا کر دم لیا^۲۔

شہزادے کے اس فرار سے افراسیاب بہت بے چین ہوا اور شاہ عالم کو مجبور کیا کہ جہاں دار کو واپس بلایا جائے۔ اس غرض کے لیے میجر براؤن کو لکھنؤ روانہ کیا گیا کہ ہیشنگز سے مل کر اس سے شہزادے کی واپسی اور دیوانی کے سلسلے کی اس رقم کا مطالبہ کیا جائے جو دلی آئے کے بعد بند تھی۔ براؤن لکھنؤ جا کر اسی طرح لوٹ آیا اور شاہ عالم کے ساتھ ساتھ مائے کی طرح لگا رہا۔ جہاں دار شاہ ۶ - ۱۷۸۳ء کو لکھنؤ میں پہنچ گیا تھا اور وارن ہیشنگز اور آصف الدولہ نے اس کا خیر مقدم کیا تھا^۳۔ جہاں دار شاہ نے گورنر جنرل سے امداد کی خواہش کی لیکن گورنر جنرل کی کونسل اس پر رضامند نہ ہوئی کہ دلی کے معاملات میں براہ راست دخل دیا جائے۔ اس پر ہیشنگز اس بات پر آگاہ کیا کہ کسی طرح شہزادے کو واپس دہلی بھیجا جائے۔ جہاں دار شاہ چاہتا تھا کہ اس کے ہمراہ اتنی فوج کی جائے جو اس کی حفاظت کر سکے ، دوسرے اسے افراسیاب سے جاگیر دلائی جائے ، تیسرے سکھوں کی روک تھام میں انگریز کریں۔ ہیشنگز اس کے لیے آمادہ ہو گیا کہ دربار دہلی سے اس موضوع پر بات چیت کی جائے۔ افراسیاب خان اس شرائط پر آمادہ تھا کہ شہزادہ چار انگریزی کمپنیوں کے ہمراہ بے شک واپس آ جائے۔ جاگیر کا وعدہ

۱۔ "وقائع عالم شاہی" صفحہ ۱۹ ، ۲۰ ، ۲۱۔

۲۔ "تاریخ اودہ" (نجم الفنی) جلد سوم صفحہ ۲۵۹ تا ۲۶۳۔

۳۔ اس غیر مقدم کی تفصیلات کے لیے دیکھیے "ڈاکٹر میر" یا اس کا اردو ترجمہ "میر کی آپ بیتی" (نثار احمد فاروق) صفحہ ۱۸۳ تا ۱۸۴۔

بھی کر لیا ! بشرطیکہ شہزادہ افراسیاب کا معین و مددگار ہو کر اس کی مرضی پر چلے۔ یہ طے ہوا تو جہاں دار شاہ دلی آنے کے لیے فرخ آباد پہنچا۔ وائے قسمت کہ ہیسٹنگز کو کانگٹے لوٹنا پڑا اور اسی زمانے میں افراسیاب خان قتل ہو گیا۔ افراسیاب کا اقتدار صرف تیرہ ماہ رہا تھا۔ مرزا محمد شفیع خان کے بھائی زین العابدین نے ۲ - اومبر ۱۷۸۳ء کو افراسیاب کو ٹھکانے لگا دیا۔ حالات کے اس آٹھ پھیر نے جہاں دار شاہ کی امیدوں پر پانی پھر دیا۔ شاہ عالم اس کی واپسی کا منتظر تھا اور جہاں دار شاہ انگریزی مدد کا طالب کہ واپس جا سکے۔ براؤن کی سازشیں بار آور نہ ہو سکیں اور پوری کوشش کے باوجود شاہ عالم مادھو جی سندھیا کی طرف جھک گیا۔ اس زمانے تک عہد نامہٴ ملیٹی کی مدد سے انگریز سریشوں کی کالڈریسی توڑنے میں کامیاب ہو چکے تھے اور نتیجے کے طور پر سندھیا سریشوں کا لہڈر ہو گیا تھا۔ شمالی ہند میں درحقیقت وہی کرتا دھرتا تھا۔ مرہٹے پھر شاہ عالم پر حاوی ہو گئے۔ سندھیا کے مہر بخشی ہو جانے کے بعد وہی سہی امید بھی جاتی رہی۔ سندھیا جہاں دار شاہ کو واپس لینے پر آمادہ تھا لیکن وہ انگریزی فوج کے بغیر خود کو سندھیا کے جنگل میں دھننے کے لیے تیار نہ تھا۔ انگریز بھی اس موقع پر ایک وقت تخت کے دونوں دھوے دار (بادشاہ اور ولی عہد) سریشوں کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہتے تھے، اس لیے چپکے ہو گئے اور جہاں دار لکھنؤ ہی میں ڈبرے ڈال کر بیٹھ گیا۔ اس سلسلے میں ران سنگھ زخمی کا بیان بہت مبہم ہے۔

”ایس العاشقین“ میں فرماتے ہیں :

”جہاں دار نام نامیشی مرزا جوان بخت جہاں دار شاہ خلف ارشد
حضرت جنت آوام گاہ شاہ عالم بادشاہ غازی بود ، در عہد
نواب مغفور میرور آصف الدولہ چند بار بہ دارالامارۃ لکھنؤ
تشریف آورده ، آخر الامر بہ بتارس رفتہ عازم تسخیر ملک
عدم شد“۔

۱۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ افراسیاب کا قتل مادھو جی سندھیا کے ایما سے ہوا۔

۲۔ ایس العاشقین - ورق ۲۳ الف ، قلمی ، پنجاب یونیورسٹی لائبریری ۔

لکھنؤ میں آصف الدولہ جہاں دار شاہ کے مصارف کا کلیل تھا۔ جب اس کا قیام طویل ہوتا گیا تو وہ اسے اپنے پر بوجھ خیال کرتے لگا۔ بعض معاملات ایسے ہوئے کہ دونوں میں اختلاف ہو گیا۔ مولانا نجم الغنی "تاریخ اودہ" میں لکھتے ہیں :

"نواب وزیر (آصف الدولہ) شاہزادے کی بہت خدمت کرتے تھے اور ۲۵ ہزار روپے ماہواراً مصارف کارخانہ جات وغیرہ کے لیے اور ۷ ہزار روپے خرچ باورچی خانہ کے لیے مقرر کیے۔ جیسا کہ "سلطان الحکیمت" میں ہے۔ بعض قابو طلب لوگوں نے شاہزادے کے مزاج کو عیاشی کی طرف مائل کر دیا اور فواحش و ارباب نشاط کی صحبت کی طرف راجب بنا دیا۔ چند روز میں رنڈی بیڑوے اتنے جمع ہو گئے کہ اسی شاہزادے کو شمشیر زنی، تفنگ افگنی، اسب تازی اور نیزہ بازی کا عادی تھا، شاہد پرست اور عیش و عشرت میں بھو بنا دیا۔ کئی فاحشہ عورتیں اپنے محل میں داخل کر لیں۔ نواب وزیر کو یہ باتیں ناگوار گزرتیں ... (انہوں نے آخر کار) سلوک ہندی و پرستاری اور ارسال پیش کش و ہدایا میں تغافل شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ طرین کے دلوں میں کدورت پیدا ہو گئی اور "تاریخ شاہیہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ ۵۱۲۰۰ میں ایک لکھنوی ملوائف کرم بخش"

- ۱۔ دراصل جہاں دار نے آصف الدولہ سے ۴ لاکھ روپے سالانہ وٹلیف پایا تھا۔ نجم الغنی کا قصیدہ صحیح نہیں ہے۔
- ۲۔ "ذیوان انسوس" میں جہاں دار شاہ کی شادی کا ایک قصہ "تاریخ درج ہے۔ دیکھیے :

Cat. of Hindi, Panjabi and Hindustani Mss. in B.M. (Blomhardt) p. 38.

جہاں دار اپنی اصل بیوی کو تو دلی چھوڑ آئے تھے جو مرزا بابا کی بیٹی جینا بیگم تھی، بعد میں انھیں لا کر اپنے پاس بنارس میں رکھا تھا ("ادوات شاہی"، دیباچہ صفحہ ۵۲)۔

(بقولے کرم بخش) نام سے جوش عبت میں آنکھیں لڑ گئیں اور اس کو کاشانہ محل بنایا۔ اس سے وزیر کو رنج ہوا ... یہاں تک کہ وہ شہزادے سے بے رغبت ہوئے لکھنؤ سے فیض آباد کو چلے گئے۔ اب شہزادے کو لکھنؤ کا ٹھہرنا ناگوار ہوا اور ماہ ذی الحجہ کے عشرہ دوم ۱۲۰۰ ہجری میں لکھنؤ سے بنارس کی طرف روانہ ہو گئے اور وہاں جا کر قیام کیا۔

یہ اختلافات محض ظاہری ہیں، حقیقت میں آصف الدولہ شہزادے سے چھٹکارا ہانا چاہتا تھا جسے خواہ مخواہ انگریزوں نے اس پر لاد دیا تھا اور خاصا رویہ برپا ہو رہا تھا۔ اس لیے اس نے نویں آسٹریا روس اختیار کی جس سے دل برداشتہ ہو کر جہاں دار شاہ نے بے اطلاع نکلنے کی ٹھانی۔ ۱۷۸۶ء کو جب آصف الدولہ فیض آباد گیا ہوا تھا شہزادہ لکھنؤ سے بنارس کی طرف چلا گیا اور مادھو داس کے باغ میں ڈیرہ چاہا۔ آصف الدولہ اب جہاں دار شاہ کی مقررہ پشن دینے پر آمادہ نہ تھا لیکن انگریزوں نے پھر مجبور کیا تو جہاں دار شاہ کو بنارس میں رویہ مٹنے لگا۔

(۸)

جہاں دار کی شعر و شاعری کا زور شور لکھنؤ میں اپنے عروج پر رہا۔ مشاعرے ہوتے، شعرا کی سرپرستی کی جاتی اور محفلیں ہوتا ہوتی تھیں۔ جہاں دار کے دربار سے میر شیر علی انیسویں متعلق ہو گئے تھے۔ اس طرح کی مجالس کا ذکر مرزا علی لطف نے ”گلشن ہند“ میں کیا ہے۔ لکھتا ہے :

”جس ایام میں کہ نامواقف سے امراء دولت کی، نشان کیوں شان اس لنگ جناب کے دارالخلافت“ دل سے بیچ حرکت کے آئے، تو (۱۱۹۸) گیارہ سو اٹھانوے ہجری تھی کہ خود بدولت و اقبال لکھنؤ میں تشریف لائے۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے جو مراتب و آداب خدمت کزاری کے تھے، سب ادا کیے، خواص میں پیشہنے کے سوائے گھڑیوں ہاتھ بالندے

کھڑے رہے۔ باوصف اس نازیرداری کے کبھی پیادہ چار قدم کاہے کو چلے تھے، ہاتھوں پتھیار بند ہوئے، ایک الاٹھی اور گلوڑی کی بخشش پر دس دس مرتبہ، مجرہ گاہ پر سے جا کر آداب بجا لاتے تھے۔ غرض اس شہزادہ عالی کی طبیعت شعر کی طرف اس قدر آئی تھی کہ سہجے میں دو مرتبہ ہذا مشاعرے کی اپنے دولت خانہ میں ٹھہرائی تھی۔ شعرائے باوقار کو اپنے چوبدار بھیج کر مشاعرے کے دن بلواتے اور ہر ایک شخص سے نہایت الطاف اور عنایت کے ساتھ گرم جوشی فرماتے۔ چنانچہ، راقم حقیر کو جب یاد فرمایا، تو اس ہیچمدان نے یہ شعر کہہ، بھجوا دیا کہ ”کھترین نے مشاعرے کا جالا مدت سے موقوف کیا، از بس کہ ان صحبتوں میں مناظرہ ہی کو یاران عالی حوصلہ نے رواج دیا ہے، اگر ارشاد ہو تو سوائے مشاعرے کے ایک دن ہندگی میں حاضر ہوں اور اس تم نامکاشتگی بے مغز کو موافق ارشاد کے زمین عرض میں لاؤں۔“ پڑھتا ہوا، بھر چوبدار آیا اور یہ ارشاد فرمایا کہ ”ایرا حاضر ہونا مشاعرے میں نہایت ضرور ہے، مناظرے کا مطلق ہمارے ہاں نہیں دستور ہے۔“ غرض ایسا سے لواب آصف الدولہ مرحوم کے حاضر ہوا اور شرف سعادت ملازمت کا حاصل کیا۔“

اس کے علاوہ کئی اور شاعر بھی جہاں دار شاہ کے متوسل رہے۔ ”مجموعہ“ نغز“ میں امین الدین خان امین کے حال میں لکھا ہے :

”امین الدین خان پسر قاضی وحید الدین مرحوم ... در جرگہ“
خواہان سپہن پور خلافت مرزا جہاں دار شاہ طاب اللہ ثراء عز
استیاز داشت، شعرش عالی از کیفیت نیست“۔

اسی طرح نمنّا شاعر کے حال میں ہے :

”چند اسحاق خان مرحوم۔ وی جوانی بود کشمیری الاصل ...“

۱۔ ”کاشن ہند“ ص ۸۹، ۹۰۔

۲۔ ”مجموعہ“ نغز“ (قاسم) صفحہ ۷۷۔

ہمسر ہم ژلف احسن اللہ خان بیان ۔ در سرکار گردوی افتاد
 شاہزادہ نامدار کامگار مرزا جہاں دار شاہ انار اللہ برہانہ ثروقی
 ہم رسالیدہ بود ، بعد شفقار شدن آن شاہپاز بلند پرواز اوج
 حشمت و جہاد بیابوری بہت بلند و مدد طالع ارجمند مختار کار سرکار
 دولت مدار خلف المصدق آن عالی سب والا حسب یعنی مرزا
 شگفتہ بہت بہادر المعروف بہ مرزا حاجی صاحب شد ۔ اما
 افسوس ہزار افسوس کہ در عین شباب چندان از عمر بہرہ ور
 نا گشتہ بہ رحمت حق پہوست^۱ ۔

اس سے قیاس ہو سکتا ہے کہ ممنا کا تعلق سرکار جہاں دار سے قیام
 بنارس تک رہا اور بعد میں ان کے فرزند کے ہاں بھی اسے ملازمت کا
 سر رشتہ ملا ۔

اسی طرح جعفر علی حسرت کے سلسلے میں لکھا ہے :

” در سرکار دولت مدار شاہزادہ نامدار کامگار جہاں دار شاہ
 انار اللہ برہانہ دو سلک ملازمان خاص عز امتیاز اختصاص
 داشت ۔ در آخر ہا بہ ہدایت سعادت ازل و رہ نمونی فیض لم
 یزل از تعلقات دینی و رستہ سالک مسالک خدا جوئی
 گشت^۲ ۔“

اس کی تائید مصحفی کے مندرجہ ذیل بیان سے ہوتی ہے :

”تا این مدت معاش بہ پیشہ شاعری ہمسر بردہ ، آخر آخر چندی
 در سرکار صاحب عالم مرزا جہاں دار ہم عز و امتیاز داشت ۔
 چون پدرش جہاں فانی را بنمود کرد نوکری صاحب عالم
 گذاشتہ خود بیای پدر دکان نشین کردیدہ بود کہ بہ یک ناگاہ
 بہ ایامی بزرگی خرقہ درویشی پوشیدہ ترک لباس دنیاوی کردہ
 کنج عزت اختیار نمود^۳ ۔“

۱ - ایضاً صفحہ ۱۴۵ ۔

۲ - ایضاً صفحہ ۲۰۸ ۔

۳ - ”تذکرہ ہندی“ (مصحفی) صفحہ ۴۷ ۔

”تذکرۃ جمیع الانتخاب“ (کمال) سے معلوم ہوتا ہے کہ حسرت نے ۱۲۰۶ء میں انتقال کیا۔ نیز چار سال قبل ترک دنیا کر چکے تھے اس لیے ۱۲۰۱ء میں درویشی اختیار کر چکے ہوں گے اور ان کے باپ کا انتقال اس سے کچھ پہلے ہوا ہوگا۔

اس کے علاوہ مد ظہور نوا بھی جہاں دار شاہ کے متوسلین میں سے تھے۔ ”مجموعۃ نغز“ میں لکھا ہے :

”نوا تخلص شیخ مد ظہور نوا، وی طالب علمی از طلبای بلند لکھنؤ۔۔۔ شاگرد مد بقا اللہ اکبر آبادی است از حضور سراسر نور مرشد زادہ جہاں و جہاندار المعروف بہ مرزا جوان بخت مرحوم بخطاب مستطاب خوش فکر خانی عز امتیاز داشت“^۱۔

اس کی تائید مصحفی کے بیان سے بھی ہوتی ہے کہ نوا کو جہاں دار شاہ کے ہاں سے ”خوش فکر خاں“ کا خطاب ملا تھا^۲۔

لکھنؤ کی مجالس میں جہاں دار شاہ کی قدردانی اور شاعر نوازی کی داستان کے یہ چند ٹکڑے ملتے ہیں۔

لکھنؤ سے بنارس آکر بھی محفل آرائی اور شعر خوانی کا زور قائم رہا۔ بنارس میں جو شعرا جہاں دار کے دامن سے وابستہ تھے ان میں طیش دہلوی کا خاص طور پر ذکر ملتا ہے۔ ”گلزارِ ابراہیم“ میں نواب علی ابراہیم خاں لکھتے ہیں :

”طیش دہلوی - از شاگردان خواجہ میر درد و مشعلکان سرکار مرشد زادہ آفاق جہاں دار شاہ صاحب عالم است، ہر گاہ کہ مرشد زادہ آفاق رونق افزایے بنارس بودند با راقم آئم

۱ - مفصل بحث کے لیے دیکھیے راقم کی کتاب ”میر حسن اور ان کا

زمانہ“ صفحہ ۱۵۹، ۱۶۰۔

۲ - ”مجموعۃ نغز“ (قاسم) صفحہ ۲۸۶۔

۳ - ”تذکرۃ ہندی“ (مصحفی) صفحہ ۲۶۳۔

در ۱۹۸۱ء بہ مکرر ملاقات کردہ جوانی خوش ظاہر ، بہ صفت
خاکساری و اخلاق آراستہ است۔^۱

(۹)

حم غلط کرنے کا اس سے زیادہ موثر طریقہ کیا ہو سکتا تھا کہ
جہاں دار شاہ رنگ ولیاں منائے۔ وہیں اپنی انتظامی استعداد کو فراموش
کر دیں۔ انہوں نے تیموری سلطنت کو بچانے کے لیے برطانوی حکومت کو
سہارا بنانا چاہا اور ان کی حیثیت اب قیمتی سپرے کی سی ہو گئی تھی
جس کی قیمت الگریزوں نے آصف الدولہ کے ہسے سے ادا کی تھی اور تخت
کا ایک دھوے دار ان کی مشقی میں تھا جسے بہ ضرورت کام میں لایا
جا سکتا تھا۔ ۱۷۸۷ء میں دلی کے حالات نے پھر پلٹا کھایا اور شہزادے
کے دلی میں دوبارہ دلی جانے کا خیال بیدار ہوا۔ جے پور اور جودھپور کے
راجپوتوں کے ہاتھوں سندھیا کو پریشانی اٹھانی پڑی اور اس نے ادھر کا رخ
کیا تھا کہ غیر حاضری میں سازش ہو گئی۔^۲

غلام قادر روپیلے نے ہانی پت اور دہلی کا رخ کیا اور اپنے موروثی
عہدے کو عملی جد و جہد سے زندہ کرنے کی لگ و دو کی۔ دربار میں
لاظہر منظور علی اس کا حواری موجود تھا جس کی مدد سے شاہ عالم کے ہاں
باریابی ہو سکتی تھی۔ سندھیا کے دو ایجنٹ جو اس کی غیر حاضری میں
اس کے مفادات کے نگہبان تھے ، نالائق ثابت ہوئے۔ غلام قادر دلی کی
طرف بڑھا اور مرہٹوں کی بھی کھچی جمعیت کو شکست ہو گئی اور اس
کے دونوں کارندے رات کی تاریکی میں فرار ہو گئے۔ شاہ عالم غلام قادر
سے ملاقات پر تیار ہو گیا۔ ۲۶ اگست ۱۷۸۷ء کو غلام قادر ، شاہ عالم
کے حضور میں پیش ہوا اور میر بخشی کا عہدہ اور جاگیر کا حق دار قرار
پایا۔ ۵ ستمبر ۱۷۸۷ء سے غلام قادر سلطنت کے کاروبار کا انچارج ہو گیا۔
اب غلام قادر بخشی الممالک امیر الامرا روشن الدولہ جہادر کے لقب سے
سرفراز ہوا۔ شاہ عالم اس موقع پر بالکل عاجز و بے بس تھا۔ وہ رہائی
حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن کوئی راستہ نہ ملتا تھا۔ چنانچہ اس نے اطراف

۱۔ "گلزار ابراہیم" (مع "گلشن ہند") صفحہ ۱۷۲۔

2. The Making of Indian Princes (Edward Thomson)
pp. 9-10.

جہاں ان حالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

و جوانب میں مدد کے لیے ہٹا کر۔ سندھیا کو بھی خط لکھا اور جہاں دار کو بھی۔ ۷ ستمبر ۱۷۸۷ء کے خط میں جہاں دار کو حالات سے آگاہ کر کے واپسی کی دعوت دی گئی۔ نواب آصف الدولہ اور گورنر جنرل سے بھی اپیل کی کہ داد رسی کریں^۱۔ یہ حالات گورنر جنرل (کارنوالس) اور آصف الدولہ کے لیے بھی لمحہ فکریہ تھے۔ جہاں دار بنارس میں بے یار و مددگار پڑا تھا، دلی میں غلام قادر ذلت و رسوائی کا سامان کر رہا تھا۔ کارنوالس لکھنؤ جاتے ہوئے بنارس سے گزرا تو شہزادے سے اس سے علیحدگی میں گفتگو بھی کی^۲۔

(۱۰)

بالآخر کارنوالس نے کسی امداد سے معنوری کا اظہار کیا لیکن اس بات کی ہامی بھری کہ اگر شہزادہ اپنے طور پر دلی جانا چاہے تو الگریزوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ جہاں دار نے اس غرض کے لیے پانچ ماہ کی پیشگی تنخواہ کا مطالبہ کیا اور کہا کہ آصف الدولہ سے دلا دی جائے۔ کارنوالس نے وعدہ تو کیا لیکن آصف الدولہ اب تک لاکھ روپے سے زیادہ دینے پر رضا مند نہ ہوئے^۳۔ اس حقیر رقم کو لے کر اور اپنے معمولی ذرائع کو کالم میں لا کر جہاں دار نے دلی کا رخ کیا اور یہاں آکر عملی سیاست میں کود پڑا۔ عبدالعلی کی رائے میں

1. Indian Historical Records Commission
(Abdul Ali) p. 142.

۲ - گورنر جنرل لکھنؤ گئے تو جہاں دار بھی بچھے بچھے لکھنؤ پہنچا۔
دیکھیے ”تاریخ اودھ“ (نجم الفنی) جلد سوم صفحہ ۲۶۵ و ۲۶۶۔

3. Indian Historical Records . . . (Abdul Ali) p. 142.
بحوالہ I.R.D. Original Persian Letter

مرقومہ ۱۶ ستمبر ۱۷۸۷ء شماره ۴۶۵

اس مرحلے پر جہاں دار شاہ نے جارج سوم فرمان رواے انگلستان کو بھی خط لکھا تھا۔ اس کا متن مع انگریزی ترجمہ دیکھیے در A History of the Reign of Shah-Aulum (Franklin) p. 243—249.
یہ مکتوب غالباً شاہ جارج تک کبھی نہیں پہنچ سکا (دیکھیے ایضاً صفحہ ۲۴۹ فٹ نوٹ)۔

جہاں دار نے بڑی سعادت مندی سے باپ کی مدد کی تدبیر کی اور دلی کو مخالف عناصر سے پاک کرنے کے لیے شاہ عالم کو راحت اقدامات پر اکسایا ! لیکن مخالف عناصر نے بادشاہ کو بدظن کر دیا اور یقین دلایا کہ جہاں دار خود بادشاہ بننے کی سوچ رہا ہے ! لیکن سرکاری رشتے میں جہاں دار شاہ فی الواقع اپنی حکومت کے خواب دیکھ رہا تھا^۱۔ سرکار کا فیاس صحیح معلوم ہوتا ہے ، شاید اسی لیے شاہ عالم نے جہاں دار کو تیرہ دن کے مختصر قیام کے بعد ہی جلا کیا ۔ اسے آگرے کا صوبہ دار بنا دیا گیا ۔ یہ صوبہ ابھی تک اسماعیل بیگ کے قبضے میں تھا اور شاہ عالم اس پر کوئی اختیار نہ رکھتا تھا ۔ ۲۴ دسمبر ۱۷۸۷ء کو شہزادہ اپنے بیوی بچوں کو ، جو فراز کے وقت دہلی میں رہ گئے تھے ، ساتھ لے کر آگرے پہنچا لیکن اسماعیل بیگ نے اطاعت سے انکار کیا ۔ بے آسرا جہاں دار کو واپس انگریزی علاقے میں جانے کا پروگرام بنانا پڑا کیوں کہ اس کے پاس نہ کافی فوج تھی نہ روپہ ۔ اس نے انگریزوں کو مدد کے لیے لکھا بھی لیکن شنوائی نہ ہوئی ۔ ادھر غلام قادر اسے اغوا کرنے کی تدبیر کر رہا تھا ۔ ان حالات میں ناکام و نامراد واپس ہونے کے سوا چارہ نہ تھا^۲ ۔

(۱۱)

مارچ ۱۷۸۸ء کو فرخ آباد پہنچ کر جہاں دار شاہ نے آصف الدولہ اور گورنر جنرل کو اطلاع دی اور لکھنؤ میں وارد ہو گیا ۔ آصف الدولہ اس اس سہری لاش کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا ۔ چنانچہ ”واقعات اظہری“

1. Indian Historical Records ..p. 142. See also A History of the Reign of Shah Aulum p. 158.
2. Fall of the Mughal Empire (Sarkar) Vol III p. 306. also Indian Historical Records..... (Abdul Ali) p. 142—143.
3. Fall of the Mughal Empire p. 306—307.

سرکار نے اس کتاب کے صفحہ ۲۷۹ پر سنیں و واقعات کو آگے پیچھے کر کے الجھا دیا ہے ۔ یہاں مذکورہ بالا بیانات کو ترجیح دی گئی ہے ۔

میں اس موقع پر تلخ گفتگو کی کچھ تفصیل یہی ملتی ہے - اظہری - لکھتے ہیں :

”چون بادشاہ زادہ مذکور (جہاں دار) بعد چند سال برای آوردن قبائل خود بی استرضای نواب وزیر (آصف الدولہ) با دہل آمدند و لواحق خود را برداشتہ باز بہ لکھنؤ مراجعت نمودند ، مزاج نواب مسطور از بادشاہ زادہ مذکور بسیار منحرف بود و از صحبت سابق خود را ہر کنار می کشیدند و اگر گاہی (مذکور) بہ تکلف ملاقا می گردیدند صورت انہماط نمی دیدند ہی روزی در ہمین حالت ملالت بادشاہ زادہ مسطور چیزی دانہ الاٹھی وغیرہ بدست نواب وزیر دادند ، نواب آداب تسلیات بجا آوردہ گرفتند و شرط یاد فراموش نمودند ۔ بادشاہ زادہ مسطور فرمودند کہ ”نواب بھائی فراموش (نی)“ ۔ نواب وزیر جواب داد کہ ۔ ”انشا اللہ تعالیٰ الحال تا عمر فراموش (نکنم)“ ۔ پس بادشاہ زادہ این جواب عرافت و ملالت آمیز وزیر شنیدہ از تصدیقہ مابین مابین گردیدہ ، بعد چند ماہ در بنارس تشریف بردند و ہموچہا درساہۂ معینہ معرفت صاحبان عالی شان بہادر (انگریز) می رسید ۔ بعد چندی در ہمون بلدہ داعی اجل را لبیک گفتہ ۔“

آصف الدولہ جہاں دار کو اپنے خزانے کا غیر ضروری بوجہ تصور کرتا تھا ، نیز لکھنؤ میں ٹھہرنا بھی خلاف مصلحت جانتا تھا آخر گورنر جنرل (کارلوائس) نے طے کیا کہ شہزادہ راج محل میں اقامت پذیر ہو ۔ آصف الدولہ پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ اخراجات کی کفالت کرے چنانچہ آصف الدولہ تین لاکھ روپے سالانہ دینے پر تیار ہو گیا ۔ شہزادے کے

۱۔ ”واقعات اظہری“ - قلمی ، پنجاب پبلک لائبریری ، رتی ۔ ۵۰ ب

۵۱ الف -

2. Historical Records Commission...(Abdul Ali)
p. 143

I.R.D. Original Persian Letter بحوالہ
received on 13rd March 1788 No. 174.

اخراجات اس سے زیادہ تھے اور غزوہ تھا کہ پہلے اکیلا تھا تو چار لاکھ پاتا تھا اور بیوی بچے لے آیا تو تین لاکھ میں خرچ کیسے ہوا کرے گا ! خاص کر جب کہ سرتیے کے لحاظ سے رکھ رکھاؤ بھی ضروری تھا ۔ جہاں دار کو تین لاکھ ہی قبول کرنا پڑا اور آئے فوری طور پر لقبین کی گئی کہ راج محل یا سپہرام چلا جائے جہاں رہائش زیادہ سہنگی نہیں تھی ۔ جہاں دار شاہ کے لیے انکار کی گنجائش نہ رہی تھی اور اسے راضی ہونا پڑا ۔ اب وہ سفر کی تیاری کے لیے بنارس آیا جہاں اس کے اہل و عیال دیکھے بعد دیکھے بیار بڑے اور سپہرام کی روانگی لگتی چلی گئی ۔ اس موقع پر اس کی بے بسی اور بے چارگی کا اندازہ اس خط سے بخوبی ہوتا ہے جو اس نے لارڈ کارنوالس کو لکھا تھا اور جس کے اقتباس کا ترجمہ عبدالعلی کے مقالے میں درج ہے^۱ ۔ پریشانیوں اور الجھنوں نے جہاں دار کو کچل کر رکھ دیا ۔ ۳۱ مئی ۱۷۸۸ء کو چنار سے واپسی پر اسے سینے میں درد آٹھا اور اگلے روز اس نے جان جان آفریں کے سپرد کر دی ۔

(۱۲)

جہاں دار کی وفات کی تاریخ ۲۵ شعبان ۱۲۰۲ھ/یکم جون ۱۷۸۸ء ہے ۔ جناب استیاز علی شاہ عرشی کا خیال یہ ہے کہ انتقال ذی قعدہ ۱۲۰۲ھ کے بعد کی کسی تاریخ کو ہوا ہوگا ۔ ان کے اصل الفاظ یہ ہیں :

”لالہ سری رام اور امیر احمد علوی صاحب نے سنہ ۱۲۰۱ھ میں جہاں دار شاہ کا انتقال لکھا ہے ۔ مگر یہل کہتا ہے کہ ۲۵ شعبان سنہ ۱۲۰۲ھ (۱۳ مئی ۱۷۸۸ء) کو فوت ہوئے“ : (فٹ نوٹ) ۔ مجھے اس سنہ میں شک ہے ۔ اس لیے کہ انشائے لچھمی لرائن دیبر (ورق ۸۴ ب) میں ان کا ایک شدہ بد نام شرف الدین حسین خاں نقل ہوا ہے اس میں شہزادے نے غلام تادری کی گستاخی کا تذکرہ کر کے لکھا ہے کہ ہم لشکر لے کر دلی کی طرف جا رہے ہیں ۔ تم دولت تیموریہ کے بولنے

1. Ibid. p. 144.

ہیں خواہ ہو ، اس شقے کو دیکھتے ہیں ۱۰ ہزار چیدہ سوار
 ۵ ہزار لیادے ساتھ لے کر فرخ آباد میں ہم سے ملو -
 - لاکھ روپے مصارف کے لیے خزانے سے بھیجے جا رہے ہیں -
 جہاں تمہارے پہنچنے پر داروغہ کی ٹوپ خانہ کا عہدہ عطا ہوگا -
 شاہ عالم ۷ ذی قعدہ سنہ ۱۱۲۰۲ھ کو ٹاپینا کیے گئے تھے -
 غلام قادر خان ۱۲ ذی حجہ سنہ مذکورہ کو دہلی سے نکل کر
 ربیع الاول سنہ ۱۱۲۰۳ھ (ستمبر ۱۷۸۸ء) میں گرفتار ہوا ہے ،
 ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا شدہ ذی قعدہ سنہ ۱۱۲۰۲ھ اور
 ربیع الاول سنہ ۱۱۲۰۳ھ کے درمیان لکھا گیا ہوگا - اس صورت
 میں جہاں دار شاہ کا انتقال شعبان سنہ ۱۱۲۰۲ھ میں کس طرح
 ہو سکتا ہے ؟

عرشی صاحب کو مفالطہ ہوا ہے - اس شقے میں شہزادے نے جس
 واقعے کا حوالہ دیا ہے وہ شاہ عالم ثانی کی کوری کا واقعہ (ذی قعدہ سنہ
 ۱۱۲۰۲ھ) نہیں بلکہ جہاں اس ذلت کی طرف اشارہ ہے جو شاہ عالم کو
 ۵ ستمبر ۱۷۸۷ء کے فوراً بعد آٹھائی بڑی تھی - غلام قادر نے دلی میں
 داخلے کے بعد شاہ عالم کو دھمکیا لیا کہ اگر اس کی مرضی کے مطابق
 نہ چلا گیا تو وہ سلام کرنے کے لیے تخت پر کوئی دوسرا آتا بلٹھا دے گا -
 اس واقعے کا ذکر شاہ عالم نے گورنر جنرل ، آصف الدولہ اور جہاں دار
 کے نام کے خط میں کیا تھا^۱ - بیل کے بیان کردہ سنہ وفات کی تائید قتل
 سلطان (جینا بیگم) کے خط سے بھی ہوتی ہے - قتل سلطان خود جہاں دار
 کے بستر مرگ پر موجود تھے^۲ اس لیے اس کا بیان سب سے زیادہ معتبر
 ہے - بیل نے ہجری تاریخ کو عیسوی میں بدلتے ہوئے ایک دن کا فرق ڈالا

۱ - "تذرات شاہی" (دیباچہ) صفحہ ۵۲ ، ۵۳ متن و حاشیہ -

2. Indian Records Commission.....(Abdul Ali)
 p. 142

I.D.R. Original Persian Letter received 16
 Sept. 1787

۳ - دیکھیے دیوان جہاں دار (مرتبہ وحید قریشی) ضمیمہ ۴ جس میں قتل
 سلطان بیگم کا خط اور جہاں دار کی آخری دن کی دو تحریریں درج ہیں -

ہے اور اسے یکم جون کی بجائے ۳۱ مئی کا واقعہ قرار دیا ہے۔ جنوری کے حساب سے ایک دن کا فرق ممکن ہے۔ صحیح تاریخ ۲۵ شہبان ۱۱۲۲ھ / یکم جون ۱۷۸۸ء ہے۔

(۱۳)

جہاندار شاہ کی سدرجہ ذیل تصانیف کا ہٹا چلتا ہے :

۱۔ ”دلی سے فرار کی داستان“ : اصل متن ٹائپ ہے لیکن اس کا انگریزی ترجمہ (جو وارن ہیشنگز گورنر جنرل کے فارسی نوٹس منشی جوئے ٹین سکاٹ نے کیا تھا) چھپا ہوا موجود ہے۔ دیکھیے ”Memoirs relative to the State of India“ از وارن ہیشنگز طبع لندن ۱۷۷۶ء کے صفحات ۱۶۳ تا ۱۹۶۔

۲۔ ”شعرا کا تذکرہ“ : ”طبقات شعرائے ہند“ میں لکھا ہے کہ : ”(علیٰ ابراہیم) بیان کرتا ہے کہ اس (جہان دار) نے ایک تذکرہ اور تالیف کیا تھا لیکن یہ سب اس کے مر جانے کے بعد ہورا نہ ہوئے ہایا۔ مگر یہ معلوم نہیں کہ کس طور پر وہ امام بخش کشمیری کے پاس رہ گیا جو اس نے اس کا انتہال (کذا) کر لیا۔“

امام بخش کشمیری نے دواہل مرزا جہان دار شاہ کے انتقال کے بعد اس کی بیاض نیز مصحفی کا تذکرہ شامل کر کے اپنا ”تذکرۃ الشعرا“ ترتیب دے لیا تھا۔ چنانچہ مصحفی حقیقت کے حال میں لکھتے ہیں :

”میر شاہ حسین المتخلص بہ حلیۃ شاگرد جرات . . . بہ لکھنؤ بہ سن تجیز رسیدہ . . . ملازادہ و خوشی بہ است ، پیش ازین در ترک سواران نوکر بود و در آن روزہای سردی و نوشقی اکثر بہ کتابت غزل ہای استاد خویش کہ بہ سبب کوری از نوشتن معذور است ، مصروف می ماند۔ چون رسالہ ایشان

برهم خورد امام بخش کشمیری که باوصف جاہلی از مدق خیال
جمع کردن اشعار اسانده در سر داشت، روزی از جرأت درخواست
شخصی کرد که ہم به تعلیم کو دکان متوجه شود و ہم به
نوشتن تذکره مصروف باشد - مشارالیه او را آورده و روبرو کرد
و مدت بر طرفین گذاشت - غرض که حسب الارشاد موسی الیه،
به پشت گرمی کور موصلی که به ہمسری من می رود و در
باطن نفیم کینه می کاود، او ہم تذکره نوشته درست ساخته است !
اما طرفه این است که خان مذکور پیش ازین روزی بر مکان
فقیر آمده بالحاج تمام مسوده خام تذکره مرا که درین مدت به
پیچ کس نه نموده بودم، از من طلب نمود - من سانه دل غافل
از فطرت و یدذاتی کشمیریان سابقه معرفت شاه جهان آباد آدیت
را کلو فرموده اجزای مسوده تذکره خود را حواله کردم - در
عرصه یک دو روز خفیه از من اشعار و احوال شعرای ذہلی
و غیره که من به محنت تمام بهم رسانیده بودم، از دست حقیقت
بی حقیقت نقل کنانید و دیگر بیاض و چنگ جهان دار شاه که
بعد فوت ایشان پیش او مانده بود، چیزی ازو و چیزی از جای
دیگر اخذ نموده، هرگاه مسوده تذکره بی مغرض که آن را پیچ
دالا نه پسندد، فی الجمله صورت گرفت - روزی یکی از آشنایان
جزو اول آن مجموعه آورده بمن نمود، غافل ازین مقوله که گفته
الد - شعر :

پتیری آب دادن نشاید به پیش
که بیند دوو قطره خون خویش

چون دوو نظر کردم دیدم که همین تخلص آفتاب و آصف بطور
تذکره من درو نوشته است - بسیار برهم شدم و تنخص احوال
کردم - مشارالیه حقیقت تذکره نویسانیدن امام بخش خان بگوش
من رسانیده، اگرچه مرا در بادی النظر از حرکت این اصحاب
تلاشه آزردگی، کمال بهم رسانیده بود، قریب بود که بچو
از من سر زاند، اما چون عبارت بوج و غلطی احوال و اشعار
شعرا را در آن جریده سمت تحریر یافته نگاه کردم آسوده شدم و

در گزشتہ و بر ہمین قطعہ طبع زاد خود و یک بیت سولانا جاسی
اکتفا کردم :

قطعہ

جانتے ہیں سب کہ اک ملت یہاں
مصحنی کے تذکرہ کا شور ہے
تذکرہ ہم جو حقیقت نے لکھا
ہے حقیقت مصحنی کا چور ہے

اگر ہر فروزی چو مد صد چراغ
ز خورشید باشد پرو قام داغ

غرض کہ چاہی علی قلی خان است ۱۔

۳۔ ”دیوان جہاں دار“ — معلومہ لائبریریوں میں اس کے صرف دو
قلمی نسخوں کا علم ہے ۔ ایک الذا آفس کا نسخہ جو
وارن ہسٹنگز کو خود شہزادے نے پیش کیا تھا اور دوسرا
پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا نسخہ جو ذخیرۂ آذر میں ۸۷۰۸ء
پر موجود ہے ۔

(۳۱)

صرف جہاں دار ہی شعر و شاعری کا ذوق نہیں رکھتے تھے بلکہ اس
خانوادے کے بعض دوسرے لوگ بھی شاعری سے بہرہ ور اور شعرا کے
نقدردان تھے ۔ باپ (شاہ عالم) کے علاوہ حقیقی ماموں بھی شاعر تھے ۔
”جموعہ“ ”غز“ میں ”اکبر“ تخلص کے تحت لکھا ہے :

”اکبر ، مکرم الدولہ سید اکبر علی خان بہادر مستقیم جنگ
برادر حقیقی عصمت قباب لواب تاج محل صاحبہ والدہ ماجدہ
مرشد زادۂ جہاں و جہانیاں جوان بخت مرزا جہاں دار شاہ

بہادر انار اللہ برہانہ - جسے جولائی ۱۷۵۰ء میں ہوا ، ہاکیڑہ سیر ،
خوش اختطاط ، با تمکین ، نیک معاش ، طبع رنگین ، ذی شوکت
و جاہ ، با ثروت (و) حشمت پناہ - در علم موسیقی دہشتے داشت -
گاہی بد فکر ریختہ ہمت می گداشت - از چندے بیچار و رحمت حق
پیوستہ ۱۷۵۰ء

چھوٹا بھائی جو بھائی کی وفات کے بعد ولی عہد سلطنت ہوا وہ بھی
شاعری کا ذوق رکھتا تھا اور شعاعِ قلم سے کھینچ کر لیا ، اسی طرح شہزادہ
سلطان شکوہ صاحب دیوان اور لکھنؤ کے شعرا کا مرثیہ خاص تھا - جہاں دار
کی بیگم ثانی سلطان (جینا بیگم) بھی شاعرہ تھیں ۲ - بڑا بیٹا مرزا شگفتہ بخت
بہادر عرف حاجی صاحب کے بارے میں ”مجموعہ“ نغز“ میں ہے :

”مرزا شگفتہ بخت بہادر عرف مرزا حاجی صاحب خلف الصدیق
صاحب عالم و عالمیان مرشد زادہ جہان و جہانیان ، مرزا
جوان بخت جہاں دار شاہ بہادر انار اللہ برہانہ کہ با پدر والا قدر
بمالک شرقیہ تشریف شریف اوزانی فرمودہ ، بہ بعد آباد بنارس
طرح اقامت افگندہ بہ ترقیہ و تعیش ایام خجستہ فرجام بسر
می فرمایند - سرانہ آن جا سعادت خود انکاشتہ حوائج ضروریہ
سرکار دولت مدار آن کاسگار می رسانند - از طبع وقاد جناب
ایشان گاہ گاہ شعر ریختہ بساز ہاکیڑہ و بُر مزہ می ویزد“ ۳ -

اس شہزادے کے متوالین میں میر حیدر علی خان حیدر کا ذکر بھی
پایا جاتا ہے :

”میر حیدر علی خان - وی از اولاد امجاد حضرت ... غوث صدیقی
است ... مولدش دارالسلطنت لاہور و اکثر اوان و فرخندہ
توانان زندگانش بتواج دہلی و دیار شرقیہ انجام رسانیدہ و گرم

۱ - مجموعہ نغز (قاسم) صفحہ ۶۷ -

۲ - ایضاً صفحہ ۳۳۳ ، ۳۳۴ -

۳ - ایضاً صفحہ ۱۷۸ -

۴ - مجموعہ ”نغز“ (قاسم) جلد دوم ، صفحہ ۳۳۸ -

و سرد زمانہ بسیار دیدہ - مدتی بہ بلاد ہند آباد بنارس مصاحبت
شاہ زادہ لاسدار کامکار مرزا شگفتہ بہت جہاد دام اجلالہ مختار و
سرفراز بودا“۔

شگفتہ بہت کے علاوہ جہاں دار کے دوسرے لڑکے مرزا حرم کے
ملازموں میں لالہ ٹیک چند اشکر شاعر ہو گزرا ہے :

”اشکر تخلص لالہ ٹیک چند دیوان مرزا خورم (کذا) صاحب
فرزادہ ارجمند مرزا جہاں دار شاہ مرحوم است“۔

جہاں دار کے تیسرے صاحب زادے مرزا عالی قدر کے بارے میں
معلوم نہیں کہ شعر کا ذوق رکھتے تھے یا نہیں۔ خاندان کا حال بتاتے ہوئے
لالہ سری رام ”خطباتہ“ جاوید“ میں لکھتے ہیں کہ آپ (جہاں دار) کی اولاد
کا سلسلہ بنارس میں اب تک موجود ہے۔“

۱ - ایضاً صفحہ ۲۲۶ -

۲ - ایضاً (جلد دوم) صفحہ ۳۷۳ -

۳ - ”خطباتہ“ جاوید“ (جلد دوم) صفحہ ۲۲۲ -

مقدمہ: کلام آتش۔ تحقیقی جائزہ

(۱)

ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی کا نام اردو ادب کے لیے لیا نہیں۔ اول اول ان کی شہرت کلام آتش کے جائزے کی وجہ سے ہوئی جسے انہوں نے رسالہ نکار میں نسط وار شائع کیا۔ کلام آتش کے مطالعے کا انہوں نے ایک لیا زاویہ دریافت کیا تھا اس لیے اس مضمون کی بڑی قدر ہوئی اور اسی زمانے میں اس سلسلہ مضامین کو کتابی صورت میں شائع کرنے کی تحریک ہوئی، لیکن یہ محض اتفاق تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی دوسری کتابیں اس سے پہلے چھپ گئیں۔ فکر و فن، کاغذی پیرہن اور نوائے ظفر (جو کلام آتش کے بعد کی چیزیں ہیں) پہلے شائع ہو گئیں اور اس کتاب کی اشاعت کی نوبت کہیں دسمبر ۱۹۵۹ء میں آئی۔

کتاب کے شروع میں پروفیسر آل احمد سرور کا دیباچہ بھی ہے جس میں بعض بڑے عجیب و غریب دعوے کیے گئے ہیں۔ سرور صاحب کی تقلید بہت کچھ ادبی چشمخارہ رکھتی ہے اس لیے اگر وہ کوئی غلط بات بھی کہتے ہیں تو الداز بیان کی دلکشی پردہ پوش ہو جاتی ہے۔ اس مضمون میں بھی ان کے الداز بیان نے اکثر غلط بیانات کی پردہ پوشی کی ہے۔

(۲)

ڈاکٹر خلیل الرحمن نے کتاب کو نو ابواب میں تقسیم کیا ہے، پہلے باب میں آتش کے حالات زندگی ترتیب دیے گئے ہیں، دوسرے باب میں آتش کے بارے میں نقادوں نے جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ درج ہے، تین ابواب میں آتش کے فن کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے، چھٹے باب میں آتش کی عشقیہ شاعری، ساتویں میں خمریات، آٹھویں میں تصوف اور نویں میں مسائل حیات کو موضوع بنایا گیا ہے۔

کتاب کا سب سے اچھا حصہ وہ ہے جو پہلے دو باب چھوڑ کر شروع ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اعظمی نے آتش پر یہ مولوگراف لکھ کر اردو ادب میں علمی کلام کا اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔ وہ ان ترقی پسند نقادوں میں سے نہیں ہیں جو محض رئے رائے جملوں کی مدد سے شاعر کو اپنے ذاتی عقائد کی تبلیغ کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کلام کا جائزہ لینے سے پہلے شاعر کے ماحول اور اس کے حالات زندگی کو بھی تفصیل سے دیکھتے ہیں۔ آتش کی زندگی، شخصیت اور فن کے درمیان ڈاکٹر صاحب کو ایک بنیادی ربط دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے آتش پر تالیف کے زمانے تک رسائل و کتب میں جو کچھ شائع ہوا تھا یکجا کر کے اس کے بعض بنیادی علمی مباحث تک رسائی حاصل کی ہے، اس لیے آتش کے حالات زندگی اور شخصیت پر ڈاکٹر صاحب کی گرفت مضبوط ہے؛ لیکن کہیں کہیں ان سے معمولی فروگزاشیں بھی ہوئی ہیں، مثلاً صفحہ ۱۹ پر وہ آتش کی پیدائش کے سنہ کا تعین کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”آتش کی پیدائش فیض آباد میں ہوئی، سنہ پیدائش کی صحیح تحقیق نہ ہو سکی۔ مصحفی نے ریاض الفصحا میں ان کی عمر ۲۹ سال بتائی ہے۔ مصحفی نے یہ تذکرہ ۱۲۲۱ھ میں لکھنا شروع کیا تھا اور ۱۲۳۶ھ میں اس کی تکمیل کی، کیونکہ آتش کے حالات تذکرے کے شروع ہی میں درج ہیں اس لیے قیاس کیا جاتا ہے کہ آتش ۱۲۱۱ھ میں پیدا ہوئے۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت کے ایک بیان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس اثنا میں نواب شجاع الدولہ بہادر نے اپنے فرزند نواب آصف الدولہ بہادر کی شادی خان خاتون کی بیوی سے کی، جس میں ۲۴ لاکھ روپیہ صرف کیا۔ یہ واقعہ (۱۲۸۶ھ) ۱۱۸۸ھ کا ہے۔ یہ چھل چل ہو رہی تھی کہ خواجہ علی بخش کے گھر میں خواجہ علی حیدر آتش پیدا ہوئے، یعنی نواب آصف الدولہ کی شادی سے تین سال بعد آتش کی پیدائش ہوئی۔ کیونکہ یہ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی اس لیے اس کی چھل چلے اور رنگ رلیاں کئی سال تک باقی رہی ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔“

ڈاکٹر صاحب کا یہ بیان بعض اعتبارات سے محل نظر ہے ، مثلاً ان کا یہ اصول کہ جس شاعر کا حال تذکرے کے شروع میں ہو اس کے حالات لازماً ابتدائی سال ہی میں لکھے گئے ہوں گے کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ عشرت کا بیان جو انہوں نے اپنے قیاس کی تائید میں استعمال کیا ہے وہ بھی کچھ ایسا درست نہیں۔ عشرت نے آصف الدولہ کی شادی کا تذکرہ کیا ہے جو ۱۸۸۵ء کا نہیں بلکہ ۱۸۸۵ء کا واقعہ ہے۔ اس طرح ان کے موجودہ سنہ پیدائش اور آصف الدولہ کی شادی کے درمیان سات مزیں کا فرق ہو جاتا ہے۔ اس شادی کے بارے میں یہ خیال کرنا کہ اس کی پہل پہل اور رنگ رلیاں کتنی سال تک باقی رہی ہوں گی حقیقت کے خلاف ہے۔

صفحہ ۲۰ پر ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں :

”فیض آباد میں آتش کی شاعرانہ صلاحیت اور سپاہیانہ بالکین نے نواب محمد تقی خان ترقی کو متاثر کیا جو شعر اور سہ گری دونوں کے دل دادہ تھے۔ آتش اور ناسخ دونوں نے نواب صاحب کی ملازمت اختیار کی ، جب نواب صاحب غازی الدین حیدر کے عہد میں فیض آباد سے ترکہ سکونت اختیار کر کے لکھنؤ آ گئے تو آتش نے بھی لکھنؤ کو اپنا مسکن بنایا... اسی زمانے میں آتش مصحفی کے شاگرد ہوئے۔“

نواب محمد تقی خان ترقی کے حالات بقصر التواریخ^۱، تاریخ اودہ (تیم الغنی)^۲ اور تاریخ فرح بخشی میں پائے جاتے ہیں۔ تاریخ فرح بخشی^۳ میں محمد تقی کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ۱۲۳۰ھ میں فیض آباد چھوڑ کر لکھنؤ میں آ بسے گویا ڈاکٹر صاحب کے نزدیک بھی وہ زمانہ ہے جب آتش مصحفی کے شاگرد ہوئے، لیکن صفحہ ۱۹ پر ڈاکٹر صاحب نے خود لکھا ہے کہ مصحفی نے آغاز تذکرہ کے وقت ۱۲۲۱ھ کے لکھ بھگ آتش کا ذکر کیا ہے۔ مصحفی نے آتش کے حال میں اپنے اپنا شاگرد بیان کیا ہے لیکن

۱۔ جلد اول صفحہ ۱۸۹، ۱۹۱، ۱۹۳۔

۲۔ جلد چہارم صفحہ ۳۲۸۔

۳۔ الکربری ترجمہ، جلد دوم صفحہ ۳۶۶، ۲۹۳، ۳۰۲۔

۱۲۲۶ء میں غازی حیدر کا زمانہ نہیں ہے۔ غازی الدین حیدر کی تخت نشینی ۱۲۲۹ء میں ہوئی، اس لیے ڈاکٹر صاحب کا پہلا استدلال غلط ہے۔ ہمارے خیال میں صحفی نے آتش کا حال ۱۲۳۰ء اور ۱۲۳۶ء کے مابین لکھا۔ اگر ۱۲۳۰ء میں داخل تذکرہ کیا ہو تو ہیدائش ۱۲۰۱ء میں ہوئی ورنہ محض طریق بیان یہ ہے کہ آتش کی ہیدائش ۱۲۰۱ء اور ۱۲۰۷ء کے مابین ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب صفحہ ۲۲ پر فرماتے ہیں :

”لکھنؤ پہنچنے کے کچھ ہی دنوں بعد نواب محمد آلی خان ترقی کا انتقال ہو گیا۔“

کچھ ہی دنوں بعد کا ٹنکڑا سچہ میں نہیں آتا۔ محمد آلی خان ترقی ۱۲۳۰ء میں لکھنؤ آ گئے اور ۱۲۳۳ء تک یقیناً زندہ تھے !

(۴)

ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی تنقید میں اپنا ایک منفرد اسلوب رکھتے ہیں۔ وہ فراق گورکھپوری کے ”اثرائی انداز“ سے بھی متاثر ہیں ؛ لیکن فراق صاحب کے مقالے میں زیادہ واضح نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ لکھنؤ کی شاعری اور کلام آتش پر اس کے اثرات کو انہوں نے بڑے سلیس انداز سے بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں :

”آتش کے کلام میں زائد عناصر کا سبب لکھنؤ کا وہ شاعرانہ ماحول ہے جہاں دو غزلے سے غزلے لکھنا، ایک غزل میں تعداد کے اعتبار سے زیادہ شعر نکالنا، ایک قافیے کو پانچ چھ بار بالادھنا اور اس سے نئے نئے مفہوم پیدا کرنا، لفظی رعایت اور مناسبت کا خیال رکھنا کمال فن سمجھا جاتا تھا۔ آتش بھی لکھنؤ میں استادی کے سرچے پر فائز تھے اور سیکڑوں شاگردوں کی رہنمائی اور اصلاح کے علاوہ انہیں اپنے حریف قاسم کو نیچا

دکھانے کی بھی بڑی رہتی تھی، اس لیے اس طرز کی غزل گوئی سے انہیں مفر نہ تھا۔ لیکن آتش اور ناسخ دونوں کی شخصیتوں میں فرق تھا۔ ناسخ کے پاس صرف کرب تھا، استادہ اور زبان دانی کا دعویٰ تھا؛ لیکن آتش اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ وہ وجدان اور احساس چال کے مالک تھے اور ان کے حواس خمسہ پورے طور پر بیدار تھے۔ زندگی کے گونا گون تجربات سے متاثر ہونا اور انہیں ہضم کر کے اپنی تخلیقات میں آب و رنگ دینا بھی انہیں آتا تھا۔ اس لیے جب بھی ان کے اندر کا شاعر بیدار رہتا تھا اور جذبہٴ تخلیق ان کا ساتھ دیتا تھا وہ حقیقی شاعری کا دامن نہیں چھوڑتے تھے۔ چونکہ ان کا بہترین کلام سچے انسانی جذبات و احساسات سے معمور ہے اس لیے وہ موثر ہے لیکن فنی تکمیل میں وہ ناسخ کے بھی مرہون منت ہیں۔ یہ اس طور پر کہ اصلاح زبان کی تحریک کے اثر سے اس وقت لکھنؤ کی زبان میں جو قراش خراش ہو رہی تھی، جو سلاست و روانی، جو چستی و صفائی اور جو نکھار پیدا ہو رہا تھا، اس سے آتش نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا“ (ص ۸۸)۔

اس اقتباس کے پہلے حصے میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے ادب کا ہر طالب علم واقف ہے لیکن دوسرے حصے میں ڈاکٹر صاحب نے اس کی کڑیاں آتش کی شخصیت اور فن کے ساتھ ملا کر لکھنؤی شاعری کے اثرات کو جس انوکھے زاویے سے پیش کیا ہے وہ ان کی تنقیدی بصیرت کو ظاہر کرتا ہے۔ عام نقاد تنقید میں بات کو جہاں لا کر ختم کرتے ہیں ڈاکٹر صاحب اپنے استدلال کا آغاز وہاں سے کر کے شاعر کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ایک نیا زاویہ اختیار کرتے ہیں۔ یوں نیا زاویہ دریافت کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے لیکن اگر وہ نیا زاویہ شاعر کے کلام کی مدد سے بڑی طرح ثابت بھی کر دیا جائے اور قاری کو یہ یقین ہو جائے کہ جس نظر سے وہ شاعر کو پہلے دیکھ رہا تھا وہ کچھ ایسی صحیح نہ تھی اور جس زاویے سے اب دیکھ رہا ہے وہ شاعر کو سمجھنے کے لیے بہترین نقطہ آغاز ہے تو پھر ڈاکٹر صاحب کے نتائج کی صحت پر ایمان لانا ہی پڑتا ہے۔

آتش کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں :

”فن شعر میں تشبیہ و استعارہ جہاں شعر کے حسن میں اضافہ کرتا ہے وہاں کبھی کبھی فنکار کے عجز کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ تشبیہ و استعارہ زندگی کے تھوس مادی حقائق، تلخ ترین تجربات کو جالیاتی پیکر میں ڈھالنے کا موزوں ترین وسیلہ ہے، لیکن جب شاعر کے یہاں یہی شے مقصود بالذات بن جائے تو اس کے اشعار تاثیر سے دور جا پڑتے ہیں اور شعر محض بازی گری کا نمونہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ آتش نے اپنے تجربات و احساسات کے اظہار کے لیے جہاں بھی اس وسیلے کی تلاش کی ہے وہاں اپنی شخصیت کے وجدانی اور جالیاتی عناصر کی مدد سے ان تشبیہات و استعارات میں نئی جان ڈال دی ہے (ص ۹۹)۔

آتش کی عشقیہ شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے اٹھوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں :

اگر ہم آتش کی عشقیہ شاعری کا مطالعہ کریں تو اس کی انفرادیت کئی اعتبار سے ہمارے سامنے آہر آتی ہے۔ ایک طرف تو یہ شاعری بازاری محبت اور ہوس ناکی کی ڈگر سے علیحدہ سچی اور ’ہر خلوص محبت اور لطیف ترین انسانی تعلق کی بنیاد پر ہے‘ دوسری طرف یہ اس ’ہر خلوص عشقیہ شاعری سے ایک علیحدہ فضا قائم رکھتی ہے یہاں صرف ناکامی و ناسرمدی، یاس و حسرت اور ہڈیوں کو پکھلا دینے والے غم سے واسطہ پڑتا ہے اور باوجود صداقت شعری کے کبھی کبھی اس سے طبیعت دب جاتی ہے۔ کیونکہ یہ عشقیہ شاعری تمام کیفیات کو صرف ایک مرکز پر لا کر کھڑا کر دیتی ہے اور یہ ہے عاشق کے دل کا درد اور اس کا داخلی سوز و گداز۔ یہاں ہم کو محبوب کے جمال سے کم از کم واسطہ پڑتا ہے اور نہ اس کی شخصیت ہی کی رنگا رنگ جھلکیاں ہم دیکھ سکتے ہیں اس لیے یہ شاعری بعض اوقات ہماری بہت سی جذباتی اور جالیاتی کیفیات کا ساتھ دینے میں ناکام رہتی ہے اور ہمیں بڑے طور

پر تسکین نہیں ہوتی۔ آتش نے لکھنؤ کے نشاطیہ ماحول اور اپنی شخصیت کے کسی ہل کو آسز کر کے اپنی عشقیہ شاعری میں کچھ ایسی فضا دی ہے جہاں شعرائے دہلی کے برخلاف ہمیں محض نامرادی و یاس الگیزی سے واسطہ نہیں پڑتا بلکہ اس میں محبوب بھی اپنی مکمل جلوہ سامانیوں کے ساتھ آتا ہے۔ جہاں عاشق اور معشوق دونوں اپنی نفسیات کے ساتھ ملتے ہیں اور اس طور پر ایک بھرپور عشق کا احساس ہونے لگتا ہے۔ آتش کی شاعری میں عاشق میں بھی ہانکپن رہتا ہے اور محبوب بھی اس کی دل جوئی اور وفاداری میں بہت کچھ اس کا ساتھ دیتا ہے۔ یہ محبوب بازاری نہیں ہے بلکہ عصمت و حیا اور عفت و پاکیزگی کے ان تمام زیوروں سے آراستہ ہے جس کی محبت کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ یہ فضا آتش کی عشقیہ شاعری کو رنگا رنگ اور وسیع بناتی ہے اور اس میں نشاط و سرمستی، لطافت و نزاکت، جان بہاری و دلنوازی کے ایسے ایسے پہلو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے جس سے ہم پر ایک خوش گوار اور صحت مند اثر ہوتا ہے“ (ص ۱۰۹ - ۱۱۰)۔

اس طرح آتش کی شاعری کے صوفیانہ پہلو کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے بڑے ہتے کی بات کہی ہے :

”آتش کی صوفیانہ شاعری کو فارسی کی صوفیانہ شاعری کے اعلیٰ معیار سے دیکھا جائے تو شاید یہ حصہ اپنی شعریت اور تاثیر کے لحاظ سے کمزور نظر آئے گا کیونکہ صوفیانہ شاعری میں کلیت پیدا کرنے کے لیے جس سوز و گداز، سپردگی و بھویت و رقیق القلبی کی ضرورت ہے وہ آتش کی شخصیت اور مزاج کا عنصر نہیں ہے؛ لیکن جب ہم لکھنؤ کے تاریخی پس منظر میں اس کا جائزہ لیتے ہیں تو اس کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ آتش نے اپنی اتحاد طبع اور رجائی لفظہ نظر کی بنا پر تصویر کو اپنے لفظہ نظر یا اس زاویے سے استعمال کیا ہے کہ اس سے مثبت نتائج نکل آئے ہیں اور بجائے یاسیت اور قنوطیت یا زندگی سے گریز کے ایک طرح کی قوتِ نمو ملتی ہے“ (ص ۱۳۳ - ۱۳۴)۔

ان اقتباسات سے تنقید میں ڈاکٹر صاحب کے عام رجحانات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ نہ ماحول کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے بےشہ ورتق ہستندوں کی طرح اصل شاعر کو نظر انداز کر دیتے ہیں، نہ ثانوی نقادوں کی طرح انفرادی خصوصیات پر زور دے کر نیا پیرو دریافت کرتے ہیں۔ شاعر کے کلام کے مطالعے سے انہوں نے بعض بنیادی رجحانات دریافت کیے ہیں اور انہیں شاعر کے ماحول اور اس کی شخصیت کے پس منظر میں رکھ کر دیکھا ہے۔ اردو شاعروں کا اس نوعیت کا مطالعہ ابھی ہمارے ہاں رواج پذیر نہیں ہوا۔ اردو ادب کو یا تو ایسے نقاد ملے ہیں جو بعض تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات نکالنے کے ماہر تھے یا پھر ایسے نقادوں سے بالا ہڑا ہے جو اردو شاعری کے پس منظر سے کچھ واقفیت نہیں رکھتے، بعض اندازے اور شکل سے تنقید کرتے ہیں۔ اعظمی ان چند نقادوں میں سے ہیں جن پر ان میں سے کوئی لیبل بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ وہ تنقیدی بصیرت بھی رکھتے ہیں، قدیم ادب سے انہیں لگاؤ بھی ہے اور اس ماحول کو بھی سمجھنے میں جس میں ہمارے شاعر زندگی بسر کرتے تھے۔ انہیں سواڑنے کا وہ شوق بھی نہیں ہے جو غالب کو گولٹے اور نظیر اکبر آبادی کو شیکسپیر سے ٹکرا دیتا ہے، اس لیے ان کے نتائج بڑی حد تک صحیح ہیں۔ تنقیدی اصولوں کے بارے میں ان کا ذہن بہت سے نقادوں کے مقابلے میں صاف ہے۔

گلستان سخن ایک تجزیہ

(۱)

شاہ زادہ قادر بخش صابر ، مغلیہ خاندان کا چشم و چراغ ، جس کے خاندان میں کئی اردو اور فارسی کے شاعر گزرے ہیں ، شعر و شاعری میں دسترس رکھتا تھا ۔ اس کا ثبوت اس کے دیوان ’ریاض صابر‘ سے ہو سکتا ہے ۔ گلستان سخن میں بھی اس کے جو حالات درج ہیں ان سے ان کی شعر گوئی کے بارے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی ، لیکن تذکرہ نگاری کی بات دوسری ہے ۔ اس میں خود گلستان سخن کی ابتدائی اشاعت میں سرورق کی عبارت ہے کہ یہ صہبائی کی اصلاح ہے مزلین ہے اور صابر کے معاصر تذکرہ نگاروں میں بھی بعض اسے صہبائی کی تصنیف نہیں مانتے ؛ باوجودیکہ سرورق پر صابر کا نام ہے ، طور مصلح درج ہے ۔ شاہ بہاؤ الدین بشیر معروف ہے عبداللہ شاہ ، جو شاہ نصیر کے چھوٹے بیٹے شاہ نجم الدین کے حنفی نواسے تھے اور جنہوں نے (۱۰) توحید و تہذیب ’مجم خانہ‘ جاوید‘ جلد اول ، ص ۶۹) کے لگ بھگ بیانات پائی ۔ ان کا بیان ہے :

لا

”گلستان سخن ۱۲۷۱ھ صاحب عالم مرزا قادر بخش صابر لکھے

نام سے مشہور ہے ، مگر حقیقت میں ان کے اسناد دہلوی

۱۲

۱ - گزشتہ کتاب میں نے اردو تذکروں پر ۱۸۵۵ء میں ایک کتاب لکھا تھا ، اس کی اشاعت کے دوسرے سال شمس العلماء دہلوی ذکاۃ اللہ دہلوی نے اس کا اردو ترجمہ شائع کیا (گارساں دہلوی نے قلمی کثر زور ص ۳) ۔ خوش قسمتی سے یہ ترجمہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے ۔ اس کے حاشیوں پر بغیر دستخطوں کے کئی ترقیاتی حواشی درج ہیں ۔ یہی تحریریں بعض دوسری کتابوں پر موجود ہیں اور وہاں

باقی جلد ۱۸۲

۱۸۲ - ۱

۱۸۲ - ۱

امام بخش صہبائی جنت ساوائی کی تصنیف ہے ۔ اس کی عبارتیں اس بات کی شاہد ہیں اور اس شہر کے خاص خاص اشخاص کو یہ حال معلوم ہے ۔^۱

بہر فرماتے ہیں :

”گلستان سخن ۱۲۷۱ مرزا صاحب کے نام سے مشہور ہے مگر درحقیقت مولوی صہبائی کی تصنیف ہے ۔ اس میں فارسی اردو دونوں زبانوں کے شاعروں کا حال و مقال مندرج ہے ۔“^۲

دوسری معاصر شہادت غالب کی ہو سکتی ہے لیکن ان کے بیانات متضاد ہیں ۔ ایک خط میں وہ ذکاء کو لکھتے ہوئے گلستان سخن کو صابر کا تذکرہ قرار دیتے ہیں لیکن اس سے پہلے انہوں نے شفیق کو جو خط لکھا تھا اس میں فرماتے ہیں کہ ”صہبائی کے تذکرے کی ایک جلد نذر کر رہا ہوں“ ۔ معلوم نہیں اس مقام پر اس سے مراد گلستان سخن ہے یا صہبائی کے انتخاب دواوین کا ذکر کر رہے ہیں جو خود ایک تذکرے کی حیثیت

پاتی فٹ لوٹ صفحہ ۱۸۱

بشیر کا نام صاف طور پر مرقوم ہے ۔ اس لیے یہ حواشی ، جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ، بشیر ہی کے لکھے ہوئے ہیں ۔ ۱۸۵۳ء یا ۱۸۵۵ء میں گلستان سخن تکمیل کو پہنچا تھا اس لیے مقالہ ”دقاسی کے متن میں اس تذکرے کا ذکر نہیں ہے ؛ لیکن طبع ثانی کے وقت ، جس کی نوٹ ۱۸۶۸ء میں آئی ، کاربسی دقاسی نے نظر ثانی کی اور دوسرے ایڈیشن میں گلستان سخن کے بارے میں وہ عبارت شامل کر دی جو ”خطبات کارسان“ میں لکھی گئی تھی ۔ ڈاکٹر ریاض الحسن نے رسالہ ”اردو“ جنوری ۱۹۵۰ء میں کاربسی دقاسی کے مقالے کی اسی طبع ثانی کا اردو ترجمہ اردو تذکرے کے عنوان سے شائع کیا یہ ظاہر ریاض الحسن ، ذکاء اللہ کے اردو ترجمے سے ناواقف ہیں ۔

۱ - حاشیہ اردو تذکرے ص ۱۳ -

۲ - ایضاً ص ۱۷ -

رکھتا ہے ۔ عبدالغفور نساح ' سخن شعراء ' میں ' گلستان سخن ' کو صہبائی کی تصنیف قرار دیتے ہیں ۔ ان کا اقتباس یہ ہے :

" تذکرہ گلستان سخن ان (صابر) کے نام سے مشہور ہے لیکن حقیقت میں تذکرہ مذکور مولوی انام بخش صہبائی کا لکھا ہوا ہے ۔ " ۱

دور حاضر میں بھی یہ اختلاف چل رہا ہے ۔ چنانچہ ' خیم خانہ جاوید ' از لالہ سری رام دہلوی میں دیباچے کے پہلے اور دوسرے صفحے پر ہے :

" اس خیال سے مختلف تذکروں کی فراہمی اور مطالعہ شروع کیا ، مگر افسوس ان میں سے کوئی بھی دل میں نہ کہیا ۔ آپ حیات ، جو تلاش و تحقیقات کی انتہا ، تقلید حسد کا قابل قدر نمونہ اور اردو ادب و زبان کی خدمت میں ایثار کے ساتھ فصاحت و بلاغت اور اعلیٰ الشاء بردازی کا ایک بے مثال مرفع ہے ، اس کی نسبت شروع سے میرا یہ خیال تھا کہ یہ تذکرہ محققان زبان و مشتاقان عروض اور خاص کر مشتاقان الشاء بردازی کے حق میں خضر راہ ہوگا اور آپ حیات کا کام دے گا ، مگر جب مجھ نشہ لب سخن کی ان اوسوں سے یاس نہ بچھی تو کسی دوسرے سرچشمے کی تلاش ہوئی کیونکہ اس کے جامع نے اول تو اس میں خاص الخاص چند مشاہیر شعراء کے حال اور برائے نام کلام کے سوا دیگر مشتاقان سخن سے غرض نہیں رکھی ، دوسرے کلام بھی لیا تو یہ طور نمونہ ہی لیا ، انتخاب کا حظ نہ آئے دیا ۔ گو انہوں نے مجبوراً یہ امر اختیار کیا ورنہ چار دور کیا وہ ایک دور کے شاعر بھی نہ لکھ سکتے ۔ مگر اس سے وہ بات نہ ہوئی جس سے اپنی طبیعت کھلتی اور ان اہل درد کا میلان طبع معلوم ہوتا ۔ خدا جہوٹ نہ بلوائے نو جدید و قدیم بیسیوں تذکرے دیکھ ڈالے ، سیکڑوں بیاضیں وقت نظر کر دیں ، لیکن افسوس صد افسوس جملہ تذکروں کو عام اور ہمہ گیر پایا ۔ ان مدلولوں نے رطب و یابس ، خاص و عام بلکہ عوام الناس میں بھی کچھ تہیز نہ

رکھی۔ یہاں تک کہ بعض تذکرے تو عامیانہ درجے پر پہنچ گئے۔ بھرتی کے شاعروں اور ان کے کلام کی وہ بھرمار دیکھی کہ ان سے طبیعت بھر گئی۔ اس طوفان نے کمبزی میں تو لنگڑے لوہے پر قسم کے سوار بھرتی تھے، جنہیں قافیے کی خبر، نہ ردیف کی سہ، غویٰ مضمون سے بھٹ، نہ سوز و آہ سے لہنا۔

ہاں گلستان سخن، گلشن بے خار اس سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ دونوں تذکرے مجھے پسند آئے اور دل سے پسند آئے۔ ارکان تذکرہ نویس سے مالا مال، محققانہ پابندی سے اپنے بدوئوں کا کمال دکھا رہے تھے۔ لیکن گلستان سخن نے، جس کی تدوین، ولانا ایام بخش صہبائی نے کی اور مرزا قادر بخش صابر نے اپنے نام سے چھپوایا، دہلی سے آگے قدم بڑھانے کو ہار سمجھا۔ لفظ صابر کی رعایت سے اس نے شاہجہانی شہر بناء کے الدو کی زمین کو زمین اور اس کے اوپر کے آسمان کو آسمان جانا۔ صرف سروافدان دہلی سے کام رکھا، باہر کے لہلہاتے ہوئے شمشادوں کو وہیں کا وہیں کھڑا رہنے دیا۔ البتہ دوسرے گلشن سدا بہار سے خاص خاص رنگ کے پھول چنے اور ان کے گل دمچے بنائے، مگر پھر بھی چمنستان سخن کے صفا خوش نما پھول گل چیں کی سہربانی یا تغافل (جو چاہو اس کا نام رکھ لو) کی بد دولت اپنی شاخوں پر بڑبڑا رہ گئے۔

دیباچے کے صنف، ۷ پر لالہ سری رام لکھتے ہیں:

”جن جن تذکروں سے ہم نے مدد لی ان کے نام نامی ذیل میں درج ہیں:

گلستان سخن، گلشن بے خار، نغمہٴ عندلیب، انتخاب یادگار، سخن شعراء، سراپا سخن، آب حیات، شمع سخن، تذکرہ شعرائے دکن، طبقات الشعرائے شوق، تذکرہ قاسم، تذکرہ مصحفی، تذکرہ منوالال، شمع سخن [انجمن؟]، مجموعہٴ یوسفی،

ریاض فردوس ، تذکرہ لوالب کلب حسین قادر ، طور کلیم ، طراز عشق ، غنچہ اوم ، تذکرہ شبستان عالم گیری ، آثار الشعراء ، چمنستان کشمیر ، مجموعہ سخن ، تذکرہ شعرائے ہند ، تذکرہ لطف ، جلوۂ خضر ، نکات الشعراء ، نرج ہنسی ، طبقات الشعراء (جسے ڈاکٹر فیضان صاحب نے فریج زبان سے گازی سن ڈی ٹیسی کے تذکرے سے اردو میں ترجمہ کرایا اور مولوی کریم الدین نے اس میں اپنے وقت کے شعراء کو بڑھا کر قبل از بعد چھاپا) ، تذکرۂ شعرائے ہند ، تذکرۂ شعرائے ہدایوں ، تذکرۂ شرائے ٹونک ، تذکرۂ ضیفم ، تذکرۂ مولوی مظہرالحق ، غرض :

منع ز ہر گوشہ یافتہ ز ہر خوسنہ خوشہ یافتہ

قاضی عبدالودود صاحب نے بھی گلستان سخن کے بارے میں دو جگہ تفصیل دینے کا اظہار کیا ہے ۔ رسالہ ”معاصر“ ہند کے حصہ اول صفحہ ۷ پر فرماتے ہیں :

”گلستان سخن جس کا ایک نام آثار المعاصرین بھی ہے ، شعبان ۱۲۷۰ میں شروع ہو کر شوال ۱۲۷۱ میں مکمل اور اسی سال طبع ہوا ۔ سرورق میں قادر ہنسی صابر کا نام بہ حیثیت مصنف درج ہے ، لیکن اس کے بعد ہی یہ مرثوم ہے کہ اس کی عبارات صیباتی کی اصلاح سے مزین ہیں ۔ غالب ۵۸۲ کے ایک خط میں ذکا کو لکھتے ہیں ”آپ صابر کا تذکرہ مانگتے ہیں ... غدر سے پہلے چھاپا اور غدر میں تاواج ہو گیا ۔ اب ایک مجلد کہیں نظر نہیں آتا ...“ (اودوئے معلیٰ ، ص ۲۸) لیکن ایک قدیم تر خط میں شفق کو لکھ چکے ہیں کہ صیباتی کے تذکرے کی ایک جلد نذر کرنا ہوں (ص ۳۲۱) ۔ نسخ اور سری رام اسے صیباتی کی تصنیف بتاتے ہیں اور قرائن دلالت کرتے ہیں کہ یہ غالب کے قول پر مبنی نہیں ۔ میرا خیال ہے کہ مقدمے کے مطالب علمی اور تذکرے کی عبارت صیباتی کی ہے اور شعراء کے حالات اور اشعار دونوں نے جمع کیے ہیں ۔

اس لیے اگر اسے دونوں کی مشترک تصنیف کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ مقدمے میں (ص ۶۷) جن شعراء کا خاص طور پر ذکر ہے وہ احسان ، نصیر ، سون ، ذوق ، غالب ، شہتہ ، لیر ، سوڑ ، صہبائی اور ان سے الگ آزرہ کا ذکر ہے ۔ ”۱

اسی جملے کے صفحہ ۹۲ پر گلستان سخن کی تلخیص درج کرنے کے بعد رقم طراز ہیں :

” ۱ - دیباچہ، دستور فصاحت [امتیاز علی عرشی] میں ہے کچھ لوگوں یہ بھی خیال ہے کہ اصل تذکرے (گلستان سخن) کے مصنف صہبائی ہیں۔ اس قسم کی رائیں حسن ظن اور صاف دلی سے بعید اور پچھلے بزرگوں پر بغیر کسی دستاویزی شہادت کے سخت لکھ چنی کا موجب ہیں ، اس لیے میں اس کے ماننے پر آمادہ نہیں (ص ۱۰۳)۔ اگر دستاویزی شہادت سے صابر یا صہبائی کا اقرار نامہ مراد ہے تو یہ واقعی موجود نہیں ، لیکن غالب^۲ گلستان سخن کو صہبائی ہی کی تصنیف سمجھتے تھے اور نساخ سخن شعراء صفحہ ۲۷۲ اور سری رام دیباچہ، غم خانہ جاوید ، جلد ۲ کی بھی یہی رائے ہے کہ صہبائی اور صابر کا بزرگان سلف میں ہونا خارج از بحث ہے۔ غالب صہبائی کے ہم عصر ہیں ، لیکن باوجود اس کے کہ لطائف غیبی میں غالب کی ستائش کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا گیا ، اس کا لفظ لفظ غالب کے قلم سے ہے اور سیاح کو ، جن کی طرف یہ منسوب ہے ، اس سے مطلق سروکار نہیں۔ میرے نزدیک شعراء کے حالات و اشعار بیشتر صابر

۱ - اقتباس از ’جہان غالب‘ مؤلفہ قاضی عبدالودود مشمولہ معاصر حصہ ۴ ، پٹنہ ص ۷۔

۲ - غالب نے شفیق کو ایک کتاب بھیجی ہے جسے صہبائی کا تذکرہ کہا ہے۔ یقین کامل ہے کہ اسی کتاب کی طرف اشارہ ہے (خطوط غالب ص ۳۳۱) اس برخلاف انہوں نے ذکاہ کو لکھا ہے کہ آپ صابر کا تذکرہ مانگتے ہیں۔ غدر سے چلے چہا تھا ، اس کے نسخے خالص ہو گئے ، کہیں نظر نہیں آتا۔ یہ تضاد حلیلی نہیں کہ ذکاہ نے صابر کا تذکرہ مانگا ہوگا۔ غالب نے وہی لکھ دیا جو ذکاہ نے لکھا تھا۔

اور کم تر صہبائی کے فراہم کردہ ہیں ، لیکن عبارت سراسر صہبائی کی لکھی ہوئی ہے اور ملتے کے علمی مباحث کے وہ تنہا ذمہ دار ہیں ! لیکن گلستان سخن سے قطع نظر صابر کی ایک سطر بھی موجود نہیں جسے ان کے ذی علم ہونے کے ثبوت میں پیش کیا جا سکے ۔ یہ اس بھی قابل توجہ ہے کہ یہ بات کہ عبارت میں صہبائی کی اصلاح ہے ، بار بار لکھی گئی ہے اور خلاف دستور سرورق میں بھی اس کا ذکر ہے ۔ میرا خیال ہے کہ صہبائی کے دہلوی معاصرین اس بات کو اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ کتاب دراصل صہبائی کی ہے اور کھلا راز نسخ کو اپنے زمانہ قیام دہلی میں انہیں سے معلوم ہوا ۔ میرا قیاس ہے کہ سری رام نے بھی یہ بات یہ طور روایت سنی اور ان کا بیان محالب کے قول پر مبنی نہیں ۔^۱

”تذکروں کا تذکرہ نمبر ، کے مرتب فرمان فتح پوری قاضی عبدالودود صاحب کے موقف کو درست تسلیم نہیں کرتے ۔ اس سلسلے میں وہ گلستان سخن کے تحت فرماتے ہیں :

”حیرت ہے کہ قاضی عبدالودود صاحب بھی اس باب میں بعض باتیں غیر ذمہ دارانہ کہہ گئے ہیں ! مثلاً عہد محفوظ الحق صاحب کے مضمون پر تنقید کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ گلستان سخن کے متعلق دہلی کے معتبر اصحاب کا بیان ہے کہ یہ دراصل صہبائی کی تالیف ہے . . . یہ غلط ہے ۔ گلستان سخن صہبائی کا نہیں ، قادر بخش صابر ہی کی تصنیف ہے ۔“

معاصر شہادتوں کی موجودگی میں فرمان فتح پوری کی رائے قابل تسلیم نہیں ۔ گلستان سخن کے ابتدائی ۲۰۳ صفحات میں جو بحثیں اٹھائی گئی ہیں وہ صہبائی کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا ۔ صہبائی کی اپنی تحریروں موجود ہیں اس لیے یہ بحث بعض دلائل کی حد سے گزر کر واقعات اور عبارات کی مدد سے طے کی جاسکتی ہے ۔

(۲)

صابر نے جہاں اور کئی ماخذوں کا حوالہ دیا ہے ، وہاں بعض

مقامات پر خود صہبائی کی تحریروں سے بھی استناد کیا ہے۔ اس سے قطع نظر ہمیں مندرجہ ذیل باتوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا :

۱۔ ہمارے پاس مطبوعہ صورت میں صہبائی کی کئی فارسی تحریریں موجود ہیں ، لیکن اگر بحث کو صرف اردو کتابوں تک محدود کر دیا جائے جب بھی بحث کچھ نہ کچھ واضح نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ گلستان سخن کی تالیف سے پہلے صہبائی دو کتابیں لکھ چکے تھے۔ دہلی کالج کے استاد کی حیثیت سے انہوں نے پرنسپل ہولمز کی فرمائش سے میر حسن الدین فقیر کی کتاب 'حدائق البلاغت' کا اردو ترجمہ (۱۲۵۸ مطابق ۱۸۸۲ع) کیا تھا۔ یہ کتاب فقیر کی کتاب کا لفظی ترجمہ نہیں بلکہ مختلف مقامات پر اختصار اور تفصیل سے بھی کام لیا گیا ہے اور مثالیں بھی فارسی کی بجائے اردو کی دی گئی ہیں۔ اسی طرح پرنسپل موصوف ہی کی فرمائش پر انہوں نے ۱۲۹۰ مطابق ۱۸۸۴ع میں 'انتخاب دواوین شعرائے مشہور اردو زبان کا، کے نام سے ولی سے لے کر معاصرین تک چیدہ چیدہ شاعروں کے کلام کا انتخاب کیا ، ہر شاعر کے مختصر حالات دینے کے علاوہ ابتداء میں اصناف سخن پر ایسے صفحات کا دیباچہ بھی لکھا۔ صہبائی کی یہ دونوں تحریریں گلستان سخن سے پہلے چھپ چکی تھیں۔ ذیل میں تذکرے کی بعض عبارتیں ان دونوں کتابوں کے بعض ضروری اقتباسات کے محاذ میں درج کی جاتی ہیں۔ ان سے معلوم ہوگا کہ گلستان سخن کے ابتدائی حصے کی تالیف کے وقت بھی دو کتابیں پیش نظر تھیں۔ ان کے نفس مضمون اور اسلوب بیان میں اور گلستان سخن کے ابتدائی حصے میں ایک نسبت فریہ پائی جاتی ہے :

گلستان سخن

انتخاب دواوین

پہلا مطلب حد شعر : جاننا چاہیے کہ شعر لغت میں جاننے کو کہتے ہیں ، یعنی دانستن اور اصطلاح میں کلام موزون مقفول کو۔ جو کہ شعر کی تعریف کے لین جز ہیں کلام اور موزون اور مقفول۔ کلام اور

... معلوم کیا چاہیے کہ شعر لغت میں جاننے کو کہتے ہیں اور اصطلاح شعراء میں ایک کلام ہے کہ وزن اور قافیہ رکھتا ہو اور شاعر نے اس کو شعر کے قصد سے کہا ہو۔ پس اگر ایک کلمہ ہو یا

وزن اور قافیے کے معنی کا بیان واجب ہوا تاکہ تعریف کا پنبھی دل لشین اور خاطر سامع میں جاگزیں ہو جاوے۔ اس واسطے لکھا جاتا ہے کہ کلام علم نحو کی اصطلاح میں ان دو کلمے یا زیادہ کا نام ہے کہ اسناد رکھتے ہوں، یعنی ایسی نسبت کہ مخاطب کو بعد سکوت قائل کے فائدہ تائد حاصل ہو جاوے اور اس کو مرکب مفید بھی کہتے ہیں، جیسے زید قائم ہے؛ لیکن تعریف مذکور میں یہ معنی مراد نہیں بلکہ کلام سے مطلق الفاظ یا معنی مراد ہیں، اسناد پر مشتمل ہوں یا نہ ہوں، اسی واسطے بعضے اس تعریف میں بجائے کلام کے الفاظ یا معنی ابراد کرتے ہیں، تا مرکب غیر مفید بھی، بشرط وزن و قافیہ، شعر کی تعریف میں داخل رہے۔ جیسے یہ شعر:

وہ شوخ ستم کیش کہ اغوائے عدو ہے
عاشق کی دم مرگ بھی بالیں بہ نہ آیا
(ص ۱۲۹)

ذکر موجد اشعار: بعضے ارباب تواریخ لکھتے ہیں کہ ایجاد شعر کا حضرت آدم علی نبینا وعلیہ السلام سے وقوع میں آیا ہے۔ جس وقت قایل نے ہابیل کو قتل کیا، حضرت

زیادہ ہو، یا کوئی وزن اوزان مقررہ میں سے قافیہ نہ رکھتا ہو یا شاعر نے اوس کو شعر کے قصد پر نہ کہا ہو، موافق اصطلاح کے وہ شعر نہیں اور یہاں سے معلوم ہوا کہ ردیف شعر کی ماہیت میں داخل نہیں۔ اس شعر بدون قافیے کے تمام نہیں ہو سکتا ہے اور بدون ردیف کے تمام ہو سکتا ہے اور یہ مذہب ہے جمہور کا۔ اسی واسطے بہت اشعار میں ردیف نہیں ہوتی۔ چنانچہ یہ شعر سودا کا:

اگر عدم سے ہو نہ ساتھ فکر روزی کا
تو آب ودالہ کولے کر نہو گھر پیدا

کہ 'کا' اور 'پیدا' قافیہ ہے اور اس کے بعد ردیف نہیں ہے۔ (ص ۲۱)

پہلے جس شخص نے شعر وضع کیا ہے، اس میں بہت اختلاف ہے۔ بعضے کہتے ہیں اول شعر حضرت آدم نے کہا ہے۔ چنانچہ دو تین شعر عربی کے کہ ان کی طرف

باہرکت نے اس کے مرثیے میں چند شعر فرمائے جو کہ وہ اشعار عربی ہیں ، عبارات اردو میں ان کا ایراد مناسب معلوم نہ ہوا ۔ وہ اشعار کثرت شہرت سے اس مقام کی تحریر سے مستغنی ہیں ۔ (ص ۱۳۲)

منسوب ہیں ، ترجمہ ہیں ان اشعار کا جو باہل کے مرثیے میں کہے ہیں ، جب قابیل نے اوس کو قتل کیا تھا اور وہ سربائی زبان میں تھے اور کہتے ہیں کہ اول شعر عربی میں ایوب بن قحطان نے کہا اور فارسی میں بعضوں کے قول کے موافق بہرام گور اور بعضوں کے موافق ابو حفص حکیم سمرقندی نے اور بعض کہتے ہیں کہ اردو میں پہلے شعرگوئی ولی نے اختیار کی ہے ، لیکن یہ قول کہ حضرت آدم واضح شعر کے ہیں ، بشرط صحت کے البتہ ان سے پہلے اور کوئی شعر کہنے والا مستحق نہیں ہو سکتا ، و الا باقی شعراء جن کو واضح اشعار کا اور زبانوں میں قرار دیا جاتا ہے ، اس میں اختلاف ہے ؛ کیونکہ بعد تلاش کے ان سے پہلے بھی اور شاعر معلوم ہوئے ہیں ؛ چنانچہ کتابوں میں اس کا حال مفصل لکھا ہے اور ولی نے اپنے اشعار میں اور شعراء پر طنز کی ہے ۔ (ص ۳۰۲)

معلوم کیا چاہیے کہ نظم کوئی قسم ہے ۔ لہر ، رباعی ، غزل ، قصیدہ ، نسیب ، قطعہ ، مثنوی ، مسقط ، ترجیع ، مستزاد ۔ ہر چند نسیب شعر کی قسم علیحدہ نہیں ہے بلکہ قصیدہ کا جزو ہے کہ باعتبار

معلوم کیا چاہیے کہ نظم یہ اعتبار قافیہ اور وزن اور قلت اور کثرت مصرعوں کے کئی قسم ہو جاتا ہے اور کئی قسم علیحدہ ہو جانے میں اس نظم کے معنی کو بھی دخل ہوتا ہے ۔ چنانچہ اس موقع پر اشارہ

ایک حیثیت کے باقی اشعار سے ممتاز ہے اور اسی طرح مستزاد کہ بعض اصناف شعر مثل فرد اور رباعی اور غزل ایک صورتِ خاص میں اس اسم کے ساتھ معمول ہو جاتے ہیں اور حال اس کا اپنے اپنے محل میں مشروحاً دریافت ہو جاوے گا۔ آسانی فہم اور مبتدیوں کی تفہیم کے واسطے اقسام میں داخل کر کے ہر ایک کا بیان علیحدہ کیا جاتا ہے :

فرد

ایک شعر کو کہتے ہیں کہ کوئی اور شعر اس کے ہم راہ نہ ہو ، خواہ دونوں مصرعے مقلوب ہوں ، خواہ مصرع آخر - مثال اس کی ظاہر ہے ۔

کر دیا جائے گا - ہر کیف ان اعتبارات سے نظم کی یہ قسمیں ہیں : فرد ، غزل ، قصیدہ ، تشبیب ، قطعہ ، رباعی ، مثنوی ، ترجیع بند ، مسقط ، مستزاد اور مسموعت ۔ (ص ۴)

فرد

دو مصرعے کے شعر کو کہتے ہیں مطلقاً - خواہ دونوں مصرعے میں قافیہ ہو خواہ ایک میں اور اس کو بیت بھی کہتے ہیں ؛ لیکن ان دونوں ناموں میں اس قدر فرق ہے کہ شعر کے اتنا ہونے کی صورت میں فرد نام رکھا جاتا ہے اور بیت خواہ اتنا ہو ، خواہ منجملہ اور اشعار کے ، جیسے کہ ایک شعر غزل یا قصیدہ یا قطعہ کا ... پس فرد خاص ہے اور بیت عام ۔ فرد یہ سبب اتنا ہونے کے کہتے ہیں اور بیت میں کئی قول ہیں ، سب کا لکھنا موجب تطویل کلام کا ہے ۔ ان میں سے ایک وجہ قوی یہ معلوم ہوتی ہے کہ بیت گھر کو کہتے ہیں اور گھر عرب کے

صحرا نشینوں کا اکثر کنیل کا ہوتا ہے ، جس کو ہال کہتے ہیں اور وہ میخ اور رسی اور متون سے مرکب ہوتا ہے اور بیت بھی وند اور سبب اور فاصلہ سے مرکب ہوتا ہے اور وند میخ اور سبب رسی اور فاصلہ متون کو کہتے ہیں اور ان اجزاء کا حال علم عروض میں مفصل لکھا ہوا ہے ۔ پس بیت یا فرد ہونے میں نقط مصرعوں کی قلت کو دخل ہوا ، نہ وزن اور قافیہ کو ۔

[رباعی]

رباعی

رباعی دو بیت کا نام ہے ، خواہ مصرع اول اور ثانی اور رابع ہم قافیہ ہوں ، خواہ چاروں مصرعے اور رباعی کے واسطے چوبیس وزن خاص معین ہیں کہ ان کا بیان عروض میں ہو چکا ہے ۔ اس نظم کی دو بیت پر بنا ہونے کی وجہ یوں لکھتے ہیں کہ جس وقت شاعر نے یہ وزن اختراع کیا اس وقت نہایت لہجہ اور اتساع میں تھا اور زبرہ اور عطارد میں نظر تسدیس یا تثلیث اور آفتاب و مشتری میں نظر تثلیث تھی اور خاص و عام اس وزن سے نہایت محظوظ تھے ۔ اس نے اس نظم میں دو بیت پر اختصار کیا کہ

رباعی دو بیت ہیں کہ مصرع اول اور دوم اور چہارم ہم قافیہ ہوتا ہے اور کبھی چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں ۔ اس کو چار مصرعے [اور] دو بیتی بھی کہتے ہیں اور رباعی کے واسطے چوبیس وزن مقرر ہیں ۔ اگر وہ چار مصرعے ان اوزان میں سے کسی وزن پر ہوں گے ، پس اس کو رباعی کہیں گے والا چار مصرع کو رباعی کہنا درست نہیں ہے ۔ جیسے کہ عادت عوام کی ہے کہ چار مصرعہ کہ ان میں سے پہلا اور دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہو ان کو رباعی کہہ دیتے ہیں اور تفصیل اوزان

طول سخن سماع میں ملال پیدا نہ کرے۔

رباعی کی حدائق البلاغت کے اردو ترجمہ میں موجود ہے، اس میں مطالعہ کر لیں۔ پھر کیف رباعیات اس منتخب میں ان اوزان میں سے اکثر وزن پر مرقوم ہیں۔ ہر وقت مطالعہ کے معلوم ہو جائیں گی۔ (س ۷)

غزل و قصیدہ

غزل ایسے چند بیت متحد الوزن کو کہتے ہیں کہ بیت اول کے دونوں مصرع کا قافیہ باقی ابیات کے مصرع اخیر کے قوافی کے ساتھ متحد ہو۔ بیت اول کو مطلع کہتے ہیں اور یہ ہی تعریف ہے قصیدے کی، لیکن فاصل اور قافیہ ان دونوں میں یہ ہے کہ غزل بارہ تیرہ سے بیت متجاوز نہیں ہوتی اور قصیدے کے واسطے نہایت نہیں۔ مگر غالباً ڈیڑھ سو بیت سے زیادہ نہیں کہتے اور اس زمانے میں غزل بس پچیس بیت تک بھی کہتے ہیں اور غزل و قصیدہ میں اس طرح سے فرق کرتے ہیں کہ اگر مضمون ہر بیت کا مختلف یا عاشقانہ ہو تو اس کو غزلہ جانتے ہیں اور اگر مدحت یا نصائح اور مثل ان کے ہو تو قصیدہ اور متاعین غزلہ میں تخلص یعنی نام شاعر کا مطلع میں اور قصیدے میں

غزل

غزل لغت میں عورتوں کی باتیں اور عورتوں کے عشق کی باتیں کرنے کو اور اس سخن کو بھی کہتے ہیں جو عورتوں کی تعریف میں کہا جاوے اور اصطلاح میں کئی بیتوں کا نام ہے کہ سب کا وزن ایک ہو اور پہلے بیت کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں اور باقی ابیات کے دوسرے مصرعے۔ پہلے بیت کو مطلع کہتے ہیں اور دوسرے بیت کو جو مطلع کے بعد ہے حسن مطلع اور بیت آخر کو مقطع اور شعرائے متاخر قاطبہ اپنا نام جس کو تخلص کہتے ہیں مقطع میں داخل کرتے ہیں اور شعرائے مقدم اس امر کے مفید نہ تھے۔ معلوم کیا جاہے کہ عرب میں مرد کا عشق عورتوں پر ہوتا ہے اور فارسی میں مرد کا عشق غالباً اطفال پر اور کبھی عورت پر بھی اور

جس بیت میں چاہتے ہیں ذکر کرتے ہیں اور قدام غزل میں بھی نام کو مقطع کے ساتھ مخصوص نہیں کرتے تھے اور بہتر یہ ہے کہ مضمون غزل عاشقانہ ہوتا کہ غزل کی مناسبت باقی رہے : کس واسطے کہ غزل لغت میں عورتوں سے بائیں کرنے کو کہتے ہیں اور قصیدہ مغز عذیق کو کہتے ہیں ۔ جو کہ عادت قدام کی یہ تھی کہ قصیدے میں الفاظ مثنیٰ ، جو ممدوح کے تھم اور علو شان پر دلالت کریں ، استعمال کرتے تھے ، اس نام کے ساتھ موسوم کیا ۔

فارسیوں کے اتباع سے اردو گو بھی یہی رویہ برتتے ہیں ، اگرچہ ہند میں عورت کا عشق مرد پر شائع ہے اور یہ امر کیت اور دو دوڑیوں سے ظاہر ہے اور ازیں کہ عربی غزلوں میں حدیث عورتوں کی ہوتی ہے ، اسی واسطے اس کا نام غزل رکھا اور فارسی اور اردو گوہوں نے بھی ان آیات مخصوصہ پر وہی نام مسلم رکھا ، لیکن غالباً غزل مضامین عشقیہ سے خالی نہیں ہوتی ۔ لیکن بعد مرور ازمہ کے غزل میں ہند اور نصائح اور معرفت کے مضامین یا تعریف شراب کی بھی پالندھنے لگے اور غزل کے پریت کا مضمون علیحدہ ہوتا ہے یعنی اگر ایک بیت میں ہجر کا بیان ہے تو دوسرے میں وصل کا ہوتا ہے یا اگر ایک میں اپنا لہجہ ہے ، دوسرے میں اپنا عجز بیان ہوتا ہے اور یہ بھی نہیں پایا جاتا کہ مثلاً اگر اول سے ہجر کا بیان شروع کیا ہے ، مقطع تک اسی کا ذکر چلا جاوے اور شعراء فارس متاخر نے غزل میں ایک طرز نئی ایجاد کی ہے اور وہ یہ ہے کہ معشوق کو کسی اور کا عاشق قرار دے کر اس کے سوز و گداز کے مضامین غزل میں پالندھتے ہیں اور اردو غزل گوہوں

نے بھی ان کے الہام سے اس طرح
کی غزل طرح کیں۔ چنانچہ سودا
کی غزل جس کا مطلع یہ ہے :

جو طبیب اپنا تھا دل اس کا کسی ہر زار ہے
مژدہ ہاد اے مرگ عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے

ازو باقی ایات دیوان کے مطالعہ
کرنے والوں پر ظاہر ہیں۔ بہر کیف
غزل کی بیٹوں کی حد میں اختلاف
ہے، لیکن ظاہر یہ ہے کہ گیارہ بارہ
بیت سے زیادہ نہ چاہیے ! کسی
واسطے کہ کثرت اشعار کی قصیدہ
کے واسطے مناسب اور زیبا ہے۔
(ص ۳۰۵)

مثنوی

وہ ایات ہیں کہ وزن سب کا متحد
اور قافیہ علیحدہ ہو، لیکن ہر بیت
کے دونوں مصرعے قافیہ رکھتے
ہوں۔ چند بیت مثنوی میر سے
یہ طریق نمونے کے مرقوم ہیں۔

مثنوی

ایسی بیٹیں ہیں کہ وزن سب کا
ایک اور قافیہ دو دو مصرعے کا
متفق اور ہر بیت قافیہ جدا گانہ
رکھتی ہے۔ حد مثنوی کی معین
نہیں۔ جیسے اردو میں مثنوی
میر حسن کی جس میں بدو منیر اور
بے نظیر کا قصیدہ مسطور اور کمام
عالم میں مثل بدو منیر کے مشہور
ہے۔ (ص ۷)

مسط

وہ چند مصرعے ہیں کہ وزن و قافیہ
میں متفق ہیں، ہر اے ایسے ایک
مصرعے کے کہ وزن میں ان

مسط

لفت میں سون کی لڑی کو کہتے
ہیں اور اصطلاح میں اس طرح کی
نظم کو کہتے ہیں کہ اول چند

مصرعہ قافیہ میں موافق اور قافیے میں مخالف ہوتا ہے ۔ اور کہہ گاہ یہ مصرع بھی ان مصرع کے ساتھ قافیے میں اتحاد رکھتا ہے ۔ اور یہ امر اس مسط کے پہلے بند سے ظاہر ہے کہ اس کے چند مصرعے مطلع غزل کے ساتھ الحاق کیے جاویں ۔ مصنف مناظر الانشاء لکھتا ہے کہ مولانا وحید نبریزی کے رسالے میں کہ عروض اور قافیہ اور بدیع پر مشتمل ہے ، مرقوم ہے کہ مسط چار مصرع سے دس مصرع تک ہوتا ہے ۔ پس یہ تعریف رباع اور خمس اور سدس اور مسبح اور مشن اور متبع اور معشر کو شامل ہے (یہاں تک کلام اس کا مشتمل ہوا) ؛ لیکن مثلث بھی پایا جاتا ہے اور جانتا چاہیے کہ جب ایات مسط کے مکرو ہو جاویں تو چاہیے کہ اخیر مصرعے قافیے میں متحد ہوں ۔ مثلث اور رباع اور خمس کی مثال مرقوم ہوئی ہے کہ کثیر الوجود ہے اور باقی اشعار کم پائے جاتے ہیں ۔

(ص ۱۵۶ تا ۱۵۸)

ترجیع بند

مصنف مناظر الانشاء نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے کہ ترجیع

مصرعہ قافیہ میں متفق ہوں اور بعد اس کے اسی قدر مصرع اور اس طرح کے ہوں کہ قافیہ مصرعہ اخیر کا موافق ان چند مصرع کے ہو اور باقی مصرع کا ان سے مخالف ، اسی طرح ہر جس لہو چاہیں کہیں ، اس کے غانوں کی حد معین نہیں ۔ پس اگر ہر خانہ تین تین مصرعہ کا ہو تو اس کو مثلث کہتے ہیں اور اگر چار مصرع کا اس کو مربع اور اگر پانچ مصرعہ کا اس کو خمس اور اگر چھ مصرعہ کا اس کو سدس اور اگر سات مصرع کا اس کو مسبح اور اگر آٹھ مصرعوں کا اس کو مشن اور اگر نو کا اس کو متبع اور دس کا اس کو معشر کہتے ہیں اور حد مصرعوں کی دس تک ہے ۔ اردو گو خمس اور سدس بیشتر کہتے ہیں اور باقی اصناف کم اور بعضوں نے مثلث بھی کہے ہیں ۔ (ص ۱۰۱-۱۱)

ترجیع

لفت میں ترجیع یہ معنی لٹھے اور پھرنے کے ہیں اور اصطلاح میں وہ

وہ شعر ہے کہ حصہ کیا جاوے
ایسی بیت کے ساتھ کہ اس کے
ہر مصرعے میں قافیہ ہو اور ہر
حصہ اس کا چند بیت صاحب مطلع
ہوتے ہیں کہ وزن اور قافیے میں
اتحاد رکھتے ہوں۔ اس حصہ کرتے
والی بیت کو بند ترجیع کہتے ہیں
اور وہ بند غالباً ہر جگہ ایک ہی
بیت ہوتی ہے، اور گاہ کہ غیر
اول کی اور بند چاہیے کہ ابیات
سابق سے باعتبار معنی کے مربوط
ہوں۔ اور شمس لٹری معیار جہاں
میں لکھتا ہے کہ ترجیع کئی قسم
ہے؛ اول یہ کہ شاعر پانچ یا
سات یا نو یا گیارہ بیتیں جس
وزن اور قافیہ اور ردیف میں چاہے
کچھ اور بعد ان کے ایک اور بیت
لاوے کہ اس قافیہ اور ردیف پر
نہ ہو، اور پھر اسی قدر بیتیں کہ
چولے کہیں نہیں، کہہ کر ایک
اور بیت لاوے اس طرح اخیر تک
تمام کو پہنچاوے۔ ان ابیات کو
خانہ اور اس بیت کو بند کہتے
ہیں۔ دوسرے یہ کہ بعد ہر خانہ
کی ابیات کے بند آئے ہوں کہ قافیہ
اور ردیف میں اتحاد رکھتے ہوں؛
اگر ابیات بند کو جمع کریں ایک
قطعہ ہو جاوے، تیسرے یہ کہ
بند ہر جگہ ایک ہی بیت ہو۔

چند شعر ہیں کہ خانہ خانہ ہوں
اور ہر خانہ ایک غزل کے برابر
ہو۔ قافیہ اس خانہ کا ہمیشہ مانند
قافیہ غزل کے، یعنی مطلع کے
دونوں مصرع اور باقی ابیات کے
ابھی مصرع ہم قافیہ ہوں اور قافیہ
ایک خانہ کا دوسرے خانہ کے
قافیہ سے مخالف ہوں اور تمام ہونے
کے بعد ایک اجنبی بیت لاویں اور
چاہیے کہ وہ بیت اجنبی بہ اعتبار
معنی کے چولے بیتوں سے ربط
رکھتی ہو۔ پس اگر بند کی بیت
بار بار ہمیشہ مکرر ہو، اس کو
ترجیع بند کہتے ہیں اور اگر مختلف
ہو ترکیب بند۔ اور ترکیب بند
دو طرح ہے؛ ایک یہ کہ بند کے
ہر بیت کا قافیہ علیحدہ ہو؛ چنانچہ
اگر جمع ہوئی مثنوی ہو
جاوے اور دوسرے یہ کہ سب
بیتیں ایک قافیہ پر ہوں؛ چنانچہ
اگر جمع ہوں سب مل کر ایک
خانہ ہو جاوے۔ (ص ۱۰)

چوتھی قسم یہ ہے کہ سب خانوں کی ردیف ایک اور قافیہ مختلف ہو یا بالعکس (جہاں تک شمس فحری کا کلام تمام ہوا)۔ مؤلف کہتا ہے کہ صاحب 'مناظر الاشیاء' کے لکھنے سے کہ ہند گاہ گاہ غیر مکرر ہوتا ہے اور اقسام اربعہ مذکورہ کی پہلی اور دوسری قسم کی عبارت سے یہ معلوم ہوا کہ ترتیب ہند بھی ترجیح کی ایک قسم ہے۔ اور ماہران فن پر واضح ہے کہ ترکیب ہند انہیں اشعار کو کہتے ہیں کہ ان دونوں صورتوں میں سے کسی صورت پر ہو، اور شمس فحری کے اس قول سے کہ اگر ان آیات کو جمع کرلیں تو ایک قطع ہو جاوے، معلوم ہوتا ہے کہ ہند کے دوسرے ہی مصرع میں قافیہ ہو، نہ یہ کہ پہلا ہند بشکل مطلع کے اور باقی آیات، آیات محزل کے طور پر۔ اور شعراے قدیم و حال کا مشاہدہ بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔ اور دو بیت پر بھی خانہ کی بنا رکھتے ہیں۔ اس روزگار میں یہ اشعار مسدس کے نام سے مشہور ہیں۔ (ص ۱۷۹ تا ۱۸۱)

مستزاد

مستزاد ایسا کلام منظوم ہے کہ اس کے مصرع یا بیت کے بعد اس

مستزاد

ایسی نظم کو کہتے ہیں کہ بعد ہر مصرع یا بیت کے ایک فقرہ نثر

طرح سے ایک پارہ کلام زیادہ کیا جائے کہ یہ حسب معنی اس نظم سے مربوط ہو۔ مگر جانتا چاہیے کہ مستزاد رباعی اور غزل وغیرہ کے مقابل نہیں ہے بلکہ رباعی وغیرہ کے ساتھ بھی جمع ہو جاتا ہے، یعنی رباعی و غزل مستزاد ہوتی ہیں اور اگر مقابل ہوئے تو ان دونوں کا جمع ہونا محال تھا اور یہ امر کہ وہ پارہ کلام جو زیادہ کیا جاتا ہے، نثر ہے یا نظم؟ ایک پست دور و دواز رکھتا ہے۔ اس کی تفصیل استاذی و مولائی جناب مولوی امام بخش صہبانی سلمہ اللہ تعالیٰ کے رسالہ "تافیہ" سے جس کا نام 'وائی' ہے، دریافت کریں کہ اس سے جوثر کسی کتاب میں مرقوم نہیں ہے۔ ملخص کلام یہ ہے کہ وہ پارہ بھی نظم ہے نہ نثر! جسے کہ بعضوں کا گمان ہے۔

(ص ۱۹۳)

نسب

چند بیت کا لام ہے کہ قصیدے میں مقصد سے پہلے یہ طور تمجید کے مذکور کریں اور چونکہ ان آیات اور اشعار مدح وغیرہ میں کوئی واسطہ چاہے، بعد ان آیات کے ایسے ایک دو بیت ہوئے ہیں کہ مقصد کی طرف متوجہ ہونے پر

کا زیادہ کر لیں لیکن یہ شرطیکہ وہ فقرہ اس نظم سے بہ اعتبار معنی کے مربوط ہو اور وہ نظم بغیر اس فقرہ کے بھی تمام ہو سکتا ہو، یعنی اگر وہ فقرہ نہ ہو تب بھی معنی درست ہوں اور اس فقرہ پر نثر کا اطلاق اس واسطے ہے کہ اگرچہ وہ بھی کسی ایک دو رکن کے وزن پر ہے، لیکن وزن تمام مصرع کا نہیں ہے۔

[نسب]

(جہاں شاعر قصیدے میں چند شعر کے بعد مدح کی طرف متوجہ ہونا ہے) ان اشعار کو تشبیب کہتے ہیں۔ تشبیل کے وزن پر اور اس کا نام نسب بھی ہے۔ میں نے نقطہ سے فعل پر۔ نسب کے معنی ایام جوانی کا ذکر کرنا اور نسب

ذلات کرتے ہیں ؛ ان بیتوں کو عربی میں تخلص اور فارسی میں گریز گاہ کہتے ہیں ۔ تشبیب کو تشبیب بھی کہتے ہیں اور جو کہ تشبیب لغت میں عورتوں کی بالیں کرنے کو کہتے ہیں اور تشبیب ذکر ایام شباب کو ، غالباً اوائل حال میں یہ بیتیں صرف عاشقانہ ہوتی ہوں گی ، پھر راتہ راتہ اور مضامین مثل شکایت روزگار یا نظریہ وغیرہ پر بھی مشتمل ہونے لگیں ۔ راقم غزل و قصیدے کی مثال پر قناعت کر کے سودا کے اس قصیدے سے جو ہست خان کی مدح میں لکھتا ہے ۔

(ص ۱۷۲ تا ۱۷۵)

قطعہ

ایات متحدۃ الوزن و القافیہ میں بدون مطلع کے ۔ پس اگر مطلع ہو اور ایات قصیدہ سے کم ہو تو غزل و الا قصیدہ ۔

عورتوں کا ذکر کرنا ۔ اس نام سے معلوم ہوا کہ اول بھی اسم تھا کہ قبل از مضمود اشعار عاشقانہ لکھتے تھے ، لیکن اب خصوصیت ایسے اشعار کی نہیں رہی بلکہ مضمود سے پہلے جس قسم کے شعر ہوں ان کو تشبیب کہیں گے اور جس قصیدہ میں تشبیب نہ ہو یعنی اول سے مدح یا ہجو مثلاً شروع کریں اس کو مجنو کہتے ہیں اور جس میں تخلص یعنی گریز نہ ہو مقتضب کہتے ہیں) ۔ (ص ۶)

قطعہ

لغت میں کسی چیز کے ٹکڑے کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں ان چند بیت کا نام ہے کہ وزن اور قافیہ میں متحد ہوں ، مثل غزل کے ، لیکن مطلع نہ ہو ۔ کس واسطے کہ اگر مطلع ہوگا ، پس دو حال سے خالی نہیں ؛ یا بیتیں اس کی غزل کی حد سے متجاوز ہوں گی یا نہ ہوں گی ۔ پہلی صورت میں قصیدہ ہے اور دوسری صورت میں غزل

اور اغلب قطعہ میں مضمون آیات کا ایک دوسرے سے علائکہ رکھتا ہے۔۔۔ اور کبھی ساری غزل یا اس کے اکثر شعر ایک دوسرے سے متعلق ہوتے ہیں۔ اسی غزل کو غزل قطعہ بند کہتے ہیں۔ (ص ۷)

’انتخاب دواوین‘ کے یہ اقتباسات ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتے ہیں کہ گلستان سخن میں انتخاب دواوین کے صفحات معمولی رد و بدل کے ساتھ شامل ہیں۔ سوائے اس کے کہ کبھی کبھی اجمال کی تفصیل کر دی گئی ہے۔

بعض دیگر مطالب اسی طرح ’حدائق البلاغت‘ کے اردو ترجمے سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ ذیل میں چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں :

گلستان سخن

حدائق البلاغت

(اردو ترجمہ)

ہوشیدہ کہ وہی کہ خلیل ابن احمد جب اوزان عرب میں قیاس کافی اور تلخیص شائق عمل میں لایا ، اوزان شعر کے ضبط کے واسطے پندرہ بحر مرکب کیں اور جو جو بحر کہ الفکاک میں مشترک تھیں ان کو ایک ایک دائرے میں رکھا۔ جو کہ بحر متقارب کے ساتھ کوئی بحر شریک نہ تھی ، اس کو ایک دائرے میں رکھ کر اس دائرے کا نام مفردہ مقرر کیا۔ ابوالحسن اخفش نے جب اس میں نظر کی فمولن کے سبب کو والد سے

معلوم کیا چاہیے کہ خلیل ابن احمد اس فن کا استاد اور جمع کرنے والا ہے۔ اس نے کلام عرب میں قیاس اور تلاش کر کے معلوم کیا کہ اشعار عرب پندرہ بحر میں موزوں ہوتے ہیں۔۔۔ اور بعد اس کے کہ ابو الحسن اخفش نے سولہویں اور ایجاد کی اور اس کا نام متدارک رکھا۔۔۔ پھر کیف یہ سب انیس بحر ہوئے۔ معلوم کیا چاہیے کہ ان بحروں میں سے بعض ایک رکن کے تکرار سے حاصل ہوئی ہیں اور بعض دو رکن کی ترکیب سے۔

مقدم رکھ کر ہر متدارک کو حاصل کیا اور متقارب کے ساتھ دائرے میں رکھ دیا اور شمس فخری نے 'معیار جالی' میں لکھا ہے کہ اس ہر کو ماہران علم عروض نے خلیل ابن احمد کے دو سو برس کے بعد استخراج کیا۔ جدید کو بوہر جمعہ اور قریب کو مولانا یوسف عروضی نیشاپوری نے پایا اور مولانا اوزان فارسی میں خلیل ابن احمد سے پایہ کم نہیں رکھتا۔ الخ (۱۳۵، جلد اول)

جو ہر کہ ایک رکن کی تکرار سے حاصل ہوئی ہیں یہ ہیں ... جو دو رکن کی ترکیب سے حاصل ہوتی ہیں وہ یہ ہیں ... [یہاں ہجو کی تفصیل دی ہے جو گلستان سخن کے صفحہ ۱۳۳ کے عین مطابق ہے] اصل ہر جدید کی فاعلاتن فاعلاتن مستفعان ہے دو بار۔ اس ہر کو قریب بھی کہتے ہیں اور اس ہر کو بوہر جمعہ نے نکالا ہے اور اصل قریب کی مفاعیلن مفاعیلن فاعلاتن ہے دو بار۔ کہتے ہیں کہ مولانا یوسف نیشاپوری نے یہ ہر نکال ہے اور وہ یہ شخص ہے کہ فارسی علم عروض چلے اس شخص نے تصنیف کیا ہے اور یہ شخص خلیل ابن احمد سے دو سو برس کے بعد پیدا ہوا ہے۔ الخ (ص ۱۱۹ تا ۱۲۰)

لفظ ، ردیف کے بیان میں

ردیف وہ کلمہ مستقل ہے کہ بعد قافیہ کے مذکور ہو۔ خواہ متحد المعنی خواہ مختلف المعنی؛ قسم اول جیسے لفظ نہ تھا اس شعر میں :
قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا
اور دوسری قسم جیسے اس شعر میں :
رہنے نہ اگر غیر دینے تمہیں باہم
اس طرح سے ہونے نہ کبھی تم سے جدا ہم

ردیف وہ لفظ ہے کہ بعد قافیہ کے واقع ہو۔ خواہ کلمہ ہو، خواہ زیادہ۔ اکثر اس بات پر ہیں کہ ردیف سب جائے میں متحد المعنی چاہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ

قافیہ 'با' اور 'جدا' ہے اور ردیف 'ہم' لیکن مصرع اول میں یہ معنی یک دگر ہے اور دوسرے میں ضمیر متکلم اور کبھی ردیف لفظ غیر مستقل بھی ہوتی ہے جیسے قافیہ معمول میں۔ اس کی مثال کی کچھ حاجت نہیں۔ (ص ۱۷۰)

فصل عیوب قافیہ کے بیان میں

جاننا چاہیے کہ ہر چند عیوب قافیہ کے، جن سے شاعران لازماً کلام کو احتراز چاہیے، بہت ہیں، لیکن از بس کہ واقف اوراق کی نظر اختصار پر ہے، عیوب مشہورہ پر اکتفا کرتا ہے۔ وہ عیوب یہ ہیں: اقواء، اکفا، سناد، ایضا، معمول۔ ان عیوب کا بیان یہ ہے کہ اقواء حذو اور توجیہ کے اختلاف کو کہتے ہیں۔ حذو کا اختلاف کئی طرح ہے: ایک یہ ہے کہ ہر جگہ حرکت ردیف کی ہو، لیکن جداگانہ۔۔۔۔ الخ (ص ۱۶۷ تا ۱۶۸)

رباعی

معلوم کیا چاہیے کہ رباعی کے اوزان ہزج مشن سے ماخوذ ہیں اور وہ اوزان دس رکن سے ترکیب پاتے ہیں۔ ایک ان میں سے سالم ہے یعنی مفاعیلن اور نو مزاحف اور وہ یہ ہیں... ان ارکان... الخ (ص ۱۶۰ تا ۱۶۱)

اگر ردیف بہ اعتبار معنی کے مختلف ہو تو مضائقہ نہیں اور یہ اسر حق ہے (ص ۱۸۹)

عیب قافیہ کے کئی طرح پر ہیں، ایک ان میں یہ ہے کہ ایک جائے میں وہی حرف اصلی ہو، دوسری جائے میں حرف زائد کو بہ تکلف وہی کر لیا ہو؛ مثلاً کالی لالی کی کی پائے تختانی کالی کی اصلی ہے اور لالی کی زائد ہے اور اس قبل سے یہ شعر بھی ہے... (اس کے بعد عیوب قوافی مع ثابوت کے گنائے ہیں) الخ (ص ۱۷۹ تا ۱۸۳)

رباعی کا وزن مختص ہر ہزج کے ساتھ ہے اور اس میں نو مزاحف آتے ہیں اور یہ سب ان مزاحف کے چوبیس وزن حاصل ہوتے ہیں... اوزان رباعی کے یہ ہیں... الخ (ص ۱۶۷ تا ۱۷۲)

گلستان سخن اور حدائق البلاغت کا یہ اتحاد مطالب کئی مقامات پر حاوی ہے۔ اختصار کی خاطر اقتباسات کے صرف چند نمونے دیے گئے ہیں، ان میں کئی اور مثالوں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے؛ مثلاً گلستان صفحہ ۱۳۹ تا ۱۴۴ اور حدائق البلاغت صفحہ ۱۴۴ تا ۱۴۵ اور صفحہ ۱۱۶ بعد، صفحہ ۱۴۹ تا ۱۵۹ اور صفحہ ۱۲۷ بعد؛ صفحہ ۱۶۲ کے شجرے اور صفحہ ۱۷۴ کے شجرے؛ صفحہ ۱۶۳ اور صفحہ ۱۷۴؛ صفحہ ۱۶۶ اور صفحہ ۱۷۹ کا باہمی مقابلہ مذکورہ نتیجے کی تائید کرتا ہے^۱۔

ان اقتباسات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا بے موقع نہیں کہ گلستان سخن کا یہ ابتدائی حصہ یا تو تمام تر صہبائی کی تحریر ہے یا اس کے ابتدائی خاکے کو استاد کے قلم نے ہوں شکل و صورت دی ہے کہ یہ اسی کی شخصیت کا غماز ہو گیا ہے۔

۲۔ صابر نے جیسا کہ خود اپنے تذکرے میں لکھا ہے (صفحہ ۱۷) ابتدا میں حافظ عبدالرحمان خان احسان سے تلمذ اختیار کیا۔ مدت تک "افادہ و استفادہ کا ہنگامہ گرم" رہا اور "یہ صورت بہم پہنچی کہ ان کے اوقات بیشتر اصلاح تلامذہ میں مصروف ہونے لگے" اور "اپنے درد سر کو حضرت استاد کی قنفیض تصدیع کا باعث بنانا۔" اس سے "الذات عام لطف خاص" میں بدل گیا اور استاد کی پوری توجہ معافی و بیان اور عروض و نوافی کے غواشی سکھانے میں بسر ہو گئی، اور یہ قول صابر "ایک مدت تک نگاہ لطف میری ہی اصلاح میں ایک طرح سے مصروف رہی۔" حافظ احسان کے انتقال کے بعد (جو یہ قول صابر بلکراسی ۱۲۶۷ھ کا واقعہ ہے) شہزادہ صابر دو برس تک "اپنے ہی جوش میں موزن رہے" اور حافظ

۱۔ گلستان کے صفحات مجلس ترقی ادب کے مطبوعہ متن کے حوالے سے ہیں اور حدائق البلاغت کا نسخہ مطبع سراچی دہلی کا ہے جس کے متن میں اصل فارسی کتاب اور حاشیے پر صہبائی کا اردو ترجمہ درج ہے۔ اوپر جہاں کہیں حدائق کا حوالہ دیا گیا ہے اس سے یہی اشاعت مقصود ہے۔

احسان کے شاگرد بھی شہزادہ صابر سے اصلاح لینے لگے اور شہزادہ صابر کا نام "استادی کے ساتھ مشہور ہو گیا"۔

پھر حال دو برس کے بعد انہیں مولوی امام بخش صہبائی سے رجوع کرنا پڑا اور وہ صہبائی کے حلقہ تلمذ میں داخل ہو گئے ، گویا ۱۲۶۹ء کے قریب انہوں نے صہبائی کی شاگردی اختیار کی ہوئی۔ گلستان سخن کا آغاز ۱۲۷۰ء میں کیا گیا اور ۱۲۷۱ء کو یہ تذکرہ تکمیل کو پہنچا ! گویا مولانا امام بخش صہبائی سے استفادے کی مدت تذکرے کی تحریر تک بہ مشکل پندرہ سہ ماہی ہوتی ہے۔ اتنے مختصر سے عرصے میں استاد کا اتنا اثر کہ شاگرد کی تحریر پختگی اور روانی میں استاد کی تحریر کا عکس ہو جائے اور شاگرد کا قلم فن کے اسرار و رموز پر اتنی کم مدت میں ایسی دست رس حاصل کر لے جیسی کہ تذکرہ گلستان سخن میں ہے ، معجزے سے کم نہیں؟

۳۔ صابر کے بیان کا یہ حصہ قابل یقین معلوم ہوتا ہے کہ اس تذکرے میں جو کلام انتخاب کیا گیا ہے اس کی تدوین کا کام بہت پہلے سے شروع ہو چکا تھا :

"اثنائے مشق میں ریختہ گوئیان پیشیں کا کلام کچھ جزو دانِ حافظہ میں فراہم ہوتا جاتا اور کچھ گنجینہ بیاض میں انتظام پایا تھا ۔ ۔ ۔ اس عرصہ میں سخن متجان عصر کا کلام بھی ، جو کہ طبیعت کو پسند آتا گیا اور مقصد دل کو بھاتا گیا ، اجزائے علیحدہ میں غزوں اور بیاض جداگانہ میں مشحون ہوتا رہا ۔ ۔ ۔ ایک مدت کے بعد جو مجموع پر نظر

۱۔ شہزادہ صابر کا یہ بیان مبالغے سے خالی نہیں ہے اس لیے یہ خود شعرائے دہلی میں بھی اس وقت الہیں کوئی اہمیت حاصل نہ تھی ۔ شیفٹہ نے ۱۲۳۸ء تا ۱۲۴۵ء میں اپنا تذکرہ ترتیب دیا ۔ ان پر یہ الزام ہے کہ شعرائے دہلی کو اہمیت دی ہے لیکن شیفٹہ کا تذکرہ صابر کے ذکر سے خالی ہے ۔

۲۔ ہاں فارسی کلام پر احسان کی زلفی میں صہبائی سے ضرور اصلاح لیا کرتے تھے ۔ (گلستان سخن صفحہ ۱۲۱)

کی تو دفتر دفتر سرمایہ فراہم ہو گیا تھا اور پیکران خزانہ مجتمع - گاہ گاہ اپنے خیال میں گزرتا تھا اور کبھی کبھی کوئی دوست بھی تحریک کرتا تھا کہ اس نفوذ سرہ سے الجھنیں اور اس زور خالص سے تفاعل خوب نہیں - ایک ذخیرہ یہ طریق کچنکول کے جمع کر لیا جاوے اور ہر مقام میں نام قائل کا یہ طور عنوان کے ترقیم کیا جاوے . . . لیکن ہجوم مواقع اور کثرت مشاغل سے یہ آرزو حاصل نہ ہوتی تھی - حسن اتفاق سے . . . فرزند سعادت مند محمد عمر سلطان . . . کو شعر کا شوق دامن گیر ہوا . . . اس کی تربیت اب پیش نہاد ہوئی . . . خود کامل نے دفتر الفاظ وا کیا . . . ایک کتاب فراہم کر کے شعرائے معنی آفریں کا تذکرہ ہو . . . ایک معجون غریب مرکب ہو گئی . . . جناب افادت سائب مولوی امام بخش صہبائی مدظلہ العالی کی خدمت میں حاضر ہوا . . . عرض کیا . . . کہ سر انجام اس امر دشوار کا کم استعداد سے معلوم ، اگر کم ترین تلاش کی تحریر خلعت اصلاح سے مشرف ہو جایا کرے تو یہ مشکل آسان اور یہ رشتہ سر دو کم نمایاں ہو جاوے - بارے عرض نیاز شعار کی زبور قبول سے آراستہ ہوئی ، حلیہ اجابت سے زیراستہ ہوئی -“

(گلستان سخن ، صفحہ ۱۷ تا ۲۶)

یکم شعبان ۱۲۷۰ھ کو اس تذکرے کی باقاعدہ داغ بیل بڑی جس میں صرف معاصر شعراء سے سروکار رکھا گیا ہے اور ابتدا میں ایک دیباچہ ہے ، جس میں زبان کا ارتقاء فصیح اور غیر فصیح الفاظ و کلمات کی بحث ، علم عروض و قافیہ اور اقسام قلم کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے - یہ تذکرہ ۱۲۷۱ھ میں اختتام کو پہنچا - ماہ شوال ۱۲۷۱ھ کا اخیر تھا کہ مطبع مرتضوی میں یہ اہتمام حافظ محمد عیاض الدین شائع ہو گیا -

۴ - مذکورہ بالا تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرے کا ’اصل متن‘ (جس میں شاعروں کا حال ہے) تحریر کے وقت تک کئی مرحلوں سے گزر چکا تھا اور اس کا ابتدائی خاکہ گان غالب ہے کہ صابر ہی کا تیار کردہ ہو ! نظر ثانی میں کہیں کہیں استاد صہبائی نے ترمیم کی ہو تو عجب نہیں ، ورنہ ان شعرائے اردو کے بارے میں صابر اور صہبائی کے خیالات میں بین فرق موجود ہے - انتخاب دواوین میں صہبائی نے بعض معاصر شاعروں کو بھی شامل کیا ہے اور ان کے حالات لکھ کر کلام کے بارے

میں اپنی رائے دی ہے ، یہ رائے صابر کی درج کردہ آرا سے مختلف ہے ۔
یہ اختلافات ایک دوسرے کے محاذ میں ملاحظہ ہوں :

گلستانِ سخن

شاہ نصیر ، نصیر تخلص ، شاہ سوار
عرصہٴ سخنوری ، فارس مضاربِ معنی
پروری ، غزل بندِ حدیقہٴ کمال ،
باقیٴ بنائے انضال ، سخن سنج ،
سخن گو ، میاں کلو ، مشہور بہ
شاہ نصیر الدین خلقِ الصدیق شاہ
غریب ۔ مجاہدہ لسانی پر جہاں
مرحوم کی اسی کی ذات بایرکات سے
آسمانِ ما اور خلافت اس عارف
مفقور کی اسی کی نہاد خیر بنیاد سے
خورشیدِ شاہ تھی اور یہ مرحوم و
مفقور وہ ہے کہ اس کا مزار پر انوار
محلہ روشنی پورہ میں کہ ایک محلہ
محلات مشہور شاہجہاں آباد
لزمت آباد سے ہے ، زیارتِ کلو صاف
باطنائی پاک نہاد ہے ۔ بہر کیف
شاہ موصوف پر چند استعداد علمی
سے بہرہ ور نہ تھا بلکہ سواد بھی
چندان روشن نہ تھی ، لیکن روشنیٴ
طبعِ خداداد سے غلوتِ دل میں ہزار
شمعِ معنی بزمِ الروز تھی ۔ کیا
مرد میدانِ سخن وری تھا کہ بارہا
ہنگامہٴ مشاعرہ میں حریف ہنوز
انشادِ اشعار سے فارغ نہیں ہوا کہ
اس نے اس کوتاہ مدت میں شمع
مقابل رکھ کر اشعار سوزاں تر از

انتخابِ دواوین

نصیر ، شاہ نصیر الدین تخلص
نصیر عرف میاں کلو ولد شاہ غریب
کہ مشاہیر شعراءِ دہلی سے تھا بلکہ
بہت سے شاعرانِ زبانِ اردو ساکتین
دہلی اسی مفقور سے تلمذِ ریختہ گوئی
کا کرتے تھے اور یہی صاحبِ عالم
حیات میں اپنے تئیں مرزا محمد رفیع
سودا اور میر تقی میر پر فائق
سمجھتے تھے ۔ بہر کیف ریختہ گوئی
میں دستِ قدرتِ اچھی رکھتے تھے ۔
اواخرِ عمر میں دہلی سے حیدر آباد
دکن سہاراجہ حاکمِ وقت راجہ
چندو لال کی خدمت میں مشرف
ہوئے اور وہاں ہی اس جہانِ فانی
سے رحلت کی ۔ یہ چند اشعار بہ طور
بادِ گز تذکرہ مصنفہ حکیم فاضل و
المضیل میرِ قدرتِ اللہ مرحوم تخلص
قاسم سے اور جائے سے لیے گئے ۔

(ص ۱۷۸)

شعلہ شمع یہ قدر دو تین غزل کے
 لکھ کر مشتاقانِ سخن کے گوش گزار
 کر دیے - بیشتر تشبیہ نو اور
 استعارہ جدید ہم پہنچائے ہیں
 مصروف رہتا ہے اور شعر طرز
 صائب پر کہتا ہے - بلندی تلاش
 سے شاعرے میں کسی کی محزل کو
 اس کی غزل پر تفوق نہ ہونا تھا -
 سنگلاخ زمینوں کو دعویٰ داران
 کمال میں سے اس کے سوا کوئی
 سہ سپر نہ کر سکتا - ایک بار سفر
 لکھنؤ اختیار کیا ؛ جس دن یہ
 شہ سوار عرصہ سخن اس گل زمین
 میں وارد ہو کر کاروان سرا میں
 فرود آیا ، دفعتاً دردر کردہ میں مبتلا
 ہوا - قضا را خبر ورود فاش اور
 ہوس مطارحہ پر ایک کے دل میں
 گرم تلاش ہوئی - ان ایام میں
 مصطفیٰ اور انشاء اللہ خاں اور مرزا
 قنبل اور جرأت چار بالمش حیات پر
 متمکن تھے ، سب کے مشورے سے
 آٹھ مصرعے مشکل زمینوں میں طرح
 ہوئے اور اس مبتلائے کوفت سفر
 کے پاس پہنچے - اتفاقاً شاعرے
 میں تین دن باقی رہے تھے -
 معاذ اللہ سخت مشکل واقع ہوئی -
 زمین وہ سنگلاخ ، طے راہ اس دود
 و الم میں دشوار ، لیکن غیرت کے
 تقاضے نے ماسور اور اسی عرصہ

قلیل میں اس فرمائش کے سر انجام
 میں بھجور کیا۔ ان میں سے ایک
 کا ردیف قائمہ 'چمن سرخ ترا' اور
 'دھن سرخ ترا' اور دوسرے کا
 'فانوس ہیں گویا' اور 'جالیوس ہیں
 گویا' صنف جمع تھا۔ اس مہم
 ضروری سے فارغ ہو کر صرف اپنی
 طبع کے تقاضے سے ایک اور غزل کا
 فکر کیا کہ اس ردیف اور قائمہ
 'چمن کی مکھی' اور 'کفن کی مکھی
 تھا'، حسن اتفاق یہ ہے کہ اس
 کی شہرت کی کشش نے اکثر
 ساکنین شہر لکھنؤ کو اس کے
 حلقہ شاگردی میں کھینچ لیا تھا۔
 روز معهود ایک جم غفیر للامذہ
 اعتقاد کیش کا ساتھ لیے کر بساط
 مشاعرہ پر قدم رکھا۔ کمال نے فن
 نے جب اس زور طبع اور تیزی فکر
 پر اطلاع پائی، صلہ تحسین و آفرین
 سے شاد کیا اور حق الصاف ادا
 کیا۔ یہ تحسین و آفرین کہ اس
 شہری کلام کی خوبی سخن نے ان
 بزرگواروں سے بڑھ لی تھی اور پھر
 اس عوٹانے بھڑکنا کے ساتھ اہل
 اعتصاف کو ناگوار ہوئی، ایک
 کچ طبع ستیزہ عوٹے کہ شاگردان
 معجنی کے زمرے سے تھا، باآواز
 بلند کہا کہ "شاء صاحب فی الواقع
 ان آٹھوں غزلوں کی داد حیرت قدرت

سے خارج ہے ، نویں غزل میں
 ’مکھی‘ کی ردیف سے نفیس مزاجوں
 کا جی متلاتا ہے ۔ ” اس پکھ ناز
 عرصہ ” ظرافت نے بدیہہ کہا کہ
 ”لطیف طبعان نفیس مزاج تو اس
 موائد لذیذہ کے لغا سے لغت ستان
 اور کام یاب ہیں ، لیکن غالب ہے
 کہ علیہل نہادان صفرائے حسد کو
 جوش غیرت سے ڈاک لگ جائے ۔“
 اس کی شہرت میں مدعیان سخن
 کو ایسا معمول تھا جیسے فروغ
 آفتاب میں چراغ کو ۔ اس مقام میں
 حق کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے ۔
 کوئی اس کلام سے یہ نہ سمجھے
 کہ اس زمانے میں کسی کا پایہ
 شاعری اس کو نہ پہنچتا تھا ،
 حاشا وکلا اس بزرگ کا کلام عام
 فہمی کے سبب ہے کہ کم استعدادان
 لٹک ماہہ کے ذہن میں بہت جم
 جانا اور سہولت فہم سے ہر کس
 و لا کس کی زبان حرف نصہین سے
 ہنگامہ ” قیامت برپا کرتی اور
 معاصرین کا کلام از بس کہ خواص
 کی نصہین کے لائق تھا ، خواص ہر
 زمانے میں قلیل ہوتے ہیں ، نا فہموں
 کے نزدیک اس کے سخن ہر قائل
 معلوم نہ ہوتا تھا ۔ ”العاقل تکفیه
 الاشارة“ ۔ اکثر شاہ زاد گن والا

شان اور امرائے بلند مکان اس کے
فیض شاگردی سے بہرہ یاب تھے
بلکہ شاہجہان آباد میں پیش تر
شعرائے عالی طبع اور موزوں طبعانہ
لیز لہم ، مثل شیخ ابراہیم ذوق اور
محمد مومن خان مومن تخلص اور
میر حسین السکین اوائل حال میں
اسی کی شاگردی سے مشرف تھے ۔
الحاصل اطراف ہندوستان جنت نشان
کی سیر و سیاحت سے کام یاب اور
جس سرزمین میں وارد ہوا ، وہیں
کے شعرائے شیریں کلام سے معرکہ
آرا ہوا ۔ چند بار حیدر آباد میں
جا کر راجہ چندو لال مختار سرکار
وزیر الملک آصف چاہ نظام الملک
والی ”دکن کی قدر شناسی سے صلہ“
نمائاں پایا ۔ آخر کار اسی سرزمین
میں مضمون مرگ پاندھا اور سوسہ
بہشت کی زبان سے حرف تصنیف جا
سنا ۔ سلسلہ اس کی شاعری کا
ملک الشعراء مرزا رفیع سودا تک
پہنچتا ہے ، اس طرح سے کہ یہ
شاگرد سے مائل کا اور وہ قائم سے
مستفیض اور قائم سودا کا شاگرد
بلا واسطہ تھا ۔“

مجنون

مجنون تخلص ، نظام الدین نام ، بیٹا
 سید قمر الدین منت تخلص کا ہے ۔
 اس کی اصل شعبہ سونی پت اور
 مولد و منشاء شاہجہان آباد ۔
 کسبِ فنون اپنے والد بزرگ وار
 سے کیا ۔ مدتِ تلمذ لکھنؤ میں
 رہا ، ایک زمانہ جرگہ شعراء
 پایہٴ گفت حضور والا کے تھا ،
 چنانچہ پیش کاہ خلافت سے
 فخر الشعراء خطاب ہوا ، من بعد
 خلعِ اجماع میں پیش کہ کمبہی بہادر
 سے عہدہ صدر الصدوری پر ممتاز
 رہا ، مگر آج کل یہ باعثِ ضعف
 اعضا اور بینائی کے خاتمہ نشین یعنی
 شاہجہان آباد میں وارد ہے ۔ اوس
 کے کلام کی طرزِ نہایت دل چسپ
 اور شیریں ہے ۔ غرض کہ گلشن
 طماحت کا بلبل ہزار داستان اور
 چمن بلاغت کا طوطی شکر نشان ،
 اس واسطے یہ چند اشعار بہ طور
 نمونہ کے اوس کے دیوان سے انتخاب
 ہوئے ۔ (ص ۱۹۱ ، ۱۹۲)

مجنون

مجنون تخلص ، یگانہ عصر و وحید
 روزگار ، زہدہ کھلائے ہر دیار ،
 والی اقلیم سخن وری ، مالک ملک
 معنی ہروری ، ہم آغوش معانی پکر ،
 ہم دوش شاہدان فکر ، چاشنی گیر
 مضامین دل نشین ، میر نظام الدین
 خلف ملک الشعراء میر قمر الدین
 منت غفرانہ تھا ۔ اوصاف اس کامل
 الصفات کے حوصلہ تحریر سے المزون
 اور حدِ تقریر میں بیرون ہیں ۔
 ریختے میں ایک طرزِ تازہ اختراع
 کی اور حق یہ ہے کہ یہ موجب
 اس فحوا کے 'کل جدید لذیذ' اس
 کی لذت کے رو بہ رو لہائے موابد
 قدما سے جی سہر ہو گیا ، پیش گاہ
 عنایتِ سلطانی سے فخر الشعراء
 خطاب اور دہستانِ لعاف ازی میں
 حضرت رحمان سے تلمذ کا انتساب ۔
 طبیعت لائقِ شاہ وار سخن کی
 قیساں ، دل گوہر آب دار معانی کا
 عیان ، ہلندی فکر سے کثرۂ عرش
 پست اور نشہ معانی سے اہل سخن
 کی طبیعتیں مست ، شوخی غزل
 کے سامنے جوالوں کی طبع خجل ،
 منات قصیدہ کے رو بہ رو بیرون
 کی وضع منفعل ، نیک کلام ایسا
 کہ ہر چند اجتہادِ مداد کثرتِ صنم
 کی امداد سے سعی کرے ، زبانِ قلم

کا زخم التیام نہ ہاوے اور شیرینی
 ادا ایسی کہ اگرچہ حیلہٴ حسد
 طاقتِ لسان کی کمک سے اہتمام
 کرے ، جز چارۂ خاموشی ہاتھ نہ
 آوے ۔ نقطہٴ اس کی غزل میں
 سوز و گداز کے اثر سے رنگ گل
 اور طراوتِ شبم پیدا کرے اور
 دہانِ دوائرِ مضمونِ شور و فغان
 سے ہنکامہٴ قہامت برہا ۔ تراکیب
 فارسی کو زبانِ ریختہ سے ایسا ارتباط
 بخشا کہ کمالِ آشنائی سے بے رنگی
 کا اثر نہیں پایا جاتا اور معانی
 درست کو الفاظِ قریب الفہم سے
 اس طرح جلوہ دیا کہ ماہِ سی روز
 کی مانند کوتاہ نظر بھی اس کے
 فطارتے میں دھوکا نہیں کھاتا ۔
 کورِ سوادان کم فہم کہ اس کے
 سخن بلند کے معانی غریب اور
 مضامینِ دل فریب اور نکاتِ پارہیکہ
 کو سمجھ نہیں سکتے ، خود اس کی
 طرف التفات نہیں کرتے اور اربابِ
 فہم کہ سوادِ روشن اور طبعِ سلیم
 رکھتے ہیں ، غرابتِ تشبیہ و
 استعارات اور دورِ آپہنکی تلمیح و
 اشارات اور متانتِ تراکیب اور
 رشاقۃٴ اسالیب اور برجستگیِ نکات
 اور بلندیِ آیات میں تو کچھ سخن
 نہیں کر سکتے لیکن اس غرض سے
 کہ ناخنِ دقت کی کاوش اور طبیعت

رسا کا دخل ظاہر ہو، کہیں کہیں
 سرفے کے ساتھ مشہم کرتے ہیں۔
 یہ بزرگوار خیال نہیں کرتے کہ
 ایسا سخن سنج "ہر مایہ کہ اگر
 اس کے صندوق سینہ کو وا کریں،
 گنجینہ" تحت العرش کے مقابل دوسرا
 خزانہ شہار میں آئے، معافی پیش پا
 افتادہ چند کو کس امید پر زمین
 بے گاہ سے التقاط کرتا اور ان سے
 کس افزونی کی توقع پر اپنا خزانہ
 بھرتا۔ سخن چینوں کی عنانِ طبیعت
 اگر تعصب کے ہاتھ لہ بوقت، اس
 کلام میں احوالِ توارک کو راہ دے
 کر معذور رکھتے اور باقی سخن
 کے لطف سے طبع الصاف کو سرور،
 اور اگر سرفے کو بھی تسلیم اور
 اس پاک دامن کو ناکردہ گناہ
 سے مایخوذ کریں، تو بھی اگر حد
 اعتدال سے تجاوز اور دائرۃ الصاف
 سے خروج وقوع میں نہ آئے تو
 ان دو چار شعر کے سوا باقی کلام
 کو دیکھیں اور الصاف سے لفظ
 کریں کہ اتنا سرمایہ کس صاحب
 قدرت کو حاصل ہوا ہے؟ غزلوں
 کا ہجوم غزالانِ دشت سخن سے
 بیشتر، قصیدوں کا البوہ کو کہہ
 سلاطین سے اکثر، مصرعہ ہائے
 رباعی سے عناصرِ اربعہ کے مانند ابعاد
 ثلثہ مشحون اور ایہات قطعہ" تضعیف

بیوت شطرنج کی طرح شمار سے افزوں -
مدت مدیدہ تک نواح اجمیر میں
عہدۂ صدر الصدوری پر مامور رہا -
آخر ضعف پوری کے سبب سے اس
مشغلے سے دست کش اور شہر
شاہجہان آباد میں خانہ نشین ہوا -
دس گیارہ برس کا عرصہ ہوا کہ
سفر آخرت اختیار کیا -

(ص ۲۷۸ تا ۲۸۰)

سومن

سومن تخلص ، سخن سنج سے عدیل -
محمد سومن خان مرحوم شاعر اللہ ! -
زمین سخن اس کی بلندی فکر سے
ریشک الالاک اور اوج فلک اس کے
علو طبع کے مقابل ہستی خاک -
عروس معنی اس کے حجلہ طبع میں
شوخی و برجستہ ، راز لہجہ اس کے
سینہ قلم میں سر بستہ ، خامہ اس
کے سوڑ معنی سے نخل اور ورق اس
کے لروغ مضامین سے مطلع نور ،
مصرع آہ اس کی غزل عاشقانہ میں
تضمین اور اسرار پتین اس کے آیات
عارفہ میں گوشہ گزینی - سخن سنجان
عصر پر چند بالا دوی فیکر سے
عرش تاز تھے ؛ لیکن جو کہ ہم
والا نگاہ اپنی بہت عالی کے اوج
سب کے احوال پر نگاہ کر لیا تھا ،
پر سر بلند اس کو ہست اور پر

سومن

حکیم محمد سومن خان ، تخلص سومن
فن شاعری میں مشاہیر دہلی میں
اور نجوم و رمل میں بہت دست
قدرت رکھتے ہیں - غرض کہ ہر
فن میں یعنی زبان فارسی اور عربی
اور عروض اور قوافی وغیرہ میں
کمال ہیں اور صاحب دیوان -
(ص ۲۷۸)

بزرگ اس کو خورد نظر آتا ہے اور
 وہ بے تصنع اس کا نام اسی ہندار
 کے موافق زبان پر لاتا اور ہر چند
 مساحان اقلیم کمال منازل دور و
 دراز طے کر کے نشیب و فراز راہ
 سے واقف اور راہ بیراہہ سخن سے
 آگاہ تھے لیکن بس کہ یہ چاہنک
 خرام کمال پیشانی سے سراہل
 سے شہار باقی باقا تھا ، ان کو کابل
 قدم اور شکستہ پا جان کر بے اختیار
 ربش خند کرنا اور ان تیز قدموں
 کو نقش ہائے نارسا کر بتانا۔ جو کہ
 کونہا بینان روزگار اس والا ہانگی
 اور علوہمت سے آگاہ نہ تھے ،
 اس کی لکڑہ کو عیب میں اس کی
 زبان کو خردہ گیر تصور کر کے
 زبان سرزلش دراز اور طومار شکوہ
 دراز کرتے۔ ایک دیوان ضعیف کہ
 اصناف سخن پر مشتمل اور اس کے
 سامنے فصاحت سبحانی خجل ہے اور
 مشنویات متعددہ مثل قصہ غم اور
 شکایت ستم ، قول غمیں اور تقدیر
 آتشیں ، اس قادر الکلام سے منجہ
 روزگار پر یادگار ہیں۔ ہر چند زبان
 اردو میں تو علم یکتائی بلند ہی
 تھا لیکن کمال مہارت فارسی سے
 کوس "لن الملک" کی حدائے
 ہند سے فارس تک پہنچ کر طوطی
 ہند و بلبل شیراز کو دم بہ خود

کر دیا تھا ۔ غزل ہائے فارسی کاغذ
 پارہ ہائے براکندہ پر مثبت اور
 بالفعل محبت طبعی اور قرابتِ قریبہ
 کے تقاضے سے اس کی تہیض میر
 عبدالرحمان آپس تخلص ، غلف
 میر حسین تسکین کے عہدہ اہتمام
 میں ہے اور جو کہ وحید عصر نسیم
 اوحید ، جالینوس زمان ، بقراط آوان ،
 حکیم احسن اللہ خان سلمہ الرحمان
 کو شقائے مرضی کے اہتمام سے قدم
 بڑھا کر احيائے اسوات اور معجزہ
 مسیحائی کی ترویج پیش نہاد ہے ،
 قریب ہے کہ وہ دیوان منصف طبع
 میں جلوہ گر ہو کر شہرت کمال
 پیدا کرے ۔ اتفاقات قضا و قدر
 سے ایک روز ایک مکان کے بام بلند
 پر عروج معنی کے تصور میں تھا
 کہ ناگاہ لغزش پائے اوج سخن سے
 ہستی زمین کی طرف مائل اور
 مضمون پیش یا افتادہ کی جانب
 متوجہ کیا ۔ ہر چند اس بام کی
 بلندی چنداں پایہ نہ رکھتی تھی ،
 لیکن کچھ آسمان کی کج روی اور
 کچھ زمین کی ناہمواری سے دست و
 بازو میں ضرب شدید پہنچی ۔ اس
 شدتِ الم میں اس حادثہ جان کاہ
 کی تاریخ یہ باقی ، گویا پاؤں کا
 بھسلنا بام معنی کی نرد بان تھا ؛

مومن فناد از بام گفتم چه رفت گفتا
 خود با خروش گفتم بشکست دست و بازو
 چند ماه الواع شدائد نے ریج دیا
 کہ ان کا تحمل حذر بشر سے خارج
 تھا ۔ آخر الامر اسی سال میں کہ
 بارہ سو اٹھسٹ (۱۸۸۶ء) ہجری تھی ،
 سفر آخرت اختیار کر کے واپس گان
 چکر فگار کے دل کو ریج اور داع
 میں مبتلا اور حوران فردوس کو
 سعادت استقبال سے مستعد کیا ۔
 اس امر ناگزیر کے کئی مہینے کے
 بعد نواب مصطفیٰ خاں بہادر شیفہ
 تخلص کہ انسان صورت و ملک
 سیرت ہیں ، روئے صادق میں
 دیکھنے میں کہ گویا مومن خاں
 کا خط آیا ہے اور اس کے خاتمے
 پر خط سبز ہے ”مومن ہے“
 اہل الجنۃ“ ۔ وسعت رحمت سے
 کیا بعید ہے کہ جوشی دریائے
 مغفرت نے اس مسحق کراست کے
 دامن کو لوت عصیان سے پاک
 کر دیا ہو ۔ صدق اللہ عز و جل قال
 عذابی اصیب آمین انشاء و رحمۃ
 وسعت کل شیء :

اہر رحمت سخت ہے پروا خرام است اے صدق
 تائیدامی قطرہ این جا باز گرداند عذاب
 (ص ۹۱ - ۳۸۹)

ذوق

ذوق تخلص ، طوطی شکرستان شہری

ذوق

ذوق تخلص ، شیخ محمد ابراہیم نام ،

زبان ، بلبل چمن زار رنگیں بانی ،
 حیرتی نقود کمال ، دشتہ بند و لنگہنی
 مقال ، بانی بنائے فصاحت ، میزاب
 گلشن بلاغت ، فاروس مضار سخن وری ،
 شدہ سوار عرصہ ، معنی پروری ، مستند
 لشرین ایوان دانش و آکاہی ، استاد
 حضرت ظل سبحانی ، شیخ ابراہیم
 مخاطب بد خاقانی ہند ۔ سایہ تربیت
 ظل سبحانی میں شب جوانی کو
 صبح پیری لکھ بیٹھا دیا اور
 رضائے مرشد آفاق میں اپنی ہوائے
 نفسانی کو پک قلم مٹا دیا ۔ خسرو
 روزگار کی بدولت جس قدر درجہ
 اعتبار کا بلند ہوا ، مراتب پندار کا
 پست اور جتنا دیستان کمال میں
 پوشیار ہوا ، مے کدۂ عرفان میں
 مست ۔ کوہ اس گران قدر کے بلکہ
 وقار میں کلاہ ، آفتاب روشن اس
 صاف دل کے فروغ ضمیر کے مقابل
 سیاہ ۔ بلندی مراتب کو لباس
 خاکساری میں ایسا چھپایا تھا کہ
 جیسے گرد میں آسمان ، رعولت
 ٹولگری کو فقر میں ایسا دبایا تھا
 جیسے زمین کے نیچے کنج شائیکاں
 ۔ ۔ ۔ سبحان اللہ اس تازہ کفسار کی
 طبیعت کیا گلشن سراسر بہار اور کیا
 گلزار سراپا نگار تھی کہ فضلہ اس
 کا سبزہ و ریاحین سے بہتر اور
 خاشاک اس کا ہنشمہ و سنبل سے

دہلوی ۔ خطاب خاقانی ہند ۔ تیس
 برس کے عرصے سے ملازم درگاہ
 حالت ولی عہدی سے شاہ حال
 دہلوی کے ہیں اور فن شعر میں بھی
 ابتدائی عمر سے مصروف ہیں ۔ آپ
 اس زمانے میں خصوصاً دہلی میں
 کوئی ان کے مقابلے کا نہیں اور
 اکثر مشاعروں میں اوس کی آتش
 زبانی کے آگے اور شعراء مثل حس
 و خاشاک کے جلتے ہیں اور اس کے
 الفاظ برجستہ کے رشک سے جب
 کہ وہ محفل مشاعرہ میں غزل پڑھتا
 ہے ، شرمندہ ہو کر بے تابانہ کف
 افسوس ملتے ہیں ۔ لہذا یہ چند
 اشعار جو ایک ریاضی میں تھے ،
 بہ طریق یادگار لکھے جاتے ہیں ۔
 (ص ۲۴۹ تا ۲۵۰)

خوش تر - ہجوم قافلہ" معنی ہے
 ہر بہت میں معانی کثیر منزل گزیر ،
 اور کثرت ورود مضامین سے ہر
 مصرعے میں مضامین متعدد
 گوشہ نشین - ہر چند کثرت انواع
 سخن سے خود ترتیب دیوان کی
 طرف التفات نہیں کی ، لیکن اکثر
 احباب صداقت کیش اور تلامذہ
 اخلاص اندیش ان اشعار کو پر شمار
 سے بڑی بڑی بیاضیں فراہم رکھتے
 ہیں اور شب و روز مانند فرزند عزیز
 کے سینے سے منہم --- ماہ صفر سنہ
 بارہ سو اکہتر ہجری میں مرض
 اسہال نے اشتداد اور "اعراض
 گونا گوں" نے اشتداد ہم پہنچا
 کہ لشکر طبیعت پر شب خون کیا
 اور ضعف سابق اس مرض کا سر ہار
 اور اس علت کا علاوہ تھا -
 باوجودیکہ زبان کو یارائے حرف زنی
 اور لب کو طاقت جنبش باقی نہ
 تھی ، صفائے باطن اور چلائے آئینہ
 ضمیر کے اقتضا سے جو جو نگار خانہ
 جہان قدس سے اضافہ ہوتا تھا ،
 بے اختیار القاس فیض اقتباس کے
 ہم راہ محفل اظہار میں جلوہ گری
 کرتا تھا - اس کے نفس مطمئنہ کو
 مبداء فیاض سے کیا نسبت خاص تھی
 کہ وہ واردات شبیہی جن سواغ سے
 مشعر تھیں ان کا ظہور چاہو گاہ

وقوع میں بے تکلف معائنہ ہوا ۔
 اسی اثنا میں گنجینہ دارانِ خزینہ
 تحت العرش نے یہ گوہر بے جہا اس
 جوہری سخن پر عرض کیا :
 کہتے ہیں آج ذوقِ جہاں سے گزر گیا
 کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے
 اور طرفہ یہ ہے کہ جب وہ دن
 گزر گیا اور شبِ چہار شبِ آخری
 ماہِ صفر نے (بد آں کہ اس کی
 حیات سے بشور ایک رمق باقی
 نہیں) نقابِ سیاہ چہرہٴ روزگار پر
 ڈال دی ، کشادہ پیشانیِ خراب آباد
 عالمِ صوری سے دل اٹھا کر مسیحان
 صومعہٴ نیل گوں کے ہم پا کشن
 جہاں کی طرف راہی ہوا ۔
 (ص ۲۴۲ ، ۲۴۳ ، ۲۴۴ ، ۲۴۵)

ناسخ

ناسخ غناص ، سنج سخن بے عدیل
 و نقایر ، شیخِ امام بخشِ ناسخ ،
 ساکنِ خاک لطافتِ ہنیا لکھنؤ ۔
 مشاہیر شعرائے خوش سخن اور
 نام آورانِ کامل فن سے تھا ۔ اس
 کے فکر سے معنی کو تاب و جہا اور
 اس کی زبان سے الفاظ کو رونق و
 صفا ۔ ذہن کی صفائی یوسفِ رخاں
 عیب کا آئینہ ، قلم کا شکافِ ارباب
 کشف کا سینہ ۔ ربانی فکر گوہر
 وحیِ صندوقِ سینہٴ جبریل سے تاراج

ناسخ

ناسخ قتلص ، شیخِ امام بخشِ نام ،
 لکھنوی ۔ تمام عمر لکھنؤ میں بسر
 کی ۔ ایک دلچسپ وہاں کے حاکم سے
 کچھ رنجیدہ ہو کر الہ آباد کو
 چلا گیا ، پھر وہاں سے کانپور میں
 آیا ۔ بعد اوس کے زمانہ جو موافق
 ہوا ، وطن میں بھر گیا ۔ اب دو تین
 برس ہوئے کہ اس جہاں فانی سے
 طرفِ عالم جاودانی کے رحلت کی ۔
 القرض کہ ناسخ ناسخ تھا ۔
 (ص ۲۱۲)

کر لیتی تھی اور صید انگنی، غور
 فقیر وقت کو کمین گاہ گوش
 تارون سے آساج کر لیتی - وحشی
 مضمون ہنوز دام خرد میں صید نہیں
 ہوا کہ اس کے اندیشے کی کمند
 نیم تاب کی کشاد میں صحرائے عدم
 کی اس سرحد میں پہنچ کر جائل
 گردن ہو جاتی تھی اور طائر معافی
 اب تک عقل فعال قفس میں بند
 نہیں کہ اس کی طبیعت کی وسائی
 ایک پرواز میں آشیانہ، طیب مطلق
 سے شکار کر لاتی تھی - معنی، بست
 اس کی طبع کی اوج بخشی سے بلند
 اور الفاظ مکروہ اس کی تراکوب
 کے حلیے سے دل پسند - اگر غریب
 نواز نہ ہوتا معنی کی طرف اس قدر
 التفات نہ کرتا اور اگر آشنا پروری
 منظور نہ ہوتی الفاظ کی اتنی رعایت
 نہ کرتا - معنی، مبتذل اس کے
 تصرف سے غریب اور اوج فلک
 اس کے فکر کے سامنے لشیب -
 گروہ چشمان ہنر اس کے مالدہ
 سخن سے زلمہ بردار، دعوے دارانہ
 کمال اس کی شوکت الفاظ سے
 پامال - اہل انصاف اس کو استاد
 مانتے ہیں اور اہل انہم اس کے
 شعر کو سحر جانتے ہیں - منات
 مزاج سے مضامین شوخ باوجود آمد
 کے آورد کے محتاج اور ممکن طبیعت

سے معافی' برجستہ کو خلوت خیال
 سے دروازہ لب لک آئے میں تکلف
 کی احتجاج - ہر جند طریقہ' مختار اس
 کا کشیل ہے اور فی الواقع اس طرز
 میں بے مثل و عدیل ہے ، شعر
 عاشقانہ بھی اگر بے اختیار زبان
 قلم سے نکل گیا ہے شعلہ' شمع کی
 طرح سے پروانہ طینتوں کی طبع میں
 آتش افکن اور برگ گل کی مانند
 عندا لب مزاجوں کو ناخن بہ دل
 زن ہے - اخیر عمر میں غلبہ'
 غرافت سے جرأت کی وضع کو اختیار
 اور معاملہ بندی کو قصد کیا اور
 ایک 'دائر پریشار' نام اسی طرز کے
 اشعار سے مشحون اور اسی ڈھنگ
 کے ابیات سے مالا مال لکھا - ہر
 جند جرأت کی شاعری کا حال جیسا
 ہے ، اہل بصیرت اور از باب بصارت
 کہ مکمل استعداد اور سکھ' سخن
 کے نقاد ہیں ، خوب جانتے ہیں ،
 لیکن جو کہ ہمیشہ مضامین ہوس
 و کنار اس کے منہ چڑھے ہوئے اور
 مدام اس کی فکر سے ہم کنار تھے
 اور یہ اس ہوس کے دام میں لو
 گرفتار - یہ تقلید خوب بن نہ آتی
 اور بعض مقام میں یہ تو ناز و
 الداز میں محو ہوا اور شاہد معنی
 نے اس کو غافل کر کے بے باکانہ
 حجلہ کاہ ابیات سے اہنے کھر کی

راہ لی :

”حفظت شیئاً و غایت عنک اشیاء“

لیکن دردِ مندانِ سخن جاننے ہیں
کہ اتنی ناسرہ کاری ہے اس کے
لقد کمال کو بٹا نہیں لگتا - کہتے
ہیں کہ ایک دفعہ بود و باش خطہ
خوش آب و ہوائے لکھنؤ سے دل
گرفتہ ہو کر الہ آباد کی سر زمین
میں نشیمن اختیار کیا ، لیکن بعد
ایک عرصے کے کان پور میں آیا
اور وہاں ولقد آسائش کر کے پھر
وطنِ مانوف میں منزل گزیں ہوا
اور جب تک آغوشِ بعد میں آرام
نہ کیا ، اس کل زمین سے قدم باہر
نہ لگایا - اس کے سفرِ آخرت کو
تختیناً آٹھ سات برس کا عرصہ ہوتا

ہے - (ص ۱۲ - ۱۵ء)

گلستانِ سخن کے یہ اقتباسات شعرا کے بارے میں زیادہ تفصیلی اور گہری
معلومات کے علاوہ انتخابِ دواوین کی زبان کردہ آرا سے مختلف بھی ہیں ؛
خصوصاً ممنون اور ناسخ کے بارے میں جن خیالات کا اظہار ہوا ہے وہ
صہبائی کے مقابلے میں زیادہ وقیع ہیں اور اس بدلے ہوئے ذوق کی نمائندگی
کرتے ہیں جو صابر اور اسی عمر کے بعض دوسرے نقادانِ فن کے ہاں جلوہ گر
ہے - گلستانِ سخن میں شعراء کے حالات و کوائف بھی صہبائی سے جداگانہ
ذوق کے آئینہ دار ہیں - اب ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں حق بجانب ہیں کہ
گلستانِ سخن کا اصل متن صہبائی کی اصلاح سے مزین تو ہوگا لیکن صابر کا
اپنا تالیف کردہ ہی سمجھنا چاہیے - ہاں دونوں کے اسلوب میں مشابہت
ضرور ہے اور اسلوب کی مشابہت کا سبب اصلاح ہو سکتا ہے ؛ لیکن نفس
مضمون اسناد اور شاگرد کا جدا ہے -

(۴)

(۱) گلستان سخن کی مختلف حیثیتوں کے بارے میں قاضی عبدالودود صاحب نے معاصر میں جو کچھ لکھا ہے اس میں سے بعض ضروری اجزاء ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں :

(۲) گلستان سخن میں ۵۴ شعرا کے مستقل تراجم ہیں۔ مسلمان ۳۸۲ ، ہندو ۵۶ ، عیسائی ۲ اور ان میں عورتیں صرف دو ہیں اور دونوں مسلمان (پہلی یقینی طور پر ، دوسری قیاماً)۔ مسلمانوں میں ایسے شعرا جن کے فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے اشعار تذکرے میں ہیں ۱۶ ہیں ...

ایسے شعرا جن کا صرف فارسی کلام ہے ، ۲۳ ہیں۔ باقی وہ ہیں جن کا صرف اردو کلام دیا گیا ہے۔ ہندوؤں میں صرف ایک شاعر کا اردو فارسی کلام تذکرے میں درج ہے ، ۱۷ کے صرف فارسی اشعار ہیں۔ اور ایسے شعرا جن کا صرف اردو کلام ہے ، ۳۸ ہیں۔ عیسائیوں اور عورتوں کے صرف اردو اشعار ہیں۔

(۳) مقامی حیثیت سے دیکھئے تو دہلی ، جہاں کے ۱۳۷۵ شعرا تذکرے میں ہیں ، اور تمام مقامات پر غالب ہے ، لکھنؤ کے صرف ۱۶ شعرا قابلِ شمول سمجھے گئے ہیں ، باقی شعرا دوسرے مقامات کے ہیں جن میں غالباً سب زیادہ آگرے کے ہیں۔

سری رام کا یہ قول تو صحیح نہیں کہ مصنف نے دہلی سے باہر قدم رکھنا غار سمجھا ہے لیکن یہ ضرور صحیح ہے کہ بہ کثرت بیرونی مشاہیر مثلاً برق ، رشک ، صبا ، لوازش وغیرہ نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔ دہلی کے بارے میں مصنف کو ایک حد تک دعویٰ تھا لیکن وہاں کے بھی متعدد خوش گو شعرا (مثلاً مجروح ، ظہیر ، انور وغیرہ) کسی نہ کسی وجہ سے گلستان سخن میں داخل نہ ہو سکے۔ ہاں ایسے لوگ جس کا صابر و صہبائی سے تعلق ہے (غواء ان کی مشق چند روز ہی کیوں نہ ہو) تذکرے میں شامل ہیں۔

۱۔ بعض اوقات یہ فیصلہ مشکل ہے کہ کون شاعر کہاں کا ہے۔ میں نے بعض صورتوں میں قیاس سے بھی کام لیا ہے۔ (ق - ع - و)

(۴) زمانہ تالیف تذکرہ میں دہلی کے ہر طبقے کے لوگ شعر گوئی کی طرف مائل تھے اور صوفیہ ، اویاش اور ولد مشرب ، امرا اور بازاری ، بادشاہ اور شاہ زادے سب کو اس کا ذوق تھا ۔ تیموری خاندان کے شعرا جن کا اس تذکرے میں ذکر ہے ، ۷۰۰ ہیں ۔

(۵) اس امر سے کہ پہلے تذکرے کا نام آثار المعاصرین رکھا گیا تھا ، یہ نہ سمجھا جائے کہ اس میں صرف وہی شعرا ہیں جو اصطلاحی معنی میں صابر کے ہم عصر تھے ، اس لیے کہ اس میں فراق و قاسم وغیرہ ہیں جو صابر کیا صہبائی کے بھی ہم عصر نہیں کہے جا سکتے ۔

(۶) گلستان سخن (مقدمہ مقصد) میں دہلی کے جن اساتذہ کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے ان میں وہ بھی ہیں جو زمانہ تالیف سے بہت قبل وفات پاچکے تھے (نصیر ، نمنون) اور وہ بھی جو اس قدر کم عمر تھے کہ شاید صہبائی کے خاص حلقے سے باہر انہیں استاد نہ سمجھا جاتا ہو (مثلاً سوز) ۔ آزرده کا ذکر سب سے علامدہ کیا ہے اور انہیں سب سے بڑھایا ہے لیکن یہ غالباً مصلحت کی بنا پر ہے ۔ نہ وہ اس کے مستحق ہیں اور نہ صہبائی و صابر انہیں واقعی اتنا بڑا سمجھتے ہوں گے ۔

تذکرے کا آغاز بھی انہیں سے ہوا ہے (حالانکہ مقررہ قاعدے کے مطابق آباد سے ہونا تھا) ۔ اساتذہ کی تعریف میں بڑے مبالغے سے کام لیا ہے اور کہیں کہیں صاف معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کھل کر بات نہیں کہنا چاہتا ، یا کم از کم اس کی ذمہ داری خود قبول کرنا نہیں چاہتا ؛ مثلاً مومن کی خود بینی کا ذکر ۔ اظہار رائے میں ذمہ داری کا احساس کار فرما نظر نہیں آتا ۔ صہبائی سوز و صابر کی آواز گری (پروینکنندہ) تالیف تذکرہ کی سب سے بڑی غرض معلوم ہوتی ہے ۔

(۷) بعض غیر مشہور شعرا کے حالات میں واقعہ نگاری سے کام لیا ہے لیکن بیشتر مشاہیر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے ۔ تاہم بہت سی کام کی باتیں اس تذکرے میں ملتی ہیں اور آزاد نے آج کی حیات میں اس سے کئی جگہ کام لیا ہے (مثلاً حالات شاہ نصیر) ، گو اس کا اعتراف نہیں کیا ۔ یہ تذکرہ سخن شعرا کے بھی ماخذوں میں ہے ۔ خود اس تذکرے میں گلشن بے خار کے سوا کسی تذکرے سے کوئی بات نہیں

لی گئی ، بعض اور تذکروں کا ذکر اس میں ضرور ہے ۔

(۸) گلستان سخن میں التزاماً تلمذ کا ذکر نہیں ، خاص خاص شعرا کے شاگردوں کی تعداد جو مجھے اس کتاب سے معلوم ہوئی ، یہ ہے :
صہبائی ۳۸ (اس میں دوستات پڑھنے والے بھی شامل ہیں) نصیر ۲۹ ،
الحسان ۳ ، ذوق ۲۰ ، مومن ۲۱ ، بشیر ۱۵ ، حابر ۱۴ ، غالب
(بہ شمول حزین) ۱۲ ، ممنون ۸ ، ... سوز ۳ ، تنویر ۳ ، آزرده ۲ ،
عارف ۲ ، ثابت (مورخ الذکر کے بارے میں لکھا ہے کہ اولاد لیغوریہ میں
بیشتر اس صاحب طبع کی شاگردی سے ممتاز ہیں) ۔

واضح رہے کہ میں نے احتیاط سے گنا ہے لیکن تیار کرنے میں غلطی
کا احتمال ہے ۔ میں نے صرف ان شعرا کو لیا ہے جن کے بارے میں صراحتاً
لکھا ہے کہ کس کے شاگرد ہیں ۔ اپنے معلومات یا قیاس سے کام نہیں لیا ۔
اگر کسی شاعر کو ابکہ سے زیادہ استادوں سے تلمذ ہے تو اس کا شمار سب
استادوں شاگردوں میں کیا گیا ہے ۔

(۹) واقعات جب بیان کیے جائے ہوں کتاب میں زیادہ تر ایسے
لوگوں کا ذکر ہو جنہیں جاننے کے مواقع حاصل ہیں تو اغلاط زیادہ نہیں
ہوسکتے ، لیکن دہلوی شعرا ہوں یا بیہوشی ، تھوڑے بہت اغلاط ان کے
متعلق موجود ہیں ، مثلاً سرور کے استاد کا تخلص ساس لکھا ہے حالانکہ
یہ ساقی ہے (تذکرۂ سرور) ، میر میر علی انیس کا نام میر میر علی لکھا ہے ۔

اور تذکرہ نگاروں کی طرح گلستان سخن کے مؤلف نے بھی حالات
کی فراہمی میں زیادہ زحمت اٹھائی گوارا نہیں کی اور سرسری طور پر جو کچھ
معلوم ہوسکا ہے پیش کر دیا ہے ؛ مثلاً حزین دہلوی کے متعلق لکھا ہے
کہ اے عارف سے تلمذ تھا ، غالب ہے کہ اب غالب سے اصلاح لینے ہوں
گے ۔ خلاصہ یہ کہ ولی عہد کے لوگوں نے یہ آسانی تحقیق کی جا سکتی تھی
کہ وفات عارف کے بعد کسی کا تلمذ اختیار کیا تھا ۔

(۱۰) شاعروں کے تراجم کے ساتھ جو ان کے اشعار ہیں ان کی تعداد
یہ ہے : فارسی ۹۲۹ ۔ سید کے دو مصرع (و مادہائے تاریخ) مزید برآں ،
اردو ۳۶۱۴ ، خمس کے ۲۶ بند ۔ ان کے علاوہ مرقعے میں جو اشعار ہیں
وہ اس تعداد میں شامل نہیں ۔ ذاتی تعلقات کی بنا پر ایسے لوگوں کے اشعار

میں بھر دیے ہیں جن کے اشعار کچھ بلند پایہ نہیں۔ غلط انتساب کی صرف ایک مثال اس وقت میرے علم میں ہے :

ہوا ہے، ابر ہے، ساقی ہے، مے ہے ہر اک تو ہی نہیں افسوس ہے ہے
یہ میر الہی کی طرف منسوب ہے لیکن تذکرہ قدوت اللہ شوق میں جو
میر الہی کی ولادت سے قبل کی تالیف ہے، ایک گمنام شاعر کے نام سے ہے۔

(۱۱) کتاب کی عبارت نامانوس عربی و فارسی مفردات و مرکبات سے
ملو ہے اور اس میں ایک جملہ بھی ایسا نہیں جس میں اردو کا لطف ملتا
ہو۔ بے شک استعارات، خنک تشابہ، دور ازکار کٹائے، مزید برآں ظاہر
ہے کہ اس صورت میں بے ارادہ حقیقت سے انحراف ہو جانے کا بہت کچھ احتمال
ہے اور ایسا ہوا ہے۔

(۱۲) مقدمے میں بہت سی غہر ضروری باتیں ہیں لیکن جس زمانے میں
لکھا گیا ہے اس لحاظ سے غنیمت ہے۔ نوافل لسانیں پر مؤلف کی نظر ہے،
اگرچہ غلط مثالیں بھی دی ہیں۔ لفظوں کی اصل معلوم کرنے کا بھی شوق
ہے، اگرچہ اس میں بھی بعض جگہ دھوکا کھایا ہے۔ دساتیر سے متعلق
طویل بحث ہے۔ دساتیر سے واقفیت ظاہر ہوتی ہے مگر یہ تعجب کی بات
نہیں کہ اپنے معاصرین کی طرح مؤلف کو بھی یہ خیال نہ ہوا کہ یہ جعلی
ہے اور حوالشی وغیرہ میں جن کتابوں کا ذکر ہے یا تو ان کا وجود ہی
نہیں یا یہ بھی جعلی ہیں اور شکل اول میں اقتباسات بھی فرضی ہیں۔

(۳)

قاضی صاحب کے ان اقتباسات سے گلستان سخن کی اہمیت پر کافی
روشنی پڑتی ہے۔ مابین نے اگرچہ مشاعروں کے حالات دینے میں زیادہ محنت

۱۔ غالب نے قاطع برہان میں ایک معلم (صرح اشارہ یہ صہبائی) کے
بارے میں لکھا ہے کہ وہ غریبشتاب اور زندہ رود کے مطالعے کا
فطرہ ذکر کرتا ہے حالانکہ ان سے فارسی نہیں آ سکتی (صہبائی
اس کا مدعی نہیں)۔ صہبائی کی کسی کتاب میں جو ان کے نام سے
چھپیں ہے اور میری نظر سے گزری ہے ان کتابوں کا ذکر نہیں اور
غالب نے گلستان سخن ہی کو دیکھ کر قاطع میں ان پر الزام لگایا ہے۔

ہے کام نہیں لیا ، تاہم اپنے معاصرین کے بارے میں انہوں نے بعض نئی معلومات ضرور مہیا کی ہیں ، مثلاً دلی میں منعقد ہونے والے بعض شاعروں کے بارے میں ہمیں باخبر کیا ہے ۔ چنانچہ مندرجہ ذیل شاعروں کا حال گلستان سخن سے معلوم ہوتا ہے :

صفحہ ۲۲۹ : شاعرہ مدرسۂ غازی الدین کا ذکر اور آشفہ کے انتقال کا واقعہ ۔

صفحہ ۲۶۴ : شاعرۂ دیوان خانہ والد مرزا وجید الدین اختر ۔

صفحہ ۳۱۷ : شاعرۂ مدرسۂ غازی الدین کا تفصیلی ذکر اور شاہ نصیر کا طرحی غزلیں کہنا ۔

صفحہ ۳۱۵ : شاعرۂ دربار عام ۔

صفحہ ۳۹۴ : مجلسی شاعرہ ۔

صفحہ ۵۳۱ : شاعرۂ پر مکان شیفہ ۔

اس کے علاوہ اس تذکرے کی نارغی اہمیت بھی ہے اس زمانے میں استاد شاگرد کی روایت بڑی اہمیت رکھتی تھی ، اس لیے جا بجا مختلف شعرا کے استاذہ کا ہابندی کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے ۔ اس لحاظ سے اپنے دوسرے معاصر تذکرہ نگاروں میں یہ تذکرہ نمایاں حیثیت رکھتا ہے ۔

اس کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس میں شعرا کے حسب نسب کو بھی بنیادی اہمیت دی گئی ہے ۔ اگرچہ تذکرہ نگار اس بات کا ہابند نہیں کہ ہر معاصر کے بارے میں جو تحریر تذکرہ سے پہلے یا دوران میں فوت ہوا ہے ، ہابندی کے ساتھ سنہ وفات دے ، لیکن بعض شعراء کے حال میں صابر سنہ بھی درج کر گئے ہیں ، جس سے مورخ کے لیے آسانی پیدا ہو گئی ہے ۔

اس تذکرے کی تیسری خوبی یہ ہے کہ لکھنے والے نے شخصیت نگاری کو خاص اہمیت دی ہے ۔ چنانچہ اپنے بعض معاصر شعرا کے بارے میں ان کی آرا دلچسپ ہیں ، مثلاً :

صفحہ ۲۵۸ : احمد ۔ مروت و دوست نوازی میں یکساں زمانہ ۔

صفحہ ۲۶۵ : ارشاد ۔ درویش صاف طہرت ، پاک نہاد ۔

صفحہ ۲۷۱ : اشکی - فکر خوش ، طبع رسا ، ذہن سلیم ، اطوار حمیدہ ، عادات پسندیدہ ، ایک ذات میں جمع ہیں ۔

صفحہ ۲۷۵ : امین - باوجود ان کمالات کے حلم مجسم اور ہمد تن اخلاقی - ان کے لب کو برگ گل کی طرح سے کبھی تبسم سے اور ان کی ہر شئی کو شکوفے کی مانند شکفتگی سے خالی نہیں پایا ۔

صفحہ ۲۷۸ : امیر - تقریر شستہ اور گفتگو سے شائستہ اور روزمرہ صاف پر قادر تھا ۔

صفحہ ۲۸۱ بر میاں اوج کا خاکہ کمال فن کا ثبوت ہے ۔

صفحہ ۲۷۶ : جلس - مرد سیاہی وضع ، مودب ، کم گو تھا ۔

صفحہ ۲۷۳ : داغ - صاف دل ، لیک نہاد ۔

صفحہ ۲۱۸ آباد - ہم صحبتان آوارہ مزاج کے اختلاط سے تحصیل کمال کی طرف قاطباً توجہ نہیں ۔

صفحہ ۲۱۹ : آتش - یہ اعتبار غفلت کے آتش تھا ، یہ اعتبار تواضع کے خاک ؛ یہ اعتبار تن سست تھا ، یہ اعتبار فکر کے چالاک ۔

صفحہ ۲۲۹ : آزاد - خوش فکر ، ذکی الطبع ، شوق علم تصوف نے ضمیر حقیقت تعمیر پر استیلا پایا ہے ۔ جوان خوبصورت ،

وجیبہ ، زلد مشرب ، بے پاک مزاج ، آزاد وضع ، گویا

اسم یا مسمول ہیں ۔

صفحہ ۲۳۶ : آصف - مرد صاحب اخلاق و رنگیں صحبت ۔

صفحہ ۲۳۷ آفی - یاد حق میں مشغول ، آزادانہ بسر کرتے ہیں اور بیشتر اوقات سیاحت و سفر خصوصاً زیارت اولیا میں گزارتے

ہیں ۔

انراف پرستی کے اس زمانے میں جب حسب سبب کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی تھی ، مغلیہ تمدن کے باقیات میں سلجھے اور آداب مجلس کو بڑی شہرت ملی ۔ گلستان سخن کا مرتب بھی مغلیہ تمدن کی مٹی ہوئی قدروں کا امانت دار ہے ۔ مصنف شعرا کی شخصیتوں میں وہ مجلس زادگی کے اصول تلاش کرتا ہے اور ان کی مدد سے ہمیں اس معاشرے کی جھلک دکھانا ہے ، جس کے ٹوٹے ہوئے رشتے تاریخ ، مکتوبات ، تذکروں وغیرہ

میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ اس لحاظ سے گلستانِ سخنِ اردو تذکروں میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ جن شعرا کا ذکر اس میں کیا گیا ہے ان میں سے اکثر کے ساتھ مرثیہ کے تعلقات نہیں اس لیے اس کی بیان کردہ معلومات قابل اعتبار ہیں اور آخری مغایہ دور کو سمجھنے میں ان سے بڑی مدد ملتی ہے۔

(۵)

ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے اپنی کتاب شعراءِ اردو کے تذکرے میں قدیم تذکروں کی مختلف خصوصیات کا جائزہ لینے کے بعد تذکرہ نگاری کو ارتقاء کے اعتبار سے دو بڑے طبقوں میں تقسیم کیا، جو یہ ہیں :

طبقة اول : قدیم طرز کے تذکرے :

(۱) دہستان میر : یعنی وہ تذکرے جو میر تقی میر کی خصوصیات تذکرہ نگاری کا تتبع کرتے ہیں۔ واقعات میں اختصار اور اصلاحِ سخن ان تذکروں کے امتیازات ہیں۔ مثلاً :

(۱) نکات الشعراء میر تقی میر (۲) تذکرۃ روضۃ گویاں ، فتح علی حسینی۔ (۳) غزلِ نکات ، قائم (۴) تذکرہ میر حسین دہلوی (۵) مصحفی کے تذکرے۔

(ب) دیستان میر کے خلاف ردِ عمل : یہ ردِ عمل میر کی اختصار پسندی کے خلاف ہے اور اس کا نتیجہ اختصار کی بجائے ”جامعیت یہ لحاظ لیا۔“ و افراد ہے۔ ”عیار الشعراء اس جامعیت کا بڑا نمائندہ ہے۔ جامعیت پسند تذکروں کی گہرست یہ ہے :

(۱) عیار الشعراء ذکا۔ (۲) عمدۃ ، مستطیبات ، اعظم الدولہ سرور (۳) مجموعہ نغز ، حکیم قدوس اللہ قاسم۔ (۴) گلشنِ بے غار ، شیفتہ۔ (۵) گلستانِ بے خزان ، باطن۔

طبقة ثانی : جدید اثرات کے حامل تذکرے :

(۱) ان تذکروں میں سوانحیت کا رنگ غالب ہے۔ ان میں صرف منتخب شعرا کے مفصل حالات زندگی ملتے ہیں اور واقعات کی تاریخیں بھی معین کی گئی ہیں۔ ان تذکروں کے نام یہ ہیں :-

(۱) گلزار ابراریم - (۲) گلشن بند علی لطف -

(ب) دلاسی ، کریم الدین اور صبیحی کے تذکرے - ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سوانحیت کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ اردو شاعری کا ارتقاء بھی مطالعے میں آ جائے -

(ج) آب حیات ، آزاد - تذکرہ لویسی میں لٹریچر ہسٹری کا رنگ - بعد کے بیشتر تذکرہ نویس اس معاملے میں مولانا آزاد کا تتبع کرتے ہیں^۱ گلستان سخن اس تقسیم میں طبقہ ثانی کی ب شق میں آتا ہے -

(۶)

اردو شعرا کے تذکروں میں فارسی تذکروں کی طرح ایک ہی روایت چلتی رہی ہے جس کے بارے میں اب تک بعض غلط فہمیاں ادباء میں رائج ہیں - چنانچہ تذکروں کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر کریم الدین احمد ”اردو تنقید پر ایک نظر“ میں اس روایت کا خاص طور پر مذاق اڑاتے ہیں - ان کی رائے میں اردو تذکرے عبارت آرائی کا شکار ہیں اور ہر جگہ الفاظ کا سیلاب رواں ہے^۲ - ڈاکٹر عبادت بریلوی کی رائے میں مشرقی تنقیدی نظریات کا کوئی منظم ، مسلسل اور مربوط سلسلہ نہیں ملتا^۳ - اسی طرح ڈاکٹر عبدالقیوم ”تنقیدی نقوش“ میں ہمارے تذکروں میں تنقیدی شعور کی کمی کا رونا روئے ہیں ، لیکن ان صاحبوں کی آراء زیادہ قابل لحاظ نہیں ہیں ، اس لیے کہ انہوں نے اردو تذکروں کو اس دور کی ادبی اور معاشرتی فضا سے الگ کر کے دیکھا ہے - ان تذکروں میں بیان کیے گئے تنقیدی خیالات کی صحت یا عدم صحت کو زہر بحث لایا جا سکتا ہے ، لیکن اس سے یہ نتائج نکالنا کہ اردو شاعروں اور ادیبوں میں سرے سے تنقیدی شعور ہی موجود نہیں ، درست نہ ہوگا - مسیح الزمان صاحب نے قدیم تذکروں کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بالکل بجا کہا ہے :

”کون کہہ سکتا ہے کہ غدر سے پہلے کے اردو شاعروں میں تنقیدی شعور نہیں تھا - اتنا ضرور ہے کہ وہ ایک ایسے دور

۱ - شعرائے اردو کے تذکرے ، ڈاکٹر عبد العبد ، صفحہ ۱۳۰-۱۳۱ -

۲ - اردو تنقید پر ایک نظر : طبع اول ، صفحہ ۱۸ -

۳ - اردو تنقید کا ارتقاء : صفحہ ۶۲ -

میں پیدا ہوئے تھے جب خیال سے زیادہ الفاظ پر زور دیا جاتا تھا ۔ جب بات کہنے کا طریقہ بات سے زیادہ اہم سمجھا جاتا تھا ۔“

اردو تذکرہ نگاروں کے ہاں یہ تنقیدی شعور مختلف ادوار میں یکساں قوی نہیں رہا۔ میر تقی میر اور ان کے معاصرین کے ہاں الفاظ پر خیالات کو غوریت حاصل ہے اور وہ تنقیدی اصطلاحات ، جہیں پروفیسر کلیم الدین احمد ”الفاظ کا سیلاب“ کہتے ہیں ، غیر محتاط طریقے پر استعمال نہیں ہوئیں ؛ بلکہ ہر لفظ کا ایک مقرر اور معین معنی ہے ، جس کے حوالے سے میر اور ان کے ساتھی اپنا مافی الضمیر ادا کرتے ہیں ، یہ دوسری بات ہے کہ ان کے بنیادی تصورات محدود ہیں اور اسالیب کی بازیکیوں میں یہ لوگ دور تک نکل جاتے تھے ۔ میر کے بعد میر حسن اور ان کے معاصرین کی تذکرہ نگاری کا زمانہ آتا ہے ، جب تنقیدی سے سوانحی حصہ زیادہ اہم ہو گیا اور تذکروں میں حالات و واقعات نے تنقید سے زیادہ اہمیت حاصل کر لی ، لیکن اس زمانے میں بھی عروض و معانی و بیان اور صنائع بدائع کے معارف سانچے تنقیدی آراء میں دخل انداز رہے ۔ اس تنقیدی روایت میں بھی تبدیلی آئی ۔ مصحفی اور ان کے ساتھیوں نے غزل کی غنائی روایت کو خصوصی اہمیت دی ۔ یہ نیا تنقیدی شعور اردو تذکرہ نگاری کی قدیم روایت میں نئے باب کا اضافہ کرتا ہے ۔ تنقید اب معاشرتی نقاد سے ہم آہنگ رہ کر تنقیدی شعور کی تربیت میں لگی رہی ۔ یہی وہ زمانہ ہے جب فورٹ ولیم کالج میں تذکرہ نگاری کا ایک اور دیستان وجود میں آتا ہے جس نے سوانحی رنگ کو زیادہ لکھاؤ دیا ۔ یہ نیا انداز تذکرہ نگاری مسلسل نہ رہ سکا ، تا آنکہ دلی اور لکھنؤ میں تذکرہ نگاری کا وہ انداز شروع ہوا جس میں شعراء کی تعداد کو زیادہ اہمیت حاصل ہوئی ۔ اسی زمانے میں گلشن بے خزاں ، عیار الشعراء ، خوش معرکہ ، زیبا ، سربایا سخن اور عمدۃ المتجدد وغیرہ لکھے گئے ۔ یہ قدیم دیستان تذکرہ نگاری کا آخری زمانہ ہے جب معاشرتی زندگی میں زوال پذیر عناصر کی کثرت کی وجہ سے ، نیز زبان پر ضرورت سے زیادہ نوجہ ہو جانے کے سبب ، دلی اور لکھنؤ کی شاعری اور ادب متاثر ہونا شروع

ہو گئے تھے۔ دلی اور لکھنؤ کے اس دور کی تذکرہ نگاری کا عام رجحان سوانحی حمے پر توجہ کی بجائے شخصیت اور تنقید کی طرف زیادہ ہو جاتا ہے۔ گویا اس مرحلے پر اردو تذکرے شخصیت نگاری اور سوانح نگاری کے اوصاف سے متصف ہو کر اردو تنقید میں ادب کے نئے رجحان کی نشان دہی کرتے ہیں۔ شعرا کی شخصیت کے بارے میں رائے تذکروں میں عام ہو جاتی ہیں، استاد شاگردی کے سلسلے اہمیت حاصل کر جاتے ہیں اور تنقید میں لفظی گرفت اور مناظرے اور مناقشے زیادہ اہم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ شعراء کی وفات کے سنین بھی غیر محتاط صورت میں قلم بند ہونے لگے۔ اس دور کے تنہا محتاط تذکرہ نگار عبدالغفور خاں لساخ ہیں جنہوں نے 'سخن شعراء' میں شاعروں کی تاریخ وفات کو اکثر احتیاط کے ساتھ درج کیا ہے۔ سبب شاید یہ ہے کہ لساخ دلی اور لکھنؤ کے شہروں سے بہت دور زندگی بسر کر رہے تھے اس لیے وہ ان شہروں میں پروان چڑھنے والی بعض قباحتوں سے بچ گئے۔ مجموعی اعتبار سے یہ دور ساجی اور سیاسی زوال کا ہے۔ معاشقہ زندگی کی ابتری کا اثر تذکروں پر بھی پڑا۔ اب تذکروں میں تنقیدی رائے گروہ بندی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ شیعہ اور ان کے معاصرین کی تعریفیں اس طرح کے خارجی عوامل سے خالی نہیں ہیں جو معاشقہ زندگی کی بربادی اور بد نظمی کو آشکار کرتے ہیں۔ شیعہ الیہ الفاظ کے استعمال میں Under tone کو مد نظر رکھتے ہیں۔ ان کے تذکرے کی عبارتیں بظاہر غیر محتاط عبارت آرائی محسوس ہوتی ہیں لیکن درحقیقت لفظوں کے اس بے دریغ استعمال کی تہ میں بعض دوسرے ضمنی اور ذیلی اشارے بھی پائے جاتے ہیں جن سے شیعہ کا تذکرہ ایک دل چسپ دستاویز بن گیا ہے، ورنہ اس آخری دور کے قدیم رنگ کے تذکرہ نگاروں کے ہاں الفاظ کا سیلاب پایا جاتا ہے اور یہ سیلاب (جس کے خلاف ڈاکٹر عبادت، کلیم الدین احمد وغیرہ نے زہر آگلا ہے) کچھ کچھ ان کتابوں تک بھی جا پہنچا ہے جنہیں جدید اثرات کے حامل تذکرے کہا جاتا ہے۔ ان نئے تذکروں میں سوانحیت کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کے ارتقا کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے اور ایک حد تک تنقید کی آن گم شدہ کڑیوں کو بھی جوڑنے کی کوشش کی گئی ہے جو اس دور کے ادب کے لیے بالکل سامنے کی چیزیں تھیں اور جنہیں عام طور پر قلم بند نہیں کیا جاتا تھا، لیکن آج ہمارے لیے

ان کڑیوں کی موجودگی کے بغیر قدیم تنقیدی روایت کو سمجھنا خاصا مشکل ہوتا ۔

تذکرہ نگاری کی یہ اہم شدہ روایت جس کا آغاز کلاسیں دہاسی ، کریم الدین ، مسہابی اور گلستان سخن کے مرتب نے کیا ہے ، شاعری کے تاریخی ارتقا کو مد نظر رکھتی ہے اور مختلف دور کے شاعروں کو ایک خاص پس منظر میں پیش کرتی ہے ۔ اس سے اردو تذکرہ نگاری میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے ۔ یہ دور کچھ تو نئی فضا کی خوبیاں رکھتا ہے اور کچھ اس میں قدیم زوال پذیر تمدنی زندگی کے آثار باقی جاتے ہیں ۔

ان تذکروں کا ڈھانچہ یہ قول مسیح الزمان :

”تذکروں سے الگ تاریخ ادب کے ڈھنگ پر ہے ۔ یہ تصور دہاسی کا مرہون منت ہے جس کا سوچنے کا ڈھنگ اور تجزیے کا طریقہ اردو کے دوسرے تذکرہ نگاروں سے مختلف تھا اور اسی وجہ سے اس نے اردو ادب کی ایسی تاریخ لکھی جو بہت کچھ مغربی طرز کی تھی جس میں مبالغہ کم اور بیان واقع زیادہ تھا“ ۔

دہاسی کی یہ احتیاط اس کے اپنے مقلدین کو بھی صرف ایک حد تک متاثر کر پائی اور یہ شعول کریم الدین ، ان تذکرہ نگاروں سے واقعات کی صحت کا اہتمام زیادہ نہیں ہو سکا ۔ ان دانش مندوں کی تنقیدی آراء ایک حد تک جچی تلی ہونے کے باوجود لفظی اور لفظوں کے لیے ضرورت استعمال کی طرف راغب ہیں ۔ ان کی اکثر تنقیدی اصطلاحات مبہم اور غیر معین ہیں ۔ گلستان سخن اس لحاظ سے اپنے معاصر تذکروں سے علیحدہ ہو جاتا ہے کہ اس میں اکثر معاصرین سے سروکار رکھا گیا ہے ۔ اس فاضل تذکرہ نگار کی توجہ شعرا کی شخصیت اور ان کے انسانی شاگردی کے سلسلوں کی طرف زیادہ رہی ، تنقیدی رائے میں وہ اپنے دور کا ہونے کی وجہ سے ، معروضی انداز اختیار نہیں کر سکا ، اس لیے اس کی بیان کردہ آراء مجموعی طور پر زیادہ وسیع نہیں ہیں ۔ چنانچہ جن عارفتوں اور تنقیدی اصطلاحوں میں شعراء پر تنقید کی گئی ہے وہ مبہم اور غیر واضح بھی ہیں ۔ چند مقامات پر البتہ

ان کی رائے میں بھی وہ انداز آگیا ہے جس کی وجہ سے ہم میر اور ان کے معاصرین کے تذکروں کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس تذکرے کا سلسلہ اپنے دور سے قدیم تر تذکروں کے ساتھ جاملتا ہے، تاہم دوسرے قدیم تذکروں کے مقابلے میں اس میں شعر کی ماہیت، تخلیقی عمل، شعری روایت اور انتقاد کا سرمایہ کم ہے۔ سبب شاید یہ ہے کہ موابی امام بخش صہبائی باوجودیکہ دہلی کالج سے متعلق تھے اور شاعری کا جو تعلق قدیم نظام معافی و بیان کے ساتھ تھا، نیز شعری عمل میں زبان کو جو اہمیت حاصل ہوئی ہے، اس سے ایک حد تک واقف تھے اور انہوں نے اپنے انتخاب دواوین میں نہ صرف شعرا کے زمانی قرب کو قائم رکھا ہے بلکہ شاعری سے متعلق بعض مسائل کو بھی دیباچے میں بیان کر دیا ہے، پھر بھی ان کے ہاں تاریخ نگاری ہی کا بلہ بھاری ہے۔ گلستان سخن کا حالات والا حصہ بنگان غالب ان کے شاگرد کی تالیف ہے، اس لیے شعرا کا حال اس عیب سے خالی نہیں۔ کتاب کے شروع میں فن شعر سے متعلق جملہ معلومات درج ہیں اور یہ احسان ہوتا ہے کہ تذکرہ نگار شعری سرمائے کو ایک نئے زاویے سے دیکھ رہا ہے۔ اس کے باوجود یہ نقطہ نظر شعرا کے حال میں آکر ایک بڑی حد تک سرد پڑ جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ تذکرہ اپنے دور کی دونوں متضاد تحریکات کے زیر اثر ہے کہ ایک طرف اس میں گارسیں دتاسی کی قائم کردہ روایت کی جھلک موجود ہے اور دوسری طرف اس کا تنقیدی مزاج اپنے دور کی زوال آمادہ روایت سے منسلک ہے۔

موابی حصے پر اگرچہ اس تذکرے میں زیادہ توجہ نہیں کی گئی لیکن بعض دوسری ضمنی معلومات کی وجہ گلستان سخن کا مراتب ضرور اپنے بعض دوسرے ہم عصر تذکرہ نگاروں سے سبقت لے گیا ہے۔ تذکرے کی اہمیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس سے غالب اور ان کے معاصرین کے بعض تنقیدی رجحانات اور ذوق ادب کی بعض بدلتی ہوئی صورتوں کا سراغ ملتا ہے۔ اس لیے آخری دور کے تذکروں میں گلستان سخن کو ایک اہم حیثیت حاصل ہے۔

بنیادی اردو-ایک تجزیہ

(۱)

بنیادی اردو، ڈاکٹر ابوالیت صدیقی نے مرکزی بورڈ کی ایک تجویز کے مطابق تیار کی ہے۔ یہ ان بنیادی الفاظ کی فہرست ہے، جو روزمرہ بول چال میں استعمال ہوتے ہیں اور جن کی مدد سے ”وہ لوگ جن کی مادری زبان اردو نہیں کم سے کم مدت میں اردو میں اپنے خیالات ادا کر سکتے ہیں اور روزمرہ گفتگو اور کاروبار میں اپنا مفہوم واضح کر سکتے ہیں“ (تعارف صفحہ ۷)۔ گویا یہ بنیادی انگریزی کی طرز پر ترتیب دیا ہوا مجموعہ الفاظ ہے جس میں مرتبین کا مقصد جدید لسانیات کی روشنی میں ایسا ذخیرہ الفاظ فراہم کرنا ہے جس کی مدد سے غیر ملکی اردو میں روزمرہ کی گفتگو، اور کاروباری مطالب ادا کر سکیں۔ یہ ذخیرہ الفاظ مرتبین کے قول کے مطابق روزمرہ بول چال سے اخذ کیے گئے ہیں۔ بول چال سے اخذ کرنے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا گیا ہے؟ مرتبین نے اس کی وضاحت نہیں کی اور صرف اس قدر بتانا کافی سمجھا ہے کہ کتاب کے مرتب جدید لسانیاتی اصولوں کی بنیاد پر تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔ کیا یہ ذخیرہ الفاظ اردو کے عام اخبارات سے جمع کیا گیا ہے؟ کیا پاکستانی سکولوں کے طلباء اور طالبات کی گفتگو کو ٹیپ کر کے حاصل کیا گیا ہے؟ کیا اس ذخیرہ الفاظ کی جمع آوری میں دیہات اور شہر کی معاشرتی زندگی کے جملہ پہلو مرتبین کے پیش نظر تھے؟ کیا غیر مالک سے آنے والوں کی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ الفاظ یکجا کیے گئے ہیں؟ ان سوالوں کا جواب اس کتاب میں نہیں ملتا۔ ناقص اور آسان طریق کار یہ ہو سکتا ہے کہ باری معاشرتی زندگی کے کسی ایک طبقے یا پاکستان کے کسی شہر کے بسنے والے ایک مخصوص گھرانے کو اردو کا نمائندہ قرار دے کر لغت تیار کر لی جائے یا پھر کوئی اجنبی سی ڈکشنری سامنے رکھ کر اپنے ذوق کے مطابق بعض لفظ جھانٹ لیے جائیں۔ مجھے شبہ ہے کہ زیر نظر تالیف میں یہی دو آخری طریقے استعمال ہوئے ہیں۔

اردو پاکستان کی قومی زبان ہے اس کے زائد اور متحرک الفاظ وہ ہیں جو یہاں کی شہری اور دیہاتی زندگی کے کاروباری ، نجی ، ادبی اور فکری سوتوں کے ساتھ براہ راست ہم آہنگ ہیں ۔ وہ الفاظ روزمرہ اور محاورات نسبتاً غیر متحرک اور جامد ہیں جو یہاں کے رسم و رواج ، عام رہن سہن ، عمومی ضروریات اور مذہبی و معاشرتی ، اقتصادی اور سیاسی حالات اور معقدات سے صرف دور کا علاقہ رکھتے ہیں ۔ بنیادی اردو کا ذخیرہ الفاظ چھانٹنے کے لیے جہاں ایک طرف ایک غیر ملکی معاشرے کی شخصی ضروریات کو سامنے رکھنا ہوگا وہاں پاکستان کے شہری حلقے کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ شہری آبادی میں ابھی ابھی دو طبقے نمایاں ہیں جو ابھی تک جذب ہو کر ایک وحدت نہیں بن پائے۔ اس لیے ماہر لسانیات کا اولین فرض ہے کہ وہ غیر ملکیوں کو زبان کے ان متعارف اور کثیر الاستعمال عناصر سے روشناس کرائے جو اس کی روزمرہ کی ضروریات اور عام گفتگو کے تقاضے پورے کر سکیں ۔ یہاں ادبی زبان مفید نہیں ہو سکتی ۔ بول چال کی زبان اور ادبی زبان میں بہت فرق ہوتا ہے ۔ اردو کے سلسلے میں یہ فرق کچھ اور بھی زیادہ ہے ؛ کیونکہ اردو کا ادبی ڈھانچہ زیادہ تر لکھنؤ اور دلی کی روایت کے زیر اثر پروان چڑھا ہے ۔ ادبی زبان پاکستان کی علاقائی بولیوں سے مغایرت رکھتی ہے ۔ یہ مغایرت اور فاصلے صحافی حلقے میں بہت کم ہیں ، اس لیے پاکستان میں بول چال کی اردو کے قریب تر کوئی شکل ہو سکتی ہے تو وہ صحافت ہی میں ہے اس لیے موزوں معلوم ہوتا ہے کہ یا تو بنیادی اردو کا ذخیرہ پاکستان کے اخبارات سے جمع کیا جائے یا پھر زیادہ موزوں طریق کار یہ ہو سکتا ہے کہ مختلف طبقات قوم سے چند افراد (جن تک ایک سوالتائے کے ذریعے رسائی حاصل کی جائے) اس کے بعد لفظوں کا تمدد (Frequency) اور غیر ملکیوں کی عمومی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے فہرست تیار کرنا زیادہ مناسب تھا ۔

کہااتا ہے ، ہاں خوری کو پاکستان میں عوامی زندگی میں کوئی سماجی مراتبہ حاصل نہیں ۔ بنیادی اردو کے مراتب اسے بہت پسند کرتے ہیں اور اس کے جمادہ لوازم کے لیے ذخیرہ الفاظ سمیٹا کرتے ہیں :-

چونا ۔ چھالیا ۔ کٹھا ۔ الاٹھی ۔ ہان ۔

یہ الفاظ ہماری دیہاتی زندگی سے تعلق نہیں رکھتے اور شہری زندگی میں بھی ایک محدود طبقے کے معمولات میں شامل ہیں ۔ دیہاتی زندگی میں جو الفاظ اہم ہو سکتے ہیں وہ ہاں اور اس کے متعلقات نہیں بلکہ مندرجہ ذیل الفاظ ہیں :-

چرخہ ۔ چکی ۔ چھاج ۔ چارباہی ۔ کھیس ۔ کاسھاڑا ۔ ہل ۔ دوانٹی ۔ کوبر ۔ بیل ۔ رٹھا ۔ کھیریل ۔ کھالچا ۔ گودڑ ۔ کھڈ ۔ کھڈا ۔ ان میں ہل اور بیل کے سوا باقی کسی لفظ کو درج نہیں کیا گیا ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بنیادی اردو کے مراتب نے دیہات کو چنداں اہمیت نہیں دی اور شہروں سے زیادہ سروکار رکھا ہے ۔ اگر ایسا ہے تو پاکستان کی شہری زندگی سے متعلق ذخیرہ الفاظ کی کثرت ہونی چاہیے ۔ یوں تو بھارت اور پاکستان کے علاقوں میں کم و بیش سبھی ترکاریاں اور دالیں کھائے پکائے میں کام آتی ہیں لیکن بعض دالیں اور ترکاریاں یورپی میں زیادہ مقبول تھیں ۔ بعض یہاں زیادہ مقبول ہیں ۔ بنیادی اردو کے سلسلے میں یہاں دال سبزہوں کو زیادہ اہمیت حاصل ہوگی ۔ کھانوں میں بھی قلیے ، قورمے ، پوری کچوری کے مقابلے میں پاکستان میں پرائیڈوں ، مکی کی روٹی اور ساگ وغیرہ کا رواج زیادہ ہے ۔ چند مقبول ترکاریاں اور دالیں یہ ہیں :-

مٹر ۔ چنا ۔ آلو ۔ ارہر ۔ ارد ۔ ساگ ۔ کدو ۔ کاجر ۔ گوبھی ۔ مولکرا ۔ بینگن ۔ مٹائٹر ۔ مولگ ۔

ان میں بنیادی اردو کی بارگاہ میں صرف سلجم ۔ آلو ۔ چنے ۔ بینگن ۔ کدو ۔ مٹائٹر اور مٹر کو باریابی کا شرف حاصل ہو سکی ہے ۔ دوسری کثرت سے استعمال ہونی والی ترکاریاں اور دالیں نظر انداز ہو گئی ہیں ۔

بادرہیں خائے کے لوازم ملاحظہ ہوں :-

روٹی ۔ آٹا ۔ آتش دان ۔ آملیٹ ۔ چلمچی ۔ دسرخوان ۔ ناشدہ ۔

نہاری ۔ خعیر بیسن ۔ مرثبان ۔ کلچہ ۔ اتارداہد ۔

ان میں کوئی لفظ بنیادی اردو کا شمار نہیں ہوا۔ بھارہ ہرائٹا سنہ نکٹا وہ گیا ہے، اس کی جگہ بوری براجان ہے، پتیر اور قورمہ کی حکومت ہے۔ اس سے ایک غیر ملکی کو غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ پاکستان کے مقبول اور معروف کھانے یہ ہیں۔

بھلوں کے بارے میں بھی فاضل مرتبین کی معلومات ناکافی ہیں۔ بعض بھلوں کا ذکر نامناسب نہ ہوگا :-

چلوغزہ - خوبانی - بادام - آڑو - ناشپاتی - مونگ پھلی - مالٹا - کرما - کیلا - ناریل - کنوں - خربوزہ - پستہ - تربوز -

یہ ہمارے دالیں وروں کو پسند نہیں۔ ان کی نظر میں پاکستان کے مشہور اور معروف پھل صرف یہ ہیں :-

آم - پیٹا - سنگترہ - اخروٹ - ککڑی اور امرود - سپارلیور اور لکھنؤ کے آس پاس کے آم ناگیور کے سنگترے، لکھنؤ کی ککڑیاں - الہ آباد کے امرود بہت مشہور ہیں۔ ہمارے ہاں حال ہی میں ان پھلوں کی کچھ بہتر فصلیں ہونے لگی ہیں ورنہ ہمارے ہاں کے زیادہ مقبول پھل تو جاسن، کیلا مالٹا، خربوزہ، تربوز اور کنوں ہیں یا پھر کسی حد تک سلطان کے آم۔

مرتبین کی معلومات حد درجہ ناقص معلوم ہوتی ہیں۔ مذہبی عقائد و شعائر سے متعلق یہ الفاظ عمومی استعمال کے ہو سکتے ہیں :

نماز - ثواب - قرآن - مسجد - محرم - محفل - تسبیح - داڑھی - عشا - فجر - ظہر - عصر - قربانی - مہراب - ملا - موذن - گنبد - گراویج - زکوٰۃ - ان میں سے صرف نماز - ثواب، زکوٰۃ - قرآن - مسجد - محفل اور محرم کا ذکر ہوا ہے۔ باقی الفاظ مرتبین کے خیال میں قابل ذکر نہ تھے۔

(۴)

ذخیرۃ الفاظ کی اس کمی بیشی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یا تو مرتبین بول چال کی اردو اور معیاری ادبی اردو میں کوئی فرق نہیں کر پائے یا پھر ان کے سامنے بول چال کا وہ بیان ہے جو شہری زندگی کے صرف ایک طبقے کے خیالات و احساسات کا ترجمان ہے اور اس کا پاکستان پر

اطلاق ممکن نہیں یا پھر انہوں نے کسی لغت سے اپنی پسند کے الفاظ چھانٹ لیے ہیں اور اسے اعلیٰ بنیادی اردو کا نام دے رہا ہے ۔

غیر ملکیوں کی ضروریات کو لیجیے انہیں ابتدا میں جن ، محکموں اور کاروباری معاملات سے سابقہ پڑ سکتا ہے اس میں بحری جہاز ، ہوائی جہاز ، ریل ، ٹیکسی کے علاوہ پولیس ، مشین ، پاسپورٹ آفس ، ٹیلی فون ، ٹار گھر ، ڈاک خانہ کے علاوہ نجی زندگی میں حکومت کے عہدے داروں ، اپنے ذاتی ملازمین اور کاروباری لوگوں کو نمایاں حیثیت حاصل ہوگی اور گھر کی عام استعمال کی چیزوں کے ناموں اور افعال و مصادر سے زیادہ سروکار ہوگا ۔ انگریزی زبان کے مستعمل الفاظ میں بنیادی اردو میں صرف یہ لفظ ملتے ہیں :

اسٹیشن - جیل - مائیکل - پولیس - پارسل - ٹلی - کمرہ -
ہزاری دالست میں انگریزی کے یہ الفاظ بھی کام آسکتے ہیں :
ہاتھی - بوٹ - بیگ - بیچ - بیڈل - ٹیلی فون - تھنر - جج - ڈیسک -
راڈ - ریڈیو - سرکس - سنیا - کموڈ - کیمرا - گیسس - لیڈ - مسٹر - باری -
پیش - پینر ۔

ایک غیر ملکی کے لیے مندرجہ ذیل الفاظ بھی مفید ہو سکتے ہیں :
پین - تسمہ - تولیہ - جراب - چاہک - چارپائی - موٹی ۔
اچھے مختلف پیشہ وزوں سے بھی سابقہ پڑے گا ۔ اس لیے یہ الفاظ بھی قابل غور ہیں :-

بڑھئی - ہشتی - بھنگی - جولاہہ - دھوی - لوہار - نانی - ملاح ۔
مندرجہ ذیل افعال کا اضافہ بھی مفید ہوگا :-
سنوار (سنوارنا) - لہک (لہکا) - ٹانک (ٹانکنا) اور خراٹا (خرائے لینا)

ضرورت ہے کہ بنیادی اردو پر نظر ثانی کی جائے اور اسے سائنٹفک بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ موجودہ حالت میں یہ کتاب نہ تو غیر ملکیوں کے لیے مفید ہو سکتی ہے اور وہ اس سے پاکستان کی معاشرتی زندگی کا صحیح نقشہ سامنے آتا ہے ۔

حوالہ جات قانون فوجداری

محبوب عالم شیخ کی کتاب ”حوالہ جات فونوڈر فوجداری“ اردو کے عدالتی ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔ مائت عدالتوں کے عملے کو قانون کی ایسی کتاب کی بہت ضرورت رہتی ہے جس کی مدد سے وہ روزمرہ کے امور بہ آسانی انجام دے سکے۔ اصل کتابوں کی اسیت اپنی جگہ مسلم لیکن اس طرح کی اسنادی کتب کی افادیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ عام فہم زبان اور سادہ اور راست طریق اظہار اور قانونی دفعات کی عملی صورتوں کو ذہن نشین کرانے کے لیے تشریحات ایک مفید اور از حد اہم خدمت ہے۔ شیخ صاحب نے اس کام کو کچھ اس اختصار سے ڈیڑھ دو سو صفحات میں سمیٹ دیا ہے کہ ان کی کتاب نہ تو قانون فوجداری کی وہ دقیق دستاویز ہے جس کے لیے توضیح و تشریح کی ضرورت ہو اور نہ اس حد تک مفصل ہے کہ اسے پڑھنا اور اس سے استفادہ کرنا خود ایک مستقل اور ہمہ وقتی کام متصور ہو۔ ان کی کتاب ایک ایسی تلخیص ہے جسے فوری حوالے کے طور پر برتا جا سکے گا۔

کتاب کو مختلف ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر حق سے متعلق ضروری معلومات یک جا بیان کی گئی ہیں۔ اردو میں یہ طریقہ تلخیص لیا نہیں، درسی کتب کی اس ڈھب کی فرہنگیں پہلے ایسی چھتی رہی ہیں بلکہ جب سے قانون کی کتب کی تدوین اردو میں شروع ہوئی ہے۔ قانون دانوں نے ایسی کتابوں کی ضرورت کو بیش از بیش محسوس کیا۔ ۱۸۰۲ء کے لگ بھگ قانون کو اردو میں ڈھاننے کی کوششیں شروع ہو گئی تھیں اور قانونی لغت کی تدوین کے علاوہ ضابطہ ہائے فوجداری کی تنظیم و ترتیب بھی ایسویں صدی کے وسط تک خاص ہو گئی۔ کئی اہم کتابیں تصنیف ہوئیں، ان میں انگریزوں اور ہندوؤں کے کارنامے اہم تھے۔ شمس العلماء مولانا نذیر احمد کے تعزیرات ہند کے ترجمے سے قانون زبان

کو وہ پیکر سہیا ہوا جس سے اردو زبان میں قانون کی مستقل علمی و ادبی روایت قائم ہوئی۔ یہ روایت پنجاب میں برطانوی تسلط کے بعد سے عدالتوں میں اردو کی اہمیت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ قانونی کتب کی تخلیقات میں بھی اضافہ ہوا اور کالٹ بکوں کا ذخیرہ وائر جمع ہو گیا۔ اس کے علاوہ عدالتی فیصلے اور سرکار بھی اردو میں چھپنے لگے۔ پنجاب کا پہلا عدالتی رسالہ ”کنج شاہگان“ کے نام سے جاری ہوا۔ اس میں عدالتی فیصلوں اور سرکارز کو اردو میں شائع کیا جاتا رہا۔ کتب کی تدوین و اشاعت کا کام بھی بکثرت ہوا۔ یہ کام زیادہ تر ہندو وکلاء اور منشیوں کے ہاتھ میں تھا۔ عدالت عالیہ پنجاب کے آغاز سے لے کر بیسویں صدی کے وسط تک قانونی کتب کا زیادہ ذخیرہ ہندو مصنفین ہی کی مدد سے سامنے آیا۔ ان مصنفین نے قانونی کالٹیں بھی کثیر تعداد میں شائع کیں۔ ان کتب کی قانونی حیثیت تو ضرور تھی لیکن ادبی لحاظ سے یہ کچھ زیادہ قابل لحاظ نہیں تھیں۔ لے دے کر منشی گلاب دین یا ایک آدم اور مسلمان وکیل صاحب تصنیف ہوا، جس نے قانونی زبان کو ادبی سطح پر لے جانے کی شعوری کوشش کی اور اس طرح قانونی سرمایہ ادب میں مسلمان طبقے کی طرف سے اہم خدمت انجام دی۔ ہندو وکلاء کی کتابیں اگرچہ محنت اور احتیاط کے اعلیٰ معیار پر نہیں لیکن زبان و بیان کے اعتبار سے ادبی سطح پر نہیں اُٹھتی تھیں، بلکہ بعض کتابیں تو ادبی لحاظ سے بھی خاصی ناقص اور ”ہر از اغلاط“ تھیں۔ اردو میں زمانہ قدیم سے کتابوں کی تدوین کے باوجود عدالتی زبان کو خاص علمی معیار تک پہنچنے میں خاصی مدد صرف ہو گئی اور اس کی صحیح تربیت مسلمان وکلاء ہی کے ہاتھ سے ممکن ہوئی۔ اس اہم خدمت میں پنجاب کا ہلا بھاری ہے۔

زبان کی پنجابی روایت کو ادبی سطح تک لے جانے میں تعزیرات پاکستان کی نشر و اشاعت کو بہت دخل ہے۔ اعلیٰ عدالتوں میں انگریزی کے چلن کی وجہ سے اردو کو دائرہ قانون وہ مقام سیر نہ آیا جو ایک قومی زبان کو حاصل ہونا چاہیے تھا، تاہم ماتحت عدالتوں میں زبان کی سادگی کسی حد تک برقرار رہی۔ پنجاب لاء سکول اور اوریئنٹل سکول میں بخاری کے امتحانات کا سلسلہ رائج ہوا۔ قانون کی تدریس کا اردو میں اہتمام تھا۔ جہاں کے فارغ التحصیل وکلاء اور مختار پنجاب کی ماتحت عدالتوں میں کام

کرتے تھے۔ یہ لوگ جو انگریزی کی زیادہ شدہ نہ رکھتے تھے لیکن اردو کے ذریعے قانونی قابلیت کا سکہ جاتے رہے۔ ابتدا میں اعلیٰ عدالتوں میں بھی اردو کا چلن تھا لیکن جب وکالت کے امتحانوں سے اردو کو دس نکالا مل گیا تو اردو کی حیثیت جو اسے عدالت عالیہ میں حاصل تھی قائم نہ رہ سکی اور سٹسٹ سٹا کر مانت عدالتوں تک محدود رہ گئی۔ لاء کالج کی کلاسوں میں انگریزی کو ذریعہ تعلیم رکھا گیا اور اردو کا دائرہ کار محدود و محصور ہوا۔ مانت عدالتوں اور پولیس تھانوں میں اردو کی قانونی زبان کی آب پاری ہوتی رہی۔ اس سطح پر قانون کا تعلق عوام کے ساتھ تھا اب اس رابطے کی بنا پر مقامی زبان کے تال میل سے اردو کی قانونی زبان ایک نیا روپ اختیار کر گئی۔ زیر نظر کتاب بھی اسی عدالتی زبان میں لکھی گئی ہے جس کے خمیر میں اردو کی عدالتی زبان کا بس منظر شامل ہے اور مقامی روایات کی حسین و شائستگی بھی جھلک رہی ہے۔ کتاب میں عدالتی زبان کے مقامی الفاظ کو مناسب اہمیت دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی فارسی اور عربی اصطلاحات کے باہمی تال میل سے بھی یہ زبان نئی اور مضبوط روایت کے احیاء کا باعث ہو گئی ہے۔ جملوں کی وضع تلخ و حروف ربط کے استعمال اور واحد جمع کے مقامی قاعدوں سے اردو زبان کے مروجہ محتاط رویوں کی جگہ زبان کا قطری چوبر چمک گیا ہے یہ کتاب اردو کے شاعرانہ پیراہہ، اظہار کی بجائے بول چال کے سانچوں کے زیادہ قریب ہے اور یہی سبب اس کی عبارتوں کی دلکشی اور اصوات کے آہنگ کا ہے۔ اس کتاب کے جمع اور واحد کے قواعد بھی نسخ کی ادبی روایت کی تردید کرتے ہیں اور انگریزی اور عربی فارسی الفاظ کے مابین اضافت اور حروف ربط کے استعمال کی کثرت بھی زبان کے لسانی ہیکر کو ایک نیا حسن اور نئی آب و تاب عطا کرتی ہے۔ قانون نویسی کی یہ روایت اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کا ایک سرا قانون کی براف مروجہ زبان کے ساتھ ہے اور دوسرا سرا کاروباری اور بول چال کی زبان سے مربوط ہے۔ کتاب کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ فاضل مصنف نے زبان کو خواہ مخواہ شاعرانہ بنانے کی کوشش نہیں کی۔ ہمارے ہاں عام رواج ہے کہ ہم سائنٹفک علوم کے لیے بھی شاعرانہ پیراہہ، اظہار کو اختیار کرتے ہیں جو زبان کے علاوہ ان علوم کے ساتھ بھی نا انصافی کا موجب ہوتا ہے۔ فاضل مصنف نے اس

ہمارے میں نہایت صحیح راستہ اختیار کیا ہے کیونکہ اردو میں علوم کی روایت کو مستحکم کرنے کے لیے زبان کا سائنٹفک طریق مفید ہو سکتا ہے، اس میں جذباتی انداز بیان کی گنجائش نہیں۔ دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں ہر جگہ ادبی زبان علمی زبان سے مختلف رہی ہے اور اردو کو بھی اگر علمی زبان بنتا ہے تو یہی مسلک لینا پڑے گا کیونکہ علمی موضوعات میں جذباتی لب و لہجہ نہ کار آمد ہے نہ سوزوں ہے۔ مقام شکر ہے کہ ہمارے ماہرین قانون نے ادبی اور علمی زبان کے اس فرق کو شروع ہی سے پیش نظر رکھا اور اپنے رویوں کو مولوی نذیر احمد کی تعزیرات ہند کی اساس پر استوار کیا۔ محبوب عالم شیخ صاحب نے بھی اسی علمی روایت سے اپنا چراغ جلا رہا ہے۔ یہ کوشش قانون کے لسانی سانچے کے لیے بڑی مبارک اور کارگر رہی۔ نئے اختیار کردہ لسانی سانچوں میں مقامی عناصر کے میل سے علمی لٹر کا ایک نرالا آہنگ نمودار ہوا ہے۔ میری رائے میں اس کتاب کا یہ پہلو بہت اہم ہے۔ شیخ صاحب کی اردو اہل زبان کی شکایتی اردو نہیں اور اسے ایسا ہونا بھی نہیں چاہیے تھا میرے خیال میں ان کی شاعرانہ زبان سے اجتناب ہی اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ جملوں کی ساخت میں انگریزی قانونی زبان کی طرح ایک خاص طرح کا ٹھہراؤ اور نوازن ہے اس نوازن کے علاوہ اس میں قطعیت اور جامعیت بھی ہے جس سے لٹر میں عالمانہ شان پیدا ہو گئی ہے۔ شیخ صاحب کا اردو ادب ہر بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے علمی مسائل کے بیان کے لیے ایک ایسا سانچا اختیار کیا جو اس اہم علمی خدمت کے لیے حد درجہ سوزوں تھا۔

کتاب کی قانونی خوبیوں کی داد تو قانون دان ہی دے سکتے ہیں لیکن مجھے اس کتاب کا یہ پہلو بہت پسند آیا ہے کہ کتاب ٹیکنیکل ہونے کے باوجود اس انداز میں لکھی گئی ہے کہ کہیں بھی بیان میں پیچیدگی یا زوہدگی نہیں آئی۔ مختصر اور جامع انداز میں ایک عام قاری کو قانون کے خشوار مسائل پانی کر کے بتائے گئے ہیں۔ یہ خوبی اپنے پیشے سے محبت اور خلوص کے علاوہ اس مہارت کی دلیل بھی ہے کہ انہوں نے کئی برس عدالتی ملازمت میں بسر کیے اور علمی تربیت حاصل کی وہ ماتحت عدالتوں کے عملے کی ضرورتوں اور مشکلات سے بخوبی آگاہ ہیں۔ ان کے ہاں اختصار کے ساتھ ساتھ ضروری مسائل کے اہم گوشوں کو سیدھے مادے انداز میں

زبان کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے ۔ اس لحاظ سے یہ کتاب ایک اہم درس ضرورت کو بھی پورا کرتی ہے ۔

علمی لحاظ سے بھی کتاب کا محبوب قابل قدر ہے ۔ فاضل مصنف نے جو زبان استعمال کی ہے اس کی جتنی داد دی جائے کم ہے ۔ اس قانونِ نثر میں اتنی جان ہے کہ ہماری عدالتوں کی جملہ ضرورتوں کو پورا کر سکے ۔ یہ کہنا بھی شاید لمے موقع نہ ہو کہ اس عمدہ نثر میں کہیں کہیں کھردرا پن بھی آ گیا ہے ، لیکن یہ خامی نثر کی نہیں ، یہ خامی اس کے کم تر استعمال کی ہے ۔ جیسے جیسے یہ زبان استعمال میں آتی جائے گی اس کے کھردرے کنارے خود بخود صاف ہوتے جائیں گے ۔ نثر کا مقبول پن اس بات کی سفارش ہے کہ عدالتی زبان میں اس کا تجربہ ضرور کیا جائے ۔ آخر کار یہی نثر ٹھل کر ، نکھر کر مقبول و محمود ہو جائے گی ۔

عدالت عالیہ کے حالیہ فیصلے کے بعد جس میں وکلا کو اردو میں بیرونی کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے ، اب اردو کی ضرورت اور اہمیت یقیناً بڑھ جائے گی ۔ ایسے میں شیخ صاحب کی زیرِ نظر کتاب اگر اہم کردار ادا کر سکے تو اردو زبان کی یہی خواہوں کے لیے یہ مسرت و شادمانی کا سبب ہوگا ۔

مشرق میں فہرست سازی کی روایت

(۱)

مشرق میں فہرست سازی کی روایت بہت قدیم سے چلی آ رہی ہے ، چنانچہ قلمی کتب کی فہرستوں میں حاجی خلیفہ اور ابن ندیم کے نام آج بھی احترام سے لیے جاتے ہیں اور ان کے کارنامے عصر حاضر میں بھی کتب حوالہ میں نمایاں درجہ رکھتے ہیں ۔ خود برصغیر پاک و ہند میں اس نوع کی فہرست سازی کی کمی نہیں ۔ خطی نسخوں کے بارے میں الگ الگ معلومات کی جمع آوری بھی بذات خود اہم رہی ہے ۔ چنانچہ حیدر آباد دکن کے ذخائر کی فہرستوں ، کتاب خانہ راسور کی قدیم فہارس ، اسلامیہ کالج پشاور کی فہرستوں کو اس ذیل میں شمار کیا جا سکتا ہے ؛ لیکن یورپ میں اس موضوع پر جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں معلومات کی درجہ بندی کے علاوہ ترسیلِ معلومات کو زیادہ سائنٹفک بنانے کی کوششیں بھی کی جاتی رہی ہیں ۔ کتاب داری نے فن کی صورت اختیار کی تو فہرست سازی کا فن بھی زیادہ سائنٹفک ہو گیا ، چنانچہ مطبوعات اور خطوطات کی جداگاندہ فہارس کا اہتمام ہوا ۔ فہرست سازی کا دائرہ عمل بھی کتابیاتی تدوین نو کا باعث بن گیا ۔ اب فہرست ، کتاب کے نام ، مصنف کی شناخت اور نسخے کے سالِ کتابت تک محدود نہ رہی ، رفتہ رفتہ معلومات کے دائرے میں بھی وسعت پیدا ہوئی ۔ قلمی نسخوں کے مصنفین کے حالات زندگی ، نسخوں کے آغاز و انجام کی عبارتوں کی نشان دہی ، مکتوبات کی تفصیل اور ان سے حاصل ہونے والی مستند معلومات نے بھی فہرست ساز کو اپنی طرف متوجہ کیا ۔ اس سے ایک قسم آگے یہ موضوع بھی اہم ہو گیا کہ زیرِ نظر نسخوں کے بارے میں ان اطلاعات کو بھی فراہم کیا جائے کہ دوسرے کتاب خانوں میں ان کتب کے کون کون سے دوسرے نسخے پائے جاتے ہیں ۔ اس کے علاوہ قلمی نسخوں کی شجرہ بندی اور نظام کتاب داری کے مطابق ان کی ترتیب اور نمبر شمار بھی اہم ہو گئے ۔ اس طرح کی فہرستوں

میں یورپ کے جن محققین نے نام پیدا کیا۔ ان میں براؤن، آربری، اینتھی، بلوم ہارٹ اور پلوسی کے نام آج بھی احترام سے اُٹھ جاتے ہیں۔ اسی طرح کتاب خانہ برلن کے فہرست نگار کو کلاسیکی مقام حاصل ہے۔ شخصی کتاب خانوں کی فہرستوں میں گارسیں دتاسی اور بعض دوسرے فضلاء کے کارنامے آج بھی اس فن کا سرمایہ خاص ہیں۔ برصغیر میں مشرقی کتاب خانوں کی فہارس میں ابوالو نے شہرت پائی اور اپنی علمی فضیلت کی دھاک بٹھا دی۔ اس فن نے بیسویں صدی کے اوائل میں ایک اور تہج بھی اختیار کی۔ کتابیاتی فہرست سازی میں کسی ایک کتاب خانے کی جگہ چند کتاب خانوں کی معلومات کو یک جا کرنے کا احساس پیدا ہوا۔ چنانچہ عربی ذخیرہ معلومات کے سلسلے میں بروکلین کی کئی جلدوں میں تصنیف بنیادی اہمیت رکھتی ہے^۱۔ اسی طرح فارسی کے خطی نسخوں کے بارے میں مٹوری کا نام اور کام محتاج تعارف نہیں^۲۔ اگرچہ اس کے انتقال کی وجہ سے یہ کام ادھورا رہ گیا، تاہم اس کی زندگی میں شائع ہونے والے آخری جز میں طب، طلسم، علم نجوم وغیرہ مکمل ہو گئے تھے۔ انتقال کے بعد شائع ہونے والے آخری اجزا پر مشتمل کتابچہ نامکمل اور مختصر ہے۔ فن الشا اور فارسی شاعری سے متعلق حصہ اب بھی کسی مردِ میدان کا 'مٹلاشی' ہے۔ لیکن چٹاکام ہو گیا ہے وہ تحقیق کے لیے صحت معلومات اور وسعت علم کی ایک عمدہ مثال ہے۔ ایران میں قلمی نسخوں کی ایک سے زیادہ فہرستیں موجود ہیں۔ لیکن آرسی ڈی کی طرف سے احمد منزوی کی نشر کردہ فہرست، ایک دوسرے زاویے سے اہم ہے کہ اس میں جملہ کتاب خانوں کی فہارس کی بنیاد پر مختصر معلومات کو یک جا کر کے پورے ذخیرے کو اپنے دامن میں سمیٹا گیا ہے^۳۔ ایرانی فضلاء میں سے

۱۔ اس پر گران قدر اضافے پروفیسر نواز سزگین نے کیے۔

۲۔ برگل نے اس کتاب کا روسی زبان میں ترجمہ کیا اور بہت سے نئے نسخوں کی نشان دہی بھی کی۔

۳۔ آقای منزوی نے پاکہ و ہند کے مخطوطات کی یک جا فہرستیں بھی کئی جلدوں میں ترتیب دی ہیں اور اسلام آباد سے اس کی چھ جلدیں اب تک شائع ہو چکی ہیں۔

آقای ایرج افشار خاص امتیاز رکھتے ہیں کہ انھوں نے فہرست سازی کو اپنا اوزھنا چھوٹا بنایا اور فہارس کی کتابیاتی فہرستیں بھی شائع کی ہیں۔ کتاب شناسی اور 'فہرست ہائی نسخہ ہائی خطی فارسی' کام کی چیز ہے۔ اس میں ۲۴۳ فہارس کی فہرست ہے اور اس صنف خاص نے ہمارے دائرہ معلومات کو مزید وسعت دی ہے۔

(۲)

برصغیر پاک و ہند میں اگرچہ اس نوع کا کام زیادہ نہیں ہوا اور دائرہ کار کتاب خانوں کی الگ الگ فہرستوں تک ہی محدود رہا ہے تاہم عربی، فارسی اور اردو کے سلسلے میں بعض صاحب اختصاص اور نام آور شخصیتیں ہو گزری ہیں۔ مرحومین میں مولانا عبدالعقید اور عبدالقادر سرفراز کے نام آج بھی سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ دور حاضر کے محققین میں ڈاکٹر حید عبداللہ اور مولانا امتیاز علی عرشی کے نام مشرق و مغرب میں احترام سے لیے جاتے ہیں۔ ان کی تیار کردہ فہارس کتب حوالہ میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ قریب العهد فہرست سازوں میں افسر امر وہوی، عبدالنبی کوکب ڈاکٹر محمد بشیر حسین عارف لوشاہی اور مشفق خواجہ کے کارنامے کسی معارف کے محتاج نہیں۔ مشفق خواجہ نے اپنے آپ کو اردو مخطوطات تک محدود رکھا ہے، چنانچہ جائزہ مخطوطات کا اردو کا منصوبہ جو دس جلدوں (اب چھ جلدوں) پر مشتمل ہے، اس کی پہلی جلد شائع ہو چکی ہے۔ جس میں مصنفین کے حالات کے حصے کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ اس کے لیے جملہ کتاب خانوں کے قلمی نسخوں کا تفصیلی جائزہ لے کر اس کا بطور خاص بھی اہتمام کیا کہ کتاب کے مطبوعہ، منحصر ہنرد اور نادر ہونے کے بارے میں بھی الگ عنوان کے تحت مستند معلومات دے دی جائیں۔ کتابیات کا فن اس دور میں جن حدود کو چھو رہا ہے اس کے بارے میں مستقبل کا محقق ہی صحیح رائے قائم کر سکے گا، لیکن ان مختصر معلومات کی بنا پر جو دائرہ خاص میں آج ہمیں حاصل ہیں یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس صنف خاص میں پاکستانی محققین بھی دھڑلے والے کسی طور پر بچھے نہیں رہے۔

(۳)

لاہور کے قلمی خزانے کے بارے میں معلومات مہیا کرنے کی پہلی باقاعدہ کوشش ڈاکٹر سید عبدالقہ صاحب نے کی تھی۔ چنانچہ اوریونٹل کالج میگزین میں خزانہ خطوطات کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین لسط وار جاری کیا، گیا جس میں پنجاب یونیورسٹی کے قلمی خطوطات کی مجمل فہرست پیش ہوئی، پھر مفصل فہرست پر کام شروع کیا گیا۔ فارسی کے قلمی خطوطات سے آغاز کار کرتے ہوئے اول تاریخ اور پھر فارسی شاعری کے بارے میں دو جلدیں شائع کیں۔ اس کے بعد اس کام کی تکمیل کا بیڑا مرحوم عبدالنسی کوکب نے اٹھایا۔ یہ منصوبہ دو الگ الگ حصوں پر مشتمل تھا؛ طے پایا کہ اول جملہ قلمی نسخوں کی مجمل فہرست شائع ہو، ہری سے آغاز کیا گیا۔ عربی کی مجمل فہرست پریس میں نہیں کہ کوکب صاحب ایک حادثے میں انتقال کر گئے۔ دوسرا منصوبہ عربی فارسی اور اردو کی منتخب کتابوں کے مفصل نو تذکرے پر مشتمل تھا۔ عربی کے اہم ترین خطوطات کی پہلی جلد مرحوم کی زندگی میں شائع ہوئی (فہرست مفصل جلد اول) اس سے الگ ذخیرہ شیرانی کی مجمل فہرست ڈاکٹر محمد بشیر حسین نے شروع کی اور اس کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ چوتھی جلد ابھی تک منصف شہود پر نہیں آ سکی۔ ڈاکٹر محمد بشیر حسین نے اس کے علاوہ مفصل فہرست سازی کا کام بھی جاری رکھا تھا؛ چنانچہ مرحوم پروفیسر محمد شفیع کے ذاتی ذخیرے کا جائزہ لیا گیا اور مرحوم کے فرزند کی تحویل میں جملہ قلمی کتابوں کی فہرست تیار کی۔ اسے پنجاب یونیورسٹی نے شائع کیا۔ یونیورسٹی کے علاوہ لاہور میں دوسرا اہم ذخیرہ پنجاب پبلک لائبریری میں تھا جس کی مفصل فہرست سازی پروفیسر منظور احسن عباسی نے کی۔ اگرچہ کتب حوالہ کی عدم دستیابی کی بنا پر اس کام کا وہ معیار تو قائم نہ رہ سکا جس کی توقع تھی، تاہم اپنی حدود میں یہ کام بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

لاہور کے ذاتی کتاب خانوں میں جو نوادر محفوظ ہیں وہ ابھی تک محتاج تعارف ہیں۔ اس نوع کے کاموں میں تھران یونیورسٹی کی بعض طالبات نے کچھ کام کیا۔ چنانچہ کتب تصوف کے بارے میں ڈاکٹر ممتاز اور بھی کتاب خانوں کے نادر خطوطات کے لیے ڈاکٹر خالدہ اصغر کے مقالے

بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں لیکن اسوس یہ دونوں مقالے ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکے۔

(۴)

دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری تقسیم برصغیر سے قبل مطبوعات اور جرائد کے لیے اہم شمار کی جاتی تھی، خصوصاً انگریزی مطبوعات کے واقعہ ذخائر کی وجہ سے اسے ایشیا کی چند اہم لائبریریوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ حصول پاکستان کے چند برس بعد تک یہ لائبریری کئی حادثوں کا شکار ہوئی اور اس کے کئی اہم سیکشن دست برد زمانہ کے شکار ہو گئے۔ ۱۹۶۳ء کے آخر میں متروکہ وقف اسلاک بورڈ میں راقم کو کم و بیش ایک برس گزارنے کا موقع ملا تو اس لائبریری کی دیکھ بھال بھی شروع کی گئی۔ چنانچہ مطبوعات کے علاوہ دو چار جگہ کچھے قلمی نسخے بھی ملے جس میں تاریخ پنجاب سے متعلق ایک منحصر ہنر قلمی نسخہ بھی تھا۔ لائبریری کی تنظیم نو کی گئی اور میری نگرانی میں یہ کام باہر تکمیل تک پہنچا۔ پنجاب یونیورسٹی میں میرے واپس جانے کے بعد لائبریری کے قلمی مخطوطات کی طرف توجہ کی منزل آئی۔ ریٹائرڈ ڈاکٹر لیفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید کی مساعی سے اس لائبریری میں مخطوطات کی جمع آوری کو اولین اہمیت دی گئی اور چند برس کے اندر ایک بڑا ذخیرہ فراہم ہو گیا۔ کرنل صاحب کی ذاتی دلچسپی کے نتیجے میں اس لائبریری میں بعض ذاتی کتب خانے بھی شامل ہوئے اور اس کا شدت سے مطالبہ ہونے لگا کہ مخطوطات کی فہرست بھی شائع کی جائے تاکہ استفادہ ممکن ہو۔

(۵)

دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری کے خزانہ مخطوطات کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں ۲۵۰ قلمی نسخوں کا تذکرہ ہے۔ ان فہارس کی ترتیب و تدوین کے لیے برٹش میوزیم کی فہارس کو بطور نمونہ پیش نظر رکھا گیا ہے۔ یہ کام مولانا محمد متین ہاشمی کی ذاتی محنت کا وہیں منت ہے۔ مولانا علوم دینی میں اختصاص رکھتے ہیں۔ زیر نظر جلد (جلد سوم) میں بھی ان کی دینی معلومات کتاب کا اہم ترین حصہ ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ادبیات کے ذیل میں ان فراہم کردہ معلومات کسی لحاظ سے بھی انکشت کمانی کی زد میں آتی ہیں۔ انہوں نے فہرست کی تیاری میں

صرف ثانوی مآخذ پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ ہر کتاب کے بارے میں قدیم مآخذ سے بھی استفادہ کیا ہے اور قلمی نسخوں کے اندر موجود مواد کو لئے سرے سے جہان پھٹک کر محققین قدیم کے بعض مقالوں کو بھی دور کیا۔ اگرچہ لائبریری میں کتب حوالہ کی شدید کمی کی بنا پر بعض دریافت شدہ معلومات تک ان کی رسائی نہیں ہو سکی، مثلاً انہوں نے مٹوری سے کئی مقامات پر مدد لی ہے، لیکن ان کے کارنامے کے آخری دو حصے ان کے سامنے نہ تھے۔ اس لیے علم نجوم اور طب وغیرہ کے ذیل میں مٹوری سے کوئی استفادہ نہیں ہو سکا۔ اسی طرح بوہار لائبریری، بالذیل لائبریری، کتب خانہ برلین، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگال ایشیائٹک سوسائٹی ڈھاکہ، کتب خانہ راجپور کی مطبوعہ فہرستیں بھی ان کے پیش نظر نہ تھیں۔ میرے خیال سے حوالہ جاتی کتب کے سلسلے میں دیہال سنگھ ٹرسٹ لائبریری میں خصوصی توجہ کی ضرورت ہے لیکن ان کو کتابوں کی تلافی مولانا نے اس طور کر دی ہے کہ خود قلمی نسخوں کے داخلی مواد کو بوری محنت سے استعمال کر لیا ہے اور بڑی کاسیائی سے نئی معلومات اضافہ کی ہیں۔

(۶)

فہرست مخطوطات کی اولین جلدوں میں بعض طباعت اور تدوین کی معمولی غلطیاں بھی تھیں جن کی نشان دہی بعض فضلا نے کی۔ البتہ اس جلد میں پہلی جلدوں کے مقابلے میں بہتر اور زیادہ مکمل معلومات ہاتھ آئیں گی۔ مولانا محمد حسین ہاشمی اور حافظ غلام حسین کی شہانہ روز محنت سے یہ جلد سابقہ جلدوں سے بازی لے گئی ہے اور بلا خوف تردد اس کے التدریجات پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ اس جلد میں ابن طرح کی کتابیں درج ہیں :

اول : ایک بڑا حصہ ان کتابوں پر مشتمل ہے جو برصغیر پاک و ہند میں درسہات میں شامل تھیں۔ ان میں اکثر نسخے زیادہ قدیم یا اہم نہیں لیکن برصغیر کے نصابی سرمائے کے احصاء کے لئے ان کا مطالعہ ناگزیر بھی ہے۔

دوم : وہ مخطوطات ہیں جن کا تعلق برصغیر پاک و ہند میں خاص طور پر پنجاب، سندھ اور سرحد کے ساتھ ہے۔

سوم : وہ مخطوطات ہیں جو مصنف کے خود نوشت یا معاصر یا قریبی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

دوسری اور تیسری شق کی روشنی میں ذیل میں بعض اہم مخطوطات کی نشان دہی کی جاتی ہے :

- ۱ - تفسیر حسینی جلد اول ، مخطوطہ نمبر ۶۳۵ ، (تالیف ۱۰۹۱ھ ، نسخہ مکتوبہ ۱۰۹۳ھ)۔
- ۲ - کتاب المعراج ، مخطوطہ ۴۴۴ ، مصنف غالباً معروف پنجابی شاعر فضل شاہ۔
- ۳ - کلید الکنج (کذا) مخطوطہ ۷۲۳ شمس العاشق ، برہان الدین حسینی۔
- ۴ - ہدایتہ الاعلیٰ - مخطوطہ ۶۳۹ حسین کشمیری ، ۱۰۵۷ھ ، مکتوبہ ۱۰۸۶ھ)۔
- ۵ - انوار غباتی ، مخطوطہ ۴۴۷۔
- ۶ - اخلاق سروری ، مخطوطہ ۴۸۹ (اردو) کتابت ۱۲۸۳ھ۔
- ۷ - تضمین نظیر اکبر آبادی بر کرمای سعدی ، مخطوطہ ۷۱۸ (نادر نسخت)۔
- ۸ - توضیح حواشی الحسامی ، مخطوطہ ۳۹۹ ، بہاء الدین سوبانی کتابت ۱۰۷۲ھ۔
- ۹ - شرح نامہ حق ، مخطوطہ ۶۳۷ ، اختیار بن غیاث الدین م ۹۲۸ نسخہ مکتوبہ ۱۰۸۵ھ۔
- ۱۰ - مجموع سلطانی ، مخطوطہ ۶۵ ، دور غزنی کی کتابت۔
- ۱۱ - کفایہ الاعتقاد ، مخطوطہ ۶۳ (ب) ، حکیم محمد حسین کشمیری ۱۰۵۷ھ۔
- ۱۲ - چار چمن (چار گزار ؟) مخطوطہ ۶۶۹ ، ۱۰۷۱ھ۔
- ۱۳ - گزار سنت ، مخطوطہ ۶۶۷ ، از عبدالسلام۔
- ۱۴ - عرض حال ، مخطوطہ ۷۴۳۔
- ۱۵ - قصہ حسن و عشق ، مخطوطہ ۵۹۴ ، نعمت خان عالی ، مکتوبہ ۱۰۳۶ھ۔
- ۱۶ - تاریخ مشتمل بر احوال ہند و ملک آن ، مخطوطہ ۳ ، سید احمد شاہ بٹالوی ، مکتوبہ ۱۲۸۳ھ۔
- ۱۷ - دستور الفصد ، مخطوطہ ۱۱۷ (پنجابی) ، حکیم دیندار (نادر)۔
- ۱۸ - طب احسانی ، مخطوطہ ۶۶۶ (اردو) ، احسان علی فتح پوری ، مکتوبہ ۱۳۱۹ھ۔
- ۱۹ - فرس نامہ ، مخطوطہ ۷۷۵ (فارسی) نادر۔
- ۲۰ - خوان نعمت ، مخطوطہ ۲۱ (فارسی) ، منحصر بفرہ نسخہ۔

کتابیات تحقیق و تنقید پر ایک نظر

اردو میں کتابیات کی تالیف کا رجحان کچھ زیادہ قدیم نہیں خصوصاً موضوعات پر فہرست سازی تو اور بھی کمابہ ہے۔ سلیم اختر صاحب نے اردو تنقید اور تحقیق سے متعلق کتب کی فہرست بنانے کا ٹول ڈالا ہے۔ اگرچہ اردو کی سال بسال کتابیات کی روایت کا آغاز بھارت سے ہو چکا ہے لیکن یہ فہرست اپنی اسی خصوصیت کی وجہ سے اہم ہے کہ اس میں اردو تنقید اور تحقیق پر شائع ہونے والی صرف ان کتابوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے جو ۱۹۳۷ء اور ۱۹۷۲ء کے درمیان پاکستان میں شائع ہوئیں۔ خصوصی موضوعات پر شائع ہونے والی کتابیات میں ہر چند کہ غالب کے سلسلے میں طبع ہونے والی کتابیات کو اولیت حاصل ہے لیکن یہ فہرست اس لحاظ سے زیادہ وسیع ہے کہ اس کے موضوعات کا دائرہ ادب کے ان ”زقبوں“ سے تعلق رکھتا ہے، جو اردو ادب کے لیے ے مزاج اساس ہیں۔

اردو تنقید میں ظہور پاکستان کے بعد سے فکر و نظر کے جو مختلف دہستان وجود میں آئے ان کی نشان دہی اس کتابیات سے بخوبی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ہماری تنقید جس بحران، عدم توازن اور غلطشار کا شکار رہی اس کی تصویر بھی اس آئینے میں ملتی ہے۔ اس طرح ایک قاری اس کتابیات کی مدد سے اپنے مطلب کا مال ہی تلاش نہیں کر سکتا، بلکہ اسے اردو تنقید کے پورے مدوجزر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتابیات اردو میں تنقید کے ماضی، حال اور آئندہ کے امکانات کا اشاریہ بھی ہے اور تاریخ ادب کا طالب علم اس کی مدد سے اردو تنقید کی روایت کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے واقف ہو سکتا ہے۔

اردو تحقیق کے بارے میں پاکستان میں کیا کچھ ہوا؟ اور اس کام کی رفتار اور مقدار کیا رہی؟ اس کی تفصیل بھی کتابیات میں پائی جاتی ہے۔

تحقیق ایک صبر آزما، خشک اور بظاہر غیر تخلیقی عمل سمجھا جاتا ہے، سبب شاید یہ ہے کہ ہمارے ہاں ایک مدت سے تحقیق اور تنقید کے دھارے ایک دوسرے سے الگ الگ بہتے رہے ہیں۔ تخلیقی فن کار تخلیق کی مشقت اور محنت سے خائف ہے اور اسے ایک خاص طرح کی معاندانہ سرگرمی سے وابستہ کرتا ہے۔ اس عصبیت سے قطع نظر محقق کا یہ دعویٰ ہرگز نہیں کہ وہ تخلیقی فن کار کی طرح خام مواد سے تشکیل حسن کرتا ہے۔ وہ تو ادب کے طالب علم کو ”کچا مال“ دیتا ہے، اب یہ ادیب اور نقاد کا کام ہے کہ اس سرامٹے کو انتہائی بصیرت کا حصہ بنائے اور محقق کے حق میں دھائے خیر کرے، اگر محقق کی یہ بات خامی ہے کہ وہ جز کی مدد سے کل نہیں بنانا تو یہ اردو نقاد کی خامی بھی ہے کہ وہ ”ہا در ہوا“ اور ”بے سروپا“ مواد کے سہارے تنقید کے قلعے تعمیر کرتا رہا۔ تحقیق سے کنارہ کشی کے سبب اردو تنقید ایک مدت سے اخلا میں سفر کر رہی ہے اس کی جڑیں اردو ادب میں پیوست نہیں۔ ضرورت ہے کہ تحقیق اور تنقید کے درمیانی فاصلے کم کیے جائیں اور محقق اور نقاد دونوں اپنے اپنے کارناموں کو ایک دوسرے کی محنت اور بصیرت کی مدد سے استوار کریں۔ یہ کتابیات اسی اشتراک عمل کا اظہار ہے۔ اس کے صفحات میں تنقید و تحقیق کی ہک جاتی کو مستحسن اندام تصور کرنا چاہیے۔

اردو تنقید و تحقیق کی یہ کتابیات (مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر) اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں لائبریری سائنس کے اصولوں کو پہلی بار کتاب کے قارئین میں پوری دیانتداری کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے۔ سلیم اختر صاحب ادیب ہی نہیں لائبریری سائنس پر بھی عبور رکھتے ہیں ان کی کتابیات نیشنل بک سنٹر کی پرانی کتابی فہرستوں کے مقابلے میں زیادہ سائنٹیفک ہے۔ اب ایک عام قاری اور پختہ کار ادیب دونوں اس سے بخوبی کام لے سکتے ہیں۔

عام طور پر کتابیات کی لاکسی یہ ہوتی ہے کہ فہرست ساز اسے ایسی حد تک مکمل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ کسی ایک لائبریری کو بنیاد بنا کر کام پورا کیا جاتا ہے۔ جو کتابیں اس لائبریری میں نہ ہوں فہرست سے رہ جاتی ہیں۔ اس طرح کی ”ڈانگ ٹیلاؤ“ اور نامکمل فہرست اپنی افادیت کھو دیتی ہے۔ سلیم اختر کو اس کا پورا احساس ہے

کہ انہوں نے اپنی فہرست کو زیادہ سے زیادہ مکمل اور جامع بنانے کی کوشش کی ہے۔ تکمیل میں حرف آخر کا دعویٰ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا اور یہ دعویٰ سلیم اختر کو بھی نہیں، لیکن جہاں تک میں اس کتابیات کو پرکھ سکا ہوں، پاکستان میں شائع ہونے والی کوئی اہم کتاب سلیم اختر کی زد سے بچ نہیں سکی۔ کتابیات سازی کے صبر آزما عمل میں یہی مرحلہ سب سے زیادہ مشکل ہوتا ہے اور جہیں صبر اور مضطرب کتابیات ساز اپنے پورے کام کی وقعت اور قدر برباد کر لیتا ہے۔ سلیم اختر نے اردو کتابیات سازی کی روایت کو سائنٹیفک بھی بنا دیا اور اسکا حد تک اس کی تکمیل کا اہتمام بھی کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ ادب کے دوسرے پہلوؤں سے متعلق کتابیات بھی اس فہرست کے بعد شائع کی جائیں۔ محققوں اور نقادوں کے بعد ادب اور علم کی دیگر اصناف بھی نیشنل بک سنٹر سے تقاضا کرنی ہیں کہ کتابیات کی جملہ فہارس کو ایک ہی سائنٹیفک سانچے میں ڈھال دیا جائے۔ پرانی فہرستیں لاطینی کی محتاج ہیں۔ سائنٹیفک طریق کار ہے اگر ان قدیم فہرستوں کی بھی لاطینی ہو جائے اور انہیں مکمل اور جامع بنا دیا جائے تو یہ علم و ادب کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

کتاب نامہ شبلی

(۱)

کتاب نامہ شبلی ، جناب اختر راہی نے ترتیب دیا ہے اور اسے مسلم اکیڈمی ، ہمد تکر ، علامہ اقبال روڈ لاہور نے یہ تعاون یزم ادب شبلی کالج لاہور سے شائع کیا ہے ۔ تاریخ اشاعت فروری ۱۹۸۱ء ہے ۔ ۶۸ صفحات کا یہ کتابچہ علامہ شبلی کے بارے میں کتابیات پر مشتمل ہے ۔ اس موضوع پر اس سے قبل ۱۹۹۰ء میں کچھ کام ہوا تھا ۔ اختر راہی صاحب نے ان لینوں فہرست سے بھی کام لیا ہے اور اپنی طرف سے بہت سے اضافے بھی کیے ہیں جس سے اس موضوع پر اب تک شائع ہونے والی فہارس سے یہ مجموعہ سب سے زیادہ مکمل ہے اور معلومات کے لحاظ سے مفصل ہے ۔

آغاز کتاب میں ایک پیش لفظ از حافظ لغز احمد ، ایک ابتدائی بقلم مرثبہ شامل ہے جن میں سابقہ فہارس کے بارے میں بحث ہے ۔ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے ، حصہ اول تصانیف شبلی ، مرثبات ، ملحظات ، تراجم (بشمول انگریزی تراجم) کے انتراجات پیش کرنا ہے ، دوسرے حصے میں علامہ شبلی پر کتابیں اور مقالات ہیں ۔ فاضل مرثبہ کی نظر سے جو کتابیں اور مقالے گزرے ہیں ان کے کوائف ہئید سنیں و ملحظات دے ہیں ۔ جن کا مآخذ پوئے کی شائع شدہ فہارس میں نہیں ان کا حوالہ جس طور سے بدون تفصیل ان مصادر میں درج تھا آئے من و عن لے لیا گیا ہے ۔

سروریت ہے کہ اسی طرز پر حالی ، سرسید اور دوسرے اکابر کی کتابیات بھی ، شائع کی جائیں یہ کام راہی صاحب کے کرنے کا ہے ، امید ہے کہ زیر نظر کتاب نامہ شبلی دوسری کتابیات کا پیش خیمہ ثابت ہوگی ۔ اب تک یا تو علامہ اقبال اور غالب خوش قسمت رہے ہیں جن پر ایک سے زائد کتابیات دستیاب ہیں یا پھر وہ چند مصنفین بھی جن کی کتابیات رسائل میں کبھی کبھی دیکھنے میں آتی ہیں ، مثلاً قانی ، جگر مراد آبادی ، اصغر گوندوی وغیرہ ۔ محققین کے لیے ان کتابیات کی اہمیت مسلم ہے اس لیے

جب کوئی اس طرح کی فہرست شائع ہوتی ہے تو محققین بجا طور پر خوش آمدید کہتے ہیں۔

’کتاب نامہ‘ شبلی ایک بڑی حد تک جامع فہرست ہے لیکن کہیں کہیں طریق کار کے اعتبار سے اور مواد کے لحاظ سے بھی ترمیم و اضافے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، مثلاً بعض مقامات پر کراس ریفرائس کا اندراج مفید ہوتا۔ صفحہ ۱۱ پر شعرالعجم کی چار جلدوں کے بعد ہاتھوں کے لیے صفحہ ۱۷ کا حوالہ ضروری تھا۔ صفحہ ۱۸ پر شعرالعجم حصہ پنجم کا اندراج دوبارہ ہو گیا ہے اور اس سے پہلے صفحہ ۱۷ پر درج ہے، یہاں سے حذف ہونا چاہیے۔ صفحہ ۱۹ پر مشتاق حسین کی باقیات شبلی کے بارے میں یہ وضاحت بھی ضروری تھی کہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھارت سے شائع ہو چکا ہے۔ صفحہ ۲۰ پر مشخصات کے تحت شعرالعجم کی ہاتھوں جلدوں کے وہ خلاصے بھی شامل کر لئے تھے جو شیخ مبارک علی نے لاہور سے چھاپے تھے۔ صفحہ ۲۱ پر فارسی تراجم کے تحت ترجمہ رسالہ ہدرا الاسلام درج ہے، یہی نام صفحہ ۲۰ پر ہدرا الاسلام کے طور پر درج ہے۔ ایک ہی کتاب کا نام بھی ایک ہی ہوگا، غالباً طباعت کی غلطی ہے۔ نیز فارسی ترجمے کے مصنف عبدالحمید نہیں، مولانا حمید الدین فراہی ہیں۔ (دک : برائے تفصیل مجلہ فکر و نظر اسلام آباد)۔ صفحہ ۲۷ پر محمد امین زبیری کی کتاب ذکر شبلی کے بارے میں یہ وضاحت ضروری تھی کہ یہ کتاب مصنف کی مفصل کتاب کا خلاصہ ہے جو ۱۹۳۷ء میں دانش محل لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ اسی طرح ’شبلی کی زندگی ایک دلکین ورق‘ بھی دوسری بار برق ایڈ کمپنی لاہور سے شائع ہوئی۔ صفحہ ۲۸ پر تنقید شعرالعجم کے بارے میں بھی یہ لکھنا ضروری تھا کہ یہ سلسلہ مضامین کے طور پر اول رسالہ اردو میں شائع ہوئے۔ صفحہ ۳۰ پر ابن فرید کے مقالات کے بارے میں یہ بتانا بھی اہم ہے کہ یہ مقالے ابن فرید کی کتاب ’میں، ہم اور ادب‘ میں شامل ہیں۔ صفحہ ۵۶ اور ۵۷ پر دو نام غلط درج ہوئے ہیں، نام محمد معین الدین دردانی ہے نہ کہ محمد حسین الدین دردانی، اسی طرح صحیح نام محمد شریف ہلال ہے نہ کہ محمد شریف ہلال۔ صفحہ ۶۲ میرے دو مقالوں کا ذکر ہے ان میں تیسرا مقالہ بھی شامل ہو سکتا ہے جس کا عنوان ’تنقید شعرالعجم پر ایک نظر‘ تھا اور رسالہ ’کتاب‘ لاہور کے جون ۱۹۳۵ء،

کے شارے میں شائع ہوا تھا۔ اس میں شبلی کی شعرا المعجم کی کچھ مزید غلطیوں کی نشان دہی بھی کی گئی تھی۔

ان کے علاوہ بعض اور حوالے بھی اضافہ ہوسکتے ہیں، مثلاً حسن مفتی بن بھی تنہا کا مقالہ علامہ شبلی کی فارسی شاعری در روداد دائرۂ معارف اسلامیہ جلد اول، تاریخ ادب اردو مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد، یہی تنہا کی مرآۃ الشعراء نیز تاجور ٹھیکر آبادی مرحوم کے ’تقدیدی مضامین‘ میں بھی شبلی کا تفصیلی جائزہ درج ہے۔ انگریزی کتب میں ڈاکٹر محمد صادق کی The Twentieth Century Urdu Literature جو بمبئی سے ۱۹۸۹ء یا ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ اسی طرح سوہن سنگھ دیوانہ کی کتاب Modern Urdu Poetry میں بھی شبلی پر تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ انگریزی حصے میں ایک غلطی یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر محمد صادق کا نام ڈاکٹر صادق حسین درج ہو گیا ہے۔ ان سب باتوں سے قطع نظر کتاب نامہ شبلی اپنے موضوع پر ایک اہم کتاب ہے۔

فن تاریخ گوئی

(۱)

فن تاریخ گوئی پر کئی منظر اور حسن کی کتاب ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے اس میں انہوں نے ایک ایسے علم کو محفوظ کرنے کی سعی کی ہے ، جس کے قدردان اب خال خال ملتے ہیں ۔ حساب الجمل حروف کے یا معنی مرکبات کی عددی قیمتوں کو محفوظ کرنے کا طریق کار ہے ۔ اس کا سرا ازمہ قدیم کے مذہبی و نیم مذہبی اعتقادات میں پیوست ہے ۔ بعض اعداد یا برکت یا مقدس اور بعض منحوس اور غیر یا کیزہ تصور کیے جاتے رہے ۔ مختلف اقوام و مثل میں اعداد کی جہت یا منفرد حیثیتوں کو غیر و برکت یا نحوست و اذیاء سے شخص کیا جاتا تھا ۔ نو (۹) اور سات (۷) کے اعداد نے بعض ادیان و اقوام میں بڑی اہمیت حاصل کی ۔ قسمت کا حال افعال انسانی کے نتائج کے بارے میں بیش گوئی ، مستقبل کی بشارت ، یہ سب اعداد کے طلسمی اثرات کا بالواسطہ یا بلا واسطہ اقرار تھا ۔ اسی احساس کے بطن سے علم جفر اور علم نجوم نے جنم لیا ، گویا اعداد کا عمل دخل انسانی زندگی کے مظاہر میں قرن یا قرن سے جاگزیں ہے ۔

حفظ حیات کا جذبہ جہاں مذہبی اور نیم مذہبی واردات کے حصول کا سرچشمہ رہا ہے ، وہاں دنیا داری کی سطح پر زندگی کے نقوش محفوظ و معشور رکھنے میں انسانی مساعی کے لیے فن تاریخ گوئی نگاری ، فن تاریخ گوئی اور ایسے ہی دوسرے علوم نے اہم خدمت انجام دی ہے ۔ فن تاریخ گوئی جانا کا ایک مؤثر ذریعہ ہے ، جس کی مدد سے گزشتہ والہات کی یاد محفوظ رکھی جاتی ہے ۔ اعداد اپنی طلسمی قضا سے نکل کر انسانی زندگی کے مادی پہلوؤں کے تحفظ کا وسیلہ بن جاتے ہیں ۔ مسلمانوں کے ہاں ملت کے دوام کا مؤثر وسیلہ تاریخ کا فن رہا ہے ۔ اس لحاظ سے علم تاریخ نے ہمیشہ ملی اشخاص اور ملی عزائم کی آب باری کا فریضہ ادا کیا ہے ۔ ماضی حال سے اور حال مستقبل کے ساتھ پیوست ہے ، اسی لیے کہا جا سکتا ہے کہ ہیئت

اجتماعیہ انسانہ کی ترقی کا راز ماضی کے ادراک و شعور کے بغیر ممکن نہیں اس لیے فن تاریخ کے مختلف شعبے مسلمانانِ عالم کے خصوصی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ حساب الجمل بھی تاریخ کا ایک اہم پہلو تھا جسے مسلمان مؤرخین اور شعراء نے جامع فن کی حیثیت سے اختیار کیا۔ اس سے عبارات کے سنیں تعمیر کی دریافت، اہم واقعات کے سادہ ہائے تاریخ، المراد کی پیدائش و وفات کے مواعظ اور کتب و رسائل کے سال ہائے تصانیف کا حتمی بیان ممکن ہوا۔ عربوں نے اس فن لطیف کی زیادہ قدر افزائی نہیں کی لیکن ایران اور دوسرے مسلم ممالک میں اس نے ترقی کی بہت سی منازل طے کی ہیں۔

(۲)

حروفِ ابجد کی عددی قیمتوں کے دو بڑے نظام رائج رہے۔ ایران و ہند اور گرد و پیش کے علاقوں میں حروفِ ابجد کی قیمتوں کا سلسلہ ایک سے دس، دس سے سو اور سو سے ہزار تک مقبول ہے۔ لیکن بلادِ المغرب (المغرب) میں ص = ۴۰، ض = ۹۰، س = ۳۰۰، ظ = ۸۰۰، غ = ۹۰۰، ش = ۱۰۰۰، ب = ۲، ف = ۳۰۰، ج = ۴، د = ۳، ر = ۲۰۰، ز = ۷، ک = ۲۰ کے حساب سے حروف کی قیمتیں معین ہوئیں۔ ان دونوں نظاموں میں اول الذکر طریقہ کار زیادہ مقبول تھا۔ مسلمانوں کا بیشتر سرمایہ اسی انداز تاریخ گوئی کا مریہون منت ہے۔

(۳)

ایران میں ادب فارسی کے آغاز سے اس نوع کی تاریخ گوئی کے نمونے ملتے لگتے ہیں۔ چھٹی صدی ہجری کے بعد سے تاریخ گوئی کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا، تا آنکہ اہلِ خانی دور اور تیموری ادوار میں اس کی اہمیت فنِ تعمیر کے توسط سے شعراء کی نظر میں بڑھ گئی۔

شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ فرماتے ہیں :

”حضرت نظامی علیہ الرحمہ“ کے زمانے سے بیشتر شعراء کے کلام میں تاریخوں کا ہتہ کہیں نہیں چلتا۔ زیادہ فروغ اس کو حضرت جاسی کے زمانہ میں ہوا ہے۔ ان کے بعد بہت سے شعراء نے انہی

کلام میں قواعد منضبط کیے ۔ جس کے بعد پھر ان میں کوئی
توسیع و تغیر و تبدل نہیں ہوا۔^{۱۷}

فن تعمیر کے ذوق فراوان نے تاریخ گوئی کے فن کو شہرت دی ۔
اس طرح دسویں صدی ہجری تک مشرقی ممالک میں اس علم کا خاصہ
چرچا ہو گیا ۔

بلاد المغرب میں فن لغز کی مقبولیت کا زمانہ گیارھویں صدی ہجری
ہے جانتا چاہیے :

”مراکش میں گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی
میں خاتواؤ بنو سعد کے عہد حکومت کے دوران میں کہیں
جا کر نہ صرف تاریخی یادگاروں کے کتبات میں بلکہ وفيات
میں تاریخی مادوں کا استعمال عام ہوا ۔ مراکش کے مؤرخوں
اور سوانح نگاروں نے تاریخی مادوں والی منظوم وفيات کو وسیع
پیمانے پر استعمال کیا۔“^{۱۸}

برصغیر پاک و ہند میں اس فن کا نقطہٴ عروج دور ہانیوں سے شروع
ہوتا ہے ۔ اس سے قبل کتبوں میں اس کا رواج ضرور تھا ، لیکن ہانیوں کے
زمانے میں تاریخ گوئی ، لغز و معما اور چیستان کو بہت زیادہ اہمیت حاصل
ہو گئی تو اس فن کو بھی مقبولیت کے پر لگ گئے ۔ آل تیموری کے ہاں
اس کا ذخیرہ وافر پایا جاتا ہے ۔ اکبر ، جہانگیر ، شاہجہان ، اورنگ زیب
کے زمانے میں اس صنف کو بہت ترقی ہوئی اور عمارتوں کے کتبے نیز تاریخی
کتب میں واقعات کے بارے میں تفصیلات تاریخ بکثرت رقم ہوئے ۔

(۳)

تاریخ گوئی کی کئی قسمیں ہیں ۔ ان میں صوری تاریخ گوئی کا رواج
زیادہ قدیم معلوم ہوتا ہے ۔ اہل غالی دور کے بعد حسبِ چمپ میں کئی
طرح کی بازیکیاں بھی پیدا ہوئیں اور گولہ گول اضافے بھی ہوئے ۔ ذوقِ
ریاضی نے اعداد کے کئی جوڑے تخلیق کیے اور قسم کی موشگافیاں اس فن

۱ ۔ تاریخ خزانہ فیروز الدین ص ۶ ۔

۲ ۔ اردو دائرۃ معارف اسلامیہ جلد ہشتم ص ۱۷۶ ۔

سے خاص ہو گئیں اور (i) صوری کے علاوہ (ii) معنوی اور پھر (iii) صوری و معنوی ٹارنچوں کے سلسلے چل نکلے ۔

اس کے علاوہ معنوی اور صوری و معنوی کی مختلف حالتیں مثلاً سالم الأعداد (مطلق تاریخ) ناقص الأعداد (تعمیم) زائد الأعداد (تجزیہ) بیان ہونے لگیں ۔ ان مختلف النوع کمالات کے علاوہ صنعتِ توشیح ، زبر ، ینات اور زیر و ینات وغیرہ کے قاعدوں میں آ کر یہ فن کئی منزلیں طے کر گیا ۔ اس فن کے اصول و قواعد مختلف النوع ضابطوں کے بابت ہو گئے ۔

(۵)

فن تاریخ کوئی ایک مشکل اور پیچیدہ نظام ہے ۔ اس پر فارسی میں کتب کا بڑا ذخیرہ موجود ہے ۔ اردو کا دامن بظاہر اس سے خالی ہے ، تاہم برصغیر پاک و ہند میں تیرھویں صدی میں بعض کتابیں تحریر میں آئیں جن میں چند ایک اردو میں ہیں ۔ اس فن کی کتابوں کی تدوین کا سبب شاہد یہ ہے کہ برصغیر کی معاشرت میں زلفی کی جگہ آرٹ نے لے لی تھی ۔ الفاظ کو مواد پر فوقیت حاصل ہو گئی تھی ، شعراء جذبات کی جگہ زمان اور احساسات کی جگہ لغت مرتب کرنے لگے تھے ۔ مظہر العجائب (مناسبات شعری) سراپا سخن (قد کرہ) اس رجحان کو ظاہر کرتے ہیں ۔ لغت کی کتابیں اس پر مستزاد ہیں ۔ ایسے میں تاریخ کوئی کے فن کو منضبط کر کے آٹھ ریاضی کی شاخ بنا دینے کا خیال شدت اختیار کر گیا ۔ چنانچہ جلال و تسلیم کے ہاں یہی رجحان غالب ہے ۔ اس دور کی کتب کی ایک مختصر سی جھلک یہ موقع لہ ہوگی :

- ۱ ۔ مفتاح التواریخ ، طاس اہل ۱۶۶۳ء
- ۲ ۔ گنج تاریخ ۔ مفتی غلام سرور لاہوری ۱۲۸۳ھ
- ۳ ۔ مقياس الانصار ۔ محمد جعفر اوج ۱۲۹۲ھ
- ۴ ۔ الحادۃ تاریخ ۔ جلال لکھنوی
- ۵ ۔ ملخص تسلیم ۔ تسلیم سہوانی ۱۳۰۳/۱۳۰۲ھ
- ۶ ۔ عدد التاريخ ۔ تسلیم سہوانی ۱۳۲۰ھ (تاریخ اشاعت)
- ۷ ۔ کلبن تاریخ ۔ الم ۱۳۱۳ھ

ان کی درجہ بندی کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اول ایسی کتب کی کثرت ہے جن میں معلوم تاریخیں یکجا کی ہیں (مفتاح التواریخ، کنج التواریخ)۔ دوم وہ کتب ہیں جن میں مادہ ہائے تاریخ کو "لفت" کے انداز میں یکجا کیا گیا ہے (عدد التاریخ)، سوم فن تاریخ گوئی کو مراتب کیا گیا ہے (ملخص تسلیم، کلین تاریخ)۔ ان میں اول اور ثالث کی اہمیت دوم کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بے موقع نہیں کہ علم کی فنی باریکیوں کو محفوظ کرنے کی کوشش اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ ان کتب میں فن تاریخ گوئی کے بارے میں اجتہاد فکر کا سراغ نہیں ملتا۔ قدیم سے رائج قوانین ہی کو مراتب کر دیا گیا ہے۔ لکھنے والوں کی جدت طرازی کسی نئی جہت یا فکر و فن کی نئی راہ کی خبر نہیں دیتی۔ ملخص تسلیم کو دوسری کتب پر فوقیت ہے کہ اس سے فن کو جاری رہنے میں مدد ملی۔ ورنہ اس دور کا نمایاں پہلو تو نقط لفت کے انداز پر قدیم تاریخی نمونوں کو پیش کرنے پر منحصر ہے۔ اہل اور مفتی غلام سرور کے علاوہ خود تسلیم نے عدد التاریخ میں اس طرز کی نمائندگی کی ہے۔ علم تاریخ گوئی پر ملخص اور کلین کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کا حلقہ محدود ہے کیونکہ یہ شہرت صرف خواص کے حلقے میں تھی۔ عوام اس فن سے نااہل تھے۔ مدت تک ملخص تسلیم اس فن کا عمدہ نمونہ مانی گئی۔ افغانستان میں البتہ کلین تاریخ کو حلقہ خواص میں شہرت نصیب ہوئی۔ محمد ابراہیم خلیل الاحمد الجاسی نے کلین تاریخ کو "استطراح تاریخ در نظم" کے عنوان سے ۱۳۳۷ھ میں ترجمہ کر کے انجمن تاریخ کے سلسلہ اشاعت میں چھاپ دیا۔ خلیل نے کہیں کہیں اپنی طرف سے بعض مثالوں کا اضافہ بھی کیا ہے لیکن جیسا کہ دیا جائے میں اس نے اعتراف کیا ہے۔ بنیادی مطالب کلین تاریخ ہی سے لیے گئے ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ملخص فارسی میں ہے اور اس کی شہرت پاک و ہند میں رہی اور کلین اردو میں تحریر ہونے کے باوجود اہل ان ادباء کی قدردانی کا سرمایہ خاص ہو گئی۔ تدوین کی یہ مساعی فقط ایک ختم ہوتے ہوئے فن کو زلفہ رکھنے کی آخری کوششیں تھیں کیونکہ اس کے بعد سے فن تاریخ گوئی پر کسی قابل ذکر کتاب کا حوالہ نہیں ملتا۔ یہ تسلیم کرنا غلط نہ ہوگا کہ تسلیم مہسواتی کے بعد تاریخ گوئی کی مقبولیت ماند پڑنے لگی۔ کسی ادیب کو اگر کبھی

اس کی ضرورت پڑی تو اس کا سبب کسی واقعہ کو منضبط کرنا یا اس فن کے حصول کا جذبہ نہ تھا ، بلکہ تاریخی ناموں کے کسی قدر رواج نے لوگوں کو ادھر متوجہ رکھا ، فن سے واقفیت کم سے کم ہوتی چلی گئی اور لوگوں کو تاریخی ناموں کی تلاش کے لیے بنائے سواد کی جستجو ہوئی ۔ اس دور میں صرف دو کتابیں دستیاب ہیں ان میں فن کی تفصیلات اور احوال و ضوابط کا بیان موضوع خاص ہی نہیں بلکہ انہیں ایک لحاظ سے تاریخی ناموں کا چارٹ قرار دینا چاہیے ۔ عدد التاريخ کے نمونے پر ادباء نے اعداد ملفوظی کو یک جا کر کے قارئین کے لیے آسانی فراہم کی اور دو کتابیں شائع ہوئیں :

(۱) تاریخی خزائن یعنی چودھویں صدی کے تاریخی نام :

اس میں تین ہزار لڑکوں اور لڑکیوں کے تاریخی نام حسب الہجہ ۱۳۲۶ء سے لے کر ۱۳۵۰ ہجری تک علیحدہ علیحدہ سال ہلال درج ہیں۔ مصنف حافظ فیروز الدین کسکے زفی ، مطبوعہ اسلامیہ سٹیم پریس لاہور ۱۹۰۸ء ۔

(۲) معین الادب معروف بہ معین الشعراء :

یہ اردو زبان کے مروجہ الفاظ کا لغت ہے جس میں الفاظ کے معنی کے علاوہ ہر لفظ کے اعداد ملفوظی بقید امثال از کلام شعراء درج ہیں ۔ مصنف غلام حسین آفاق بنارس شاکر داسیر مینائی ، ناشر صدیقی بک ڈپو ۔ ۱۹۵۶ء ۔

(۶)

یہ دہائیوں صدی کے اوائل سے خواص کی توجہ بھی لازمی گئی ہے ہٹ گئی جو ریاضت اور لکھن اس کے لیے درکار تھی ، عام زندگی کی بڑھتی ہوئی مصروفیت کی بنا پر نیز مادی فوائد کی تلاش و جستجو نے لوگوں کو دوسرے واسطے ہر لگا دیا اور اس لطیف فن کے جاننے والے بھی خال خال رہ گئے ۔ ایسے میں کہیں منظور صاحب کو جتنی داد بھی دی جائے کم ہے ۔

زیر نظر کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں فن کے دیگر علوم سے مصنوعی روابط نیز حروف تہجی کے تغیرات سے بحث ہے، دوسرے میں فن کی اقسام بیان ہوئی ہیں، تیسرے حصے میں تاریخ گوئی کے سلسلے کے بعض ضروری مباحث ہیں۔ الف محدودہ، ثانیۃ، متناہ، فونانی، کاف، بائید، یامی، تھانی وغیرہ کی اعداد شمار میں ماہرین فن میں اختلاف رہا ہے۔ کیٹن صاحب نے مختلف خیال اشخاص کے مسلک بیان کر دینے پر اکتفا نہیں کی بلکہ ان نازک مباحث پر کھل کر اظہار خیال بھی کیا ہے اور اپنے مسلک کے جواز میں دلائل بھی دیے ہیں۔ اس طرح ان کی کتاب مطالب علمی کے لحاظ سے خاصے کی چیز ہو گئی ہے۔

کیٹن صاحب نے تاریخ گوئی کے فنی خصائص کو جو صرف خواص تک محدود ہو کر رہ گئے تھے، ایسے انداز میں بیان کیا ہے کہ یہ ادق موضوع عام قاری کے لیے بھی دلچسپ اور جاذب توجہ ہو گیا ہے۔ علمی مطالب کو بیان کرنے کا جو سابقہ خاص الہیں حاصل ہے اس کے طفیل وہ فن تاریخ گوئی کے باریک مسائل کو بھی بڑی عمدگی سے بیان کرتے چلے گئے ہیں۔ ان کے اسلوب کی خوبی یہ ہے کہ زرف نگاہی اور دقت نظر کے باوجود انداز بیان کہیں بھی پیچیدہ اور گجھلک نہیں ہونے لایا۔ طرز بیان کی دل فریبی نے موضوع کو ہانی کر دیا ہے۔ یہ فن کے ماہرین ہی کے لیے نہیں بلکہ مبتدیوں کے لیے یکساں طور پر مفید اور کار آمد ہے۔

کیٹن صاحب ایک ایسے خالوادے کے چشم و چراغ ہیں جس نے ابتدائی برطانوی دور میں علم و ادب کی آب پاری کی اور فنون لطیفہ کی اس شاخ کو اپنی خصوصی توجہ کا مستحق بنانا۔ ان کے والد بزرگوار مولانا عزیز الدین اس فن کے شہدائی ہیں خود ماہر اور مستنبی تھے۔ ان کے کارناموں کی مختصر سی جھلک بھی اس کتاب میں درج ہے۔ کیٹن صاحب اگرچہ اس اہل جاہل سے تربیت حاصل نہ کر سکے کیونکہ جہن میں یتیم ہو گئے تھے لیکن اس علمی روایت کے وہ تنہا وارث ہیں۔ یہ کتاب لکھ کر انہوں نے اپنے بزرگوں کے لشر قدم کو دوام ہی نہیں بخشا، بلکہ نئی لسل پر بھی احسان کیا ہے۔

(۷)

ہمارے معاشرے میں مادی زندگی کو کچھ ایسی اہمیت حاصل ہو گئی ہے کہ علوم و فنون کے قدیم سرمائے کی طرف سے لوگ غافل ہو جاتے جا رہے ہیں۔ نئے علوم کا حصول یقیناً مستحسن ہے لیکن کوئی قوم اپنے ماضی کے علمی و ادبی سرمائے سے ہٹ کر روگردانی کر کے ملی شخص کی ستاح گراں ارز کے حصول میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جدیدیت کی بنیادیں اسی وقت استوار ہو سکتی ہیں جب ان کا رشتہ قدیم سے قائم رہے۔ اس لیے علم تاریخ گوئی، لغز و معا، معانی و بیان و بدیع، عروض و قوافی کی تدوین جدید نہایت ضروری ہے۔ کہیں صاحب نے تاریخ گوئی سے اس کا آغاز کیا ہے۔ خدا کرے اب ادب کی دوسری متذکرہ شاخوں کی نوبت بھی آنے اور ہماری موجودہ لیبل ماضی کے علمی خزانے سے آشنا ہو کر قومی و ملی عزائم کو مثبت بنیادوں پر استوار کرنے کے قابل ہو سکے۔

(۱۹۷۲ء)

